ہر گھر کی زینت
ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی
January
2017
☆ نامور مصنفہ رفعت سراج کا شاہکار ناول 'دامِ دل' اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

بانی
سہام مرزا

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

مدیرِ اعلیٰ ــــــ منزہ سہام
مدیر ــــــ زین شمسی
قانونی مشیر ــــــ (ن) ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)
انکم ٹیکس ایڈوائزر ــــــ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز
MEMBER
APNS
CPNE

خط و کتابت کا پتا
88-C II فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز 7، کراچی
فون نمبر: **021-35893121 - 35893122**
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

جنوری 2017
جلد: 45 ☆ شمارہ: 01
قیمت: 60 روپے

☆ منیجر سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ عکاس: موسیٰ رضا / مرزا محمد یاسر

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

ناولٹ

منی ناول

مکمل ناول

افسانے

بازگشت

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: 88-C ... کراچی

Phone: 021-35893121 - 35893122

Email: pearlpublications@hotmail.com

پرل پبلی کیشنز
کی جانب
سے تمام
اہلِ وطن کو
نیا سال
2017
مبارک
ہو
November
2016

روشن سورج

29 دسمبر کی سہ پہر 3:30 بجے جب قومی ایئر لائن کے طیارے نے اسلام آباد کے لیے پرواز بھری تو پہلی دفعہ ایک انجانا سا خوف دل میں دھم کر کے اتر آیا.....

ہزاروں فٹ کی بلندی' وجود آسمان و زمین کے درمیان منوں ٹن وزنی لوہے میں قید......بس یہ سوچتے سوچتے کچھ حلق میں اٹکنے لگا اور پھندا سا لگ گیا۔ دونوں بیٹے ساتھ' نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا اُن کو۔ اوسان بحال ہوئے تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ ہم بڑے عجیب لوگ ہیں۔ حادثوں سے کچھ وقت کے لیے ڈر جاتے ہیں مگر پھر سب بھول بھال کر زندگی میں مگن ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو زندگی کی روز کی کہانی کچھ ایسی ہی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جب عروج عطا کرتا ہے تو ہم اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگتے ہیں اور فخر و غرور میں اُلجھ کر زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہوجاتے ہیں۔ سر پہ ہمارے آسمان تو ہوتا ہے مگر پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ اور پھر ایک دن اچانک، بالکل اچانک منوں مٹی کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ اپنے پیاروں کو، جن کو چھوڑنے کا تصور کر نہیں سکتے' بعض اوقات بنا دیکھے اور بنا کچھ کہے' اُن سے دور ہوجاتے ہیں۔ ہم سب نے ہی کبھی نہ کبھی اپنے پیارے کو کھویا ہے۔ مگر بس صرف چند دن کا غم.....

مشرق سے ابھرنے والا سورج زمین والوں کو حالانکہ روز ایک ہی پیغام دیتا ہے کہ ہر عروج کو زوال ہے' ہر صبح کو شام اور ذی ہوش کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اللہ نے ہم سب پر کرم کیا اور 2017ء ہمارے سامنے ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر دن کو اس احتساب کے ساتھ جئیں کہ یہ ہمارا آخری دن ہے۔ صرف اسی صورت میں ہم اپنی اصل زندگی کے لیے کچھ مال' اچھے اعمال کی شکل میں جمع کرسکتے ہیں۔ 2017ء کا یہ روشن سورج' میرے تمام پڑھنے والوں کو مبارک ہو۔

منزہ سہام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔
مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......
ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت

رابطوں کی دلفریب محفل

مدیراعلیٰ

نئے سال کے پہلے شمارے کے ساتھ اپنے تمام پڑھنے والوں کی خدمت میں منزہ سہام کا محبت بھرا سلام......ایک سال اور بیت گیا۔ بہت سارے دکھ اور چند خوشیاں دے کر 2016 بھی قصہ پارینہ ہوا جو بیت گیا اس کو بھول جانا چاہیے اور جو موجود ہے اُس کی فکر کرنا ہی عقلمندی ہے۔ میں اپنے تمام مصنفین کی تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں۔ جنہوں نے 2016ء میں اپنا اور دوشیزہ کا ساتھ بنائے رکھا۔ اپنی مصروفیات میں بھی دوشیزہ کے لیے وقت نکالا میری ہمت بڑھائی اور بہت حوصلہ دیا۔ لیکن جو لوگ دوشیزہ سے دور رہے وہ یہ نہ سمجھیں کہ دوشیزہ اور میں انہیں بھول گئے۔ میرے تمام مصنفین اور پڑھنے والے میرے دل میں بستے ہیں۔ یہ فقط الفاظ نہیں حقیقت ہے کہ میرا کنبہ تو آپ ہی لوگ ہیں۔ میری سب کے لیے دعا ہے کہ یہ نیا سال ہم سب کے لیے امن وآشتی کا پیغام لائے۔ چار دانگ عالم صرف خوشیاں ہوں' کوئی دکھ قریب بھی نہ آئے اور ہمارا اور آپ کا ساتھ ہمیشہ اسی طرح رہے۔ تو جناب اس دعا کے ساتھ اپنے پہلے خط کی جانب بڑھتے ہیں کراچی سے تشریف لائی ہیں رضوانہ پرنس' لکھتی ہیں۔ پیاری سی منزہ آج طویل عرصے بعد آپ کی میزبانی میں اپنی اُسی محبت بھری محفل میں شریک ہو رہے ہیں۔ جس کے کبھی خود میزبان تھے' پیاری دوست دعا ہے کہ یہ نیا سال سب کے لیے صرف خوشیوں کا ہی پیغام لائے۔ ایڈیٹرز کے اعزاز میں دیا گیا آپ کا لنچ بہت شاندار رہا۔ کتنا ہنسے تھے ہم لوگ' غزالہ رشید کے دلچسپ جملے اب بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتے ہیں۔ کاشی چوہان شاید خواتین کے ڈر سے اپنی زبان دفتر ہی میں بھول آئے تھے۔ جبکہ زین بہت کیوٹ سے میزبان لگ رہے تھے۔ منزہ آپ میزبان کم اور مہمان زیادہ لگ رہی تھیں۔ سچ اچھے دوست خدا کی بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں کہ اُن کی دل جوئی اور خوبصورت کمپنی کچھ دیر کے لیے وہ غم بھی بھلا دیتی ہے جو ہمہ وقت دل کو اذیت سے دوچار رکھتے ہیں۔

منزہ: اچھی سی رضوانہ آپ نے درست کہا اچھے دوست بہت بڑی نعمت ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اس دولت سے مالا مال ہوں۔ لنچ پر واقعی میں بہت مزہ آیا تھا۔ کاشی کی زبان میرے گھورنے پر ویسے ہی گم ہو جاتی ہے اور پھر میرے ساتھ آپ اور غزالہ رشید کی موجودگی میں کاشی تو خود گم ہونے کے چکر میں رہتے ہیں۔ بہرحال آپ کی آمد اچھی لگی شمارے پر رائے دیتیں تو اور اچھا لگتا۔

✉:لاہور سے تشریف لائی ہیں جنا بشریٰ' لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! منزہ سہام صاحبہ! امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ اور دوشیزہ کی محفل میں خوش آمدید کہیں گی۔ محترمہ رعنا قیصر صاحبہ کی صحتیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ خطوط سب کے محبت بھرے تھے۔ فرح اسلم قریشی کو بہت بہت مبارکباد ڈاکٹر شائستہ لودھی سے ملاقات اچھی رہی۔ مکمل ناول آنگن کی چڑیاں اور اماوس میں گھرا چاند بہت زبردست تھے۔ نسرین اختر نینا کا منی ناول بھی اچھا جارہا ہے۔ ناولٹ اک جنوں بے معنی بہت حساس تحریر تھی۔ مشعل راہ زرافشاں فرحین کی اثر انگیز تحریر خولہ عرفان نے آڑے میاں پر بہت خوب انداز میں لکھا۔ باقی افسانے بھی بے حد اچھے تھے۔ سعدیہ سیٹھی کی غزل بے حد جاندار تھی۔ دوشیزہ گلستان بھی مختلف کلیوں سے مہک رہا تھا۔ شاعری میں عادل حسین کی اقرار جرم بہت بہت زبردست تھی۔ یادرفتگاں واقعی عبرت ناک تحریر تھی۔ چٹ پٹی خبروں نے واقعی موڈ خوشگوار کردیا۔ کچن کارنر میں تمام ڈشز اچھی تھیں۔ جب بناؤں گی تو اور مزہ آئے گا۔ 'دوشیزہ' اور 'سچی کہانیاں' وہ مہکتے پھول ہیں۔ جن سے سہام مرزا صاحب مرحوم کی خوشبو آتی رہے گی۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آمین اور جس طرح آپ نے احسن طریقے سے اپنی ذمہ داری نبھائیں۔ آپ نے واقعی اپنے والدین کا نام روشن کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام اسٹاف کو بہت خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ سب لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے لیے بہت سی دعائیں۔

ﷺ: سوئٹ سی حنا! تمہارا محبت بھرا خط ملا یقین کرو دل خوش ہوگیا۔ مجھے لگتا ہے اس بار لاہور دوسرے شہروں سے کم از کم محفل میں تو بازی لے گیا میری پیاری پیاری رائٹرز نے بہت خوب شمارے پر رائے دی اور پابندی وقت کا بھی بہت خیال رکھا۔ میں امید کرتی ہوں حنا کہ تم باقاعدگی سے دوشیزہ کی محفل میں شرکت کروگی اور خوب اچھے اچھے افسانے بھی لکھ کر بھیجتی رہوگی۔

✉:لاہور سے تشریف لائی ہیں فریدہ فری' لکھتی ہیں۔ دسمبر کا دوشیزہ ملا ہائے میگزین 15 تاریخ تک ملتا ہے یعنی بے حد تاخیر سے جب دوسرے میگزین جو کراچی ہی سے شائع ہوتے ہیں وہ کیم تک آجاتے ہیں۔ منزہ جی آپ نے الوداع 2016ء بے حد اچھا لکھا دوشیزہ کی محفل میں سب کے خط جگمگا رہے تھے۔ سنبل جی آپ کا تبصرہ اور فصیحہ جی کا تبصرہ اور خولہ عرفان بے حد اچھا لکھتی ہیں میں تو سنبل اور خولہ عرفان کی تحریروں کی بہت ہی دیوانی ہوں خوش رہو۔ فرح اسلم قریشی بھی بہت اچھی لکھاری ہیں منزہ کی بہن کے لیے ہم نے بہت دعائیں مانگی ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو مکمل صحتیاب کرے آمین عقیلہ حق کیسی ہو آپ بھی ہماری فیورٹ رائٹر ہو۔ مکمل ناول آنگن کی چڑیا' اماوس میں گھرا چاند اور افسانوں میں اپنی پسندیدہ رائٹر کا افسانہ یعنی عالیہ حرا کی صحرا کے مسافر' آنکھ مچولی' کسی مہرباں نے آکر' اتنی سی محبت' اور خولہ جی کا آڑے میاں کیا خوب مزیدار تحریر ہے۔ منزہ جی اور میری فیورٹ تمام رائٹرز اور قارئین ہمارے لیے دعا کریں جمعرات کے دن ہاسپٹل میں ہمارے بازو کا آپریشن ہے میں بہت زیادہ ڈر رہی ہوں بس اللہ میاں بخیریت میں گھر آجاؤں بہت زیادہ تکلیف میں ہوں۔ شاید کچھ غلطیاں ہوں بایاں بازو ہے...... سب کو دعا اور سلام۔

ﷺ: فریدہ جی! امید کرتی ہوں آپ کی صحت اچھی ہوگی اداریہ پسند کرنے کا شکریہ آپ نے میری بہن کے لیے دعا کی میں آپ کی احسان مند ہوں آپ سب کی دعاؤں کا ہی نتیجہ ہے کہ رب العزت نے اُسے صحت عطا فرمائی اور رب العزت آپ کو بھی مکمل تندرست و توانا رکھے۔ آپ کی تعریف مصنفین تک پہنچادی ہے۔

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

دسمبر 2016 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

"اماوس میں گھرا چاند" احمد سجاد بابر

آپ کی نظر میں اس ماہ "دوشیزہ" کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ جنوری 2017

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

لاہور سے تشریف لائی ہیں ثمینہ طاہر بٹ لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم منزہ جی!! سب سے پہلے تو آپ سب کی خدمت میں بہت ساری سلامتی بھری دعائیں۔ اور خاص طور سے محترمہ رانا قیصر صاحب کے لیے دلی دعا کہ اللہ پاک انہیں صحت کاملہ و عاجلہ سے نوازے اور انہیں صحت تندرستی والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین ثمہ آمین۔ منزہ جی میں آپکی اور کاشی سر کی دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے پرل پبلکیشنز کا حصہ بنایا۔ آپ کا بہت شکریہ۔ اور اب میں کوشش کروں گی کہ آپکی محبتوں کا حق ادا کرسکوں، ہر ماہ کہانی نہیں تو خط کے ذریعے آپ سے رابطے میں رہوں۔ کیونکہ مجھے دوشیزہ اور سچی کہانیاں وقت پر ملنے لگا ہے، اس کے لیے بھی آپکی شکر گزار ہوں۔ (ویسے سنبل والی شکائیت مجھے بھی ہے۔ دسمبر کا سچی کہانیاں مجھے بھی نہیں ملا، اس لیے مجھے نیٹ سے لوڈ کرنا پڑا) اور اب آتی ہوں دوشیزہ کی پر بہار محفل کی طرف۔ سب سے پہلے تو نگاہ سرورق پر پڑی اور پھر حسینہ کی اداس نگاہوں میں کھو کر رہ گئی۔ بڑی مشکل سے نگاہ چرائی اور اندر کے صفحات کی طرف چھلانگ لگائی۔ اشتہارات کو تیزی سے پھلانگتے ہوئے فہرست پر نگاہ دوڑائی، اور یہ کیا۔؟ میری کوئی تحریر اس بار بھی نہیں۔؟ چلو، کوئی بات نہیں۔ میں نے ایک اور افسانہ بھیج دیا ہے، اور اب انتظار کرتی ہوں کہ کب اس کی باری آتی ہے۔ 2016 کو الوداع اور 2017 کو خوش آمدید کہتے منزہ جی کے اداریے کی ساتھ میں سو فیصد متفق ہوں۔ اللہ رب العزت ضرور اپنا کرم ہم سب پر فرمائے گا اور انشاءاللہ بہت جلد ایسی صبح طلوع ہوگی جس میں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی کوئی ملال۔ ہر طرف امن ہی امن ہوگا اور دنیا واقعی امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ انشاءاللہ۔ ''دوشیزہ کی محفل'' میں سب سکھیوں ساتھیوں سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ عقیلہ حق کے ایکسیڈنٹ کا پتا چلا۔ اللہ سب کو اپنے امان میں رکھے، اور یہ جان کر تسلی بھی ہوئی کہ وہ اور ان کے بچے خیریت سے ہیں۔ اللہ انہیں صحت تندرستی والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین۔ اور جناب، سارے کے سارے خطوط ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ماشاءاللہ، کس کا نام لوں اور کسے چھوڑوں۔ سب کے خوبصورت الفاظ نے اپنے سحر میں جکڑا۔ جزاک اللہ۔ اللہ پاک میرے اس قلم قبیلے کو ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھنا اور ہمارے دل ونگاہ کو وہ وسعت، وہ گہرائیاں عطا فرمانا کہ ہم تیرے دیے گئے اس ہنر کو تیری ہی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دکھی دلوں کا درماں بن سکیں۔ آمین۔ اور اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے میں بات کرنا چاہتی ہوں ''احمد سجاد بابر'' کے مکمل ناول ''اماوس میں گھرا چاند'' کی۔ بہت بہت خوبصورت تحریر۔ ماشاءاللہ۔ جس قدر حساس موضوع تھا، احمد صاحب نے اسے اسی خوبصورتی اور نفاست سے تحریر کیا۔ یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں ہی کالی بھیڑیں موجود ہیں، مگر اسکولز اور اکیڈمیز کے نام پر جو کالا دھندا کرتے ہیں، وہ کسی معافی، کسی رعایت کے مستحق نہیں۔ ایسے لوگوں کو تو چوک میں کھڑا کے گولی ماردینی چاہیے جو اپنے مذموم ارادوں کے لیے ملک وقوم کے مستقبل سے کھیلنے میں بھی عار نہیں سمجھتے۔ میری نظر میں تو ''اماوس میں گھرا چاند'' ماہ دسمبر کی بیسٹ تحریر رہی۔ جزاک اللہ خیر۔ اسماء اعوان کی ''لائف بوائے کہانی'' ہمیشہ کی طرح بہترین اور پر اثر تھی۔ بہت خوب اسماء۔ ''سنبل'' کا ''آنگن کی چڑیاں'' اختتام پذیر ہوا۔ ایک خوبصورت تحریر۔ ویلڈن سنبل۔ ٹھیک کہا آپ نے، ہمارے معاشرے میں آج بھی بیٹے کو بیٹی سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، حالانکہ بیٹیوں کے حقوق تو چودہ صدیاں

جب تک ہے جان
دل دل پاکستان
کہتا رہے گا
پورا جہان
بہت یاد آؤ گے
بہت رُلاؤ گے
الٰہی تیری چوکھٹ پر
ترے محبوب کے در پر
ترا بندہ یہ پہنچا ہے
PK661......تُو بھی امر
سفر تمام ہوا
ستارہ آسماں کا ہوا
ہر دل کی آواز......جنید جمشید
اب ہم میں نہیں

پہلے ہی طے ہو چکے، مگر ہم جہاں اپنے نبی آخر زماں ﷺ کی بہت سی تعلیمات کا مطلب اپنے نظریے کے مطابق ڈھال لینے کے عادی ہو چکے ہیں، وہیں، یہ اہم مسئلہ بھی ہم اپنے فایدے کے لیے نظر انداز کر جاتے ہیں، اور اللہ سے زیادہ توکل بیٹوں پر کرنے لگتے ہیں۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے اور ہمیں راہ ہدایت سے نوازے آمین۔ ''نسرین اختر نیناں'' کے ''سپنے سہانے'' ہماری آنکھوں میں بھی ست رنگے سپنے بھر رہے ہیں۔ ابھی تو یہ سلسلہ جاری ہے، مکمل تبصرہ، ناول مکمل ہونے کے بعد انشاءاللہ۔ ''فرح انیس'' کا ''اک جنوں بے معنیٰ'' اب کیا کہوں۔؟ الفاظ کہیں گم ہو گئے ہیں۔ محبتوں کی جنوں خیزی لیے ہوئے فرح کے ناولٹ نے تو بولتی ہی بند کر دی۔ سچ ہے ضروری نہیں کی محبت کے قصوں میں انجام ملن ہی ہو۔ بعض اوقات حالات ایسا رخ بھی اختیار کر لیتے ہیں کہ جو سوچا جاتا ہے، اس کے بلکل ہی الٹ ہو جاتا ہے۔ ویری ویلڈن۔ ''زر افشاں فرحین'' کا ''مشعلِ راہ'' اندھیروں روشنی بڑھاتی ایک خوبصورت تحریر۔ جزاک اللہ زر افشاں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ افسانے اس بار آٹھ تھے، اور کوئی شک نہیں کہ سب ہی بہت اچھے تھے۔ ''عالیہ حرا'' کا ''صحرا کے مسافر'' محبت، ضرورت اور اطاعت کے فلسفے پر مبنی تحریر۔ اچھی لگی، بہت خوب عالیہ۔ ''مومینہ بتول'' کی ''حسرتِ ناتمام'' لوئیر مڈل کلاس کی خواہشوں اور حسرتوں پر مبنی تحریر۔ دل بہت اداس ہو گیا۔ مومینہ آپ نے بہت اچھا لکھا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ''زینب ملک ندیم'' کی ''آنکھ مچولی'' ایک آنکھ مچولی جیسی ہی تحریر۔ انسانی فطرت کے پرت کھولتی ہوئی، نفرتوں اور محبتوں کے رنگ لیے ہوئی پر تاثر کہانی۔ بہت خوب جی بہت خوب۔ ''ندیا مسعود'' کی ''کسی مہرباں نے آ کے'' اچھی کاوش رہی۔ کاش، شہزاد جیسی ستھری سوچ سارے دامادوں کی ہو جائے تو ہمارے معاشرے سے جہیز جیسی لعنت اور بے جا رسومات کا خاتمہ ہی ہو جائے۔ بہت خوب ندیا۔ جزاک اللہ۔ ''اتنی سی محبت'' ''عائشہ نور عاشا'' کی مختصر مگر بھرپور تحریر۔ نگین اور فیصل نے جو راہ منتخب کی، وہی شائد انکا نصیب بھی تھی اور ان کے لیے بہتر بھی۔ ''قراۃ العین سکندر'' کی ''دوستی کے رنگ عجیب'' سبق آموز کہانی۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ کبھی اپنے دوست کو بھی اپنے راز مت بتاؤ، مبادہ وہ تمہارا دشمن ہو جائے اور تمہیں نقصان پہنچائے۔ اور پھر یہ کہ نادان دوست کی دوستی سے عقلمند دشمن کی دشمنی ہزار درجہ بہتر ہے، تو رفعت اور شبانہ کی دوستی بھی ایک دوسرے کے لیے ''نادان دوست کی دوستی'' ہی تھی، جبھی تو وہ دونوں کسی بھی زود وزیاں سے بے خبر اسے نبھائے چلی جا رہی تھیں۔ اللہ ایسے دوستوں سے ہم سب کو محفوظ رکھے آمین۔ ''احمر علی'' کا ''شام ٹھہر جائے'' محبت کے لازوال رشتوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی خوبصورت تحریر۔ ویری ویلڈن۔ اور ''خولہ عرفان'' کی ''آڑے میاں'' ایک بہت حساس موضوع پر ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی اثر انگیز تحریر۔ واقعی، سچ ہے، بانجھ صرف عورت ہی تو نہیں ہوتی، یہ بد نصیبی تو مردوں کے حصے میں بھی آ جاتی ہے، مگر آڑے میاں کی بیگم نے جو اس کا حل تلاش کیا، وہ بہت غلط اور ناجائز تھا۔ اللہ ہم سب کو اس طرح کے حالات سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ ''سلسلے وار ناولز'' میں ''دامِ دل'' اور ''ابھی امکان باقی ہے'' دونوں کو ''رفعت سراج صاحبہ'' اور ''زمر نعیم صاحبہ'' بہت اچھے انداز سے لے کر آگے بڑھ رہی ہیں، اور بلاشبہ، ان کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہی ہے۔ جزاک اللہ خیر۔ دوشیزہ میگزین میں ''آخری مغل بادشاہ'' پڑھ کر بے اختیار

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم!

منی پاکستان سے نکل کر......

پاکستان کے دل میں......

زندہ دلانِ لاہور کے درمیان

ماہ جنوری کے آخری ہفتے میں

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کی جا رہی ہے

کیا لاہور...... کراچی سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب...... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے......

آپ میرا ساتھ دے رہے ہیں ناں؟

آپ کے جواب کا منتظر......

آپ کا اپنا......

کاشی چوہان

تقریب کی تاریخ اور مقام کا اعلان آپ کو بذریعہ فون اور دعوت نامے کی صورت جلد موصول ہو جائے گا

اندھیری صبح

ہنسی کیسے اچانک آنسوؤں میں بدل جاتی ہے' خوشی کیسے ایکدم غم کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے اُس کا تجربہ مجھے 19 جولائی کی اُس اندھیری صبح کو ہوا ورنہ رات تک تو میرے اردگرد خوشیاں دھمال ڈال رہی تھیں۔ قریبی عزیزوں میں دو' دو شادیاں تھیں پھر پندرہ دن بعد لندن بھی تو جانا تھا۔ جہاں میرے اپنے میرا انتظار کررہے تھے۔ سلیم میرے لاڈلے بھائی کا فون بس ایک روز قبل ہی آیا تھا کتنا خوش تھا وہ میرے لندن آنے پر۔ ہم ڈھیر سارے پروگرام بناتے رہے میں اُس کے جملوں پر بے ساختہ ہنستی رہی لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ میں اُس سے آخری بار بات کررہی ہوں۔ اب میں کبھی اُس کی آواز نہیں سنوں گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے بیوی بچوں اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر جانے والا ہے۔ اُس صبح اچانک موبائل کی گھنٹی بجی میں نے گہری نیند سے اُٹھ کر فون اٹھایا تو یہ الفاظ سیسہ بن کر میرے کان میں کچھ ایسے اترے کہ اُن کی بازگشت ہمہ وقت میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ ارے سلیم اب ہم میں نہیں رہا۔' اللہ ایسا وقت کسی بہن پر نہ لائے جو مجھ پر بیت گیا۔ میرے ہنستے کھیلتے خوبصورت بھائی کا دل کیسے ایک دم بند ہوگیا۔ اب تک یقین نہیں آتا۔ اللہ سے دعا ہے کہ نیا سال کسی کی زندگی میں ایسی صبح نہ لائے۔ پروردگار تو سب کو خوشیوں کے ساتھ اپنی حفظ وامان میں رکھنا۔ آمین۔)

رضوانہ پرنس

آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بے شک، انسان بہت خسارے میں ہے۔ جب جاہ جلال اور طاقت کے نشے میں ہوتا ہے، سب کچھ بھول جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس ہستی کو بھی بھلا بیٹھتا ہے، جس کے فضل اور رحمت کے سبب اسے یہ رتبہ ملا ہوتا ہے، اور خوب اپنی من مانیاں کرتا ہے، مگر جب وقت کا پہیہ الٹا چلتا ہے تو، پھر ہوش ٹھکانے آجاتے ہیں، مگر افسوس پھر سنبھلنے کا وقت نہیں رہتا۔ کاش کہ آج کے اربابِ اختیار بھی ان باتوں کو سمجھ پائیں تو شائد کوئی بہتری کی صورت نظر آجائے۔ اسماء اعوان نے دوشیزہ گلستان میں خوب رونق لگا رکھی ہے۔ ماشا اللہ۔ سب کی آمد بہت اچھی رہی۔ جزاک اللہ'' نئے لہجے کی نئی آوازیں بھی خوب تھیں۔ اوور آل دسمبر کا شمارہ بہت اچھا رہا۔ 2016 کا آغاز بھی دوشیزہ کے خوبصورت شمارے کے ساتھ ہوا تھا، تو الحمدللہ اسکا اختتام بھی دوشیزہ کے شاندار شمارے کے ساتھ ہو رہا ہے اور امید ہے کہ انشا اللہ، 2017 کا استقبال بھی دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے حسین شماروں کے ساتھ ہوگا۔ آپ سب کے لیے کامیابی اور کامرانی کی ڈھیروں دعائیں اور نئے آنے والے سال کی مبارکباد۔ اب اجازت چاہتی ہوں، خط بہت لمبا ہوگیا ہے، قینچی پھرنے کا خدشہ ہو رہا ہے۔ چلیں جی، یار زندہ، صحبت باقی۔ انشا اللہ، اگلے ماہ کسی نئی تحریر کے سات حاضری دونگی۔ تب تک کے لیے سب کو فی امان اللہ۔

ج: پیاری ثمینہ! بہت خوب بھئی بہت خوب کیا مکمل اور جامع خط تحریر کیا ہے قینچی چلنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں جو جنوری کا شمارہ تیار کرنے میں مصروف تھی اور دسمبر کے شمارے کو کسی حد تک فراموش کر چکی تھی تم نے

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا

کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو

ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ

سی کوشش۔

بہت جلد......
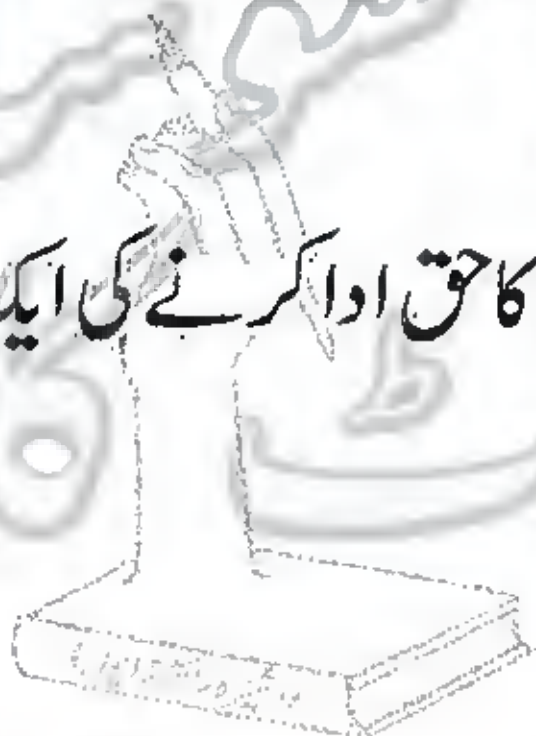
اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار......"

ایک بار پھر بہت ہی خوبصورت انداز میں یاد دلا دیا۔ ہر تحریر پر اس قدر مفصل رائے دی کہ مجھے پڑھ کر مزہ آیا تو جن کے بارے میں لکھا ہے انہیں کس قدر مزہ آئے گا۔ اداریہ پسند کرنے کا شکریہ تم نے میری سال بھر کی محنت اتنا اچھا خط لکھ کر ٹھکانے لگائی اب وعدے کے مطابق محفل میں پابندی سے شرکت کرتی رہنا۔ خوش رہو۔

◁▷: کراچی سے تشریف لائی ہیں خولہ عرفان' لکھتی ہیں۔ دعاؤں کے ساتھ حاضرِ محفل ہوں کہنے کو لکھنے کو بہت کچھ ہے لیکن مصروفیت کے سبب نہیں معلوم وہ سب لکھ سکوں گی بھی کہ نہیں کیونکہ وقت قلیل ہے اور خط طویل ہے۔ آج اٹھارہ دسمبر کا سورج غروب ہو چکا ہے۔ ماہِ دسمبر کے دوشیزہ نے بھی ہمیشہ کی طرح پھر سے ذہن کو جلا بخش دی ہے۔ دوشیزہ مکمل زیرِ مطالعہ آ چکا ہے۔ علاوہ احمد سجاد بابر کے ناول کے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی تحریر کمال ہی ہوگی اور موضوع بھی منفرد ہوگا۔ آپ کا الوداعی اداریہ بہت سارے دکھ تازہ کر گیا بہت بڑے بڑے حادثے ہوئے بہت سی نامور شخصیات اور بہت سی گمنام شخصیات دنیا کے پردے سے غائب ہو گئیں۔ دعا ہے کہ اب وہ جس جہاں میں ہیں وہاں اُن کے درجات اللہ رب العزت بلند فرمائے اور اُن کو غریق رحمت کرے آمین۔ سال گزشتہ کی عکاسی اور سال نو کے لیے امید آپ نے بہت خوبصورت انداز سے کی ہے۔ آپ کے ساتھ میں ہم امید و ہم قدم ہوں ہر ہر لفظ پر...... رسالے میں افسانوں کی قطار میں اپنا نام دیکھ کر دل خوشی کے مارے حلق میں آ گیا اور ورطۂ حیرت میں مبتلا اس وقت ہوا جب اُس افسانے کو دیکھا جس کی ترتیب کے لحاظ سے باری کی امید کافی دیر کی لگائی ہوئی تھی اور مزید حیرت اس بات پر ہوئی کہ جو نام بدل کر بھیجا تھا اسی نام سے شائع ہوا۔ جو بھی ہے جزاک اللہ منزہ' بندی تہہ دل سے مشکور ہے آپ کی اور اپنی خوشی کو ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ محفل میں آپ کی ہمشیرہ کی علالت کی خبر بھی موجود تھی دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ اللہ اُن کو صحت کاملہ اور آپ کو اُن کی طرف ذہنی آسودگی عطا فرمائے آمین۔ فرح اسلم کو ایوارڈ کی پھر بہت بہت بہت...... مبارک باد قبول ہو۔ اللہ اُن کے قلم کو سدا رواں اور جواں رکھے آمین ویسے تو فرح کا اس دفعہ کا خط بھی شاہکار ہے۔ ہر افسانے کے تبصرہ کا اختتام دوسرے افسانے کے تبصرہ کی شروعات سے مربوط و منسلک تھا۔ بہت خوبصورت اندازِ تحریر اختیار کیا تھا۔ واہ فرح...... یہ تعریف اس لیے نہیں کہ دوست ہو بلکہ اس لیے کہ تم واقعی تحریر کے رموز و اوقاف سے آگاہ ہو۔ سنبل کا آنگن کی چڑیاں اختتام خوبصورت انداز میں ہوا سنبل واقعی لفظوں کے برمحل استعمال اور ان کی نزاکت سے آگاہ ہیں ہر کردار کے ساتھ اُن کا اندازِ تحریر انصاف کرتا ہے۔ ان کے خط نے محفل کی رونق اور بڑھا دی۔ فصیحہ کے تبصرہ کی کمی محسوس ہوئی۔ عقیلہ حق بھی اپنے روایتی انداز کے ساتھ موجود تھیں۔ دام دل اور ابھی امکان باقی ہے دونوں میں کہانی نے ایک نیا موڑ لیا ہے ایک جگہ بانو آپا کا انتقال رخ بدل رہا ہے۔ تو دوسری طرف انعم کا رویہ ایک نیا مسئلہ کھڑا کرتا نظر آ رہا ہے۔ نسرین اختر نینا کا سپنے سہانے تھوڑا سا ٹھہراؤ کا شکار نظر آیا لیکن دلچسپی برقرار ہے اور نئی قسط کا انتظار ہے۔ زرافشاں فرحین کا مشعل راہ اچھا اصلاحی ناولٹ تھا لیکن تھوڑا سا دیا کے گھر والوں کا اسلام قبول کرنے کے بعد ردعمل دکھانا چاہیے تھا۔ فرح انیس کا ایک جنوں...... موضوع کے اعتبار سے بہت اچھا تھا۔ لیکن کہیں کہیں تسلسل کی کمی نظر آئی۔ مومنہ بتول کا حسرتِ ناتمام ایک عام انسان کے جذبات کی بھرپور عکاسی کر گیا۔ جہاں وہ مہنگائی کے ہاتھوں واقعی حسرت ویاس کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔ البتہ عالیہ حرا کا مسافر ایک فلسفیانہ اندازِ فکر کے ساتھ گھریلو عام عورت کے احساسات کی اچھی ترجمانی کرتا

عشق نمبر

عشق نمبر کی شاندار پذیرائی کے بعد نئے سال میں آپ کے لیے ایک اور تحفہ عشق نمبر 1
ماہِ فروری کا شمارہ عشق نمبر ہوگا۔ وہی عشق کی وارداتیں' عشق کی گھاتیں' عشق کی فتح اور
عشق کی ناکامی سے جڑی وہ کہانیاں' جن سے ابنِ آدم اپنی زندگی میں ضرور گزرا ہوگا۔
جی ہاں! سچی کہانیاں کا ماہِ فروری کا شمارہ '**عشق نمبر**' ہوگا

پُراسرار کہانی نمبر

خوف اور دہشت میں لپٹی سچ بیانیاں' ارواحِ خبیثہ کا شاخسانہ بننے والوں کی کہانیاں'
فراعنہ کی سرزمین سے' اسرار بھرے راز عیاں کرتی خصوصی داستان حیرت' پوشیدہ
دنیا سے بہت خاص طلسم کدے میں قید کرتی وہ کہانیاں جو آپ کبھی فراموش نہ
کرسکیں گے۔

تو پھر دیر کس بات کی ہے......

ماہِ فروری میں 'عشق نمبر' اور ماہِ مارچ میں 'پُراسرار کہانی نمبر' کی کاپیاں آج ہی بک
کرالیجیے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

Email : pearlpublications@hotmail.com

سچی کہانیاں فروری 2017ء کا شمارہ عشق نمبر ہوگا

سچی کہانیاں کا مارچ 2017ء کا شمارہ 'پُراسرار نمبر' ہوگا

محسوس ہوا۔ ندیا مسعود کا کسی مہرباں نے آ کر' موضوع و انداز دونوں کے لحاظ سے متاثر کن تھا مگر اختتام اتنا جاندار نہیں لگا۔ عائشہ نور کا اتنی ہی محبت بھی ایک حوصلہ افزا تحریر تھی کہ محبتوں کے چلے جانے سے زندگی رکتی نہیں ہے۔ انسان کو باہمتی سے رہ جانے والوں کے لیے جینا چاہیے۔ احمر علی کا شام ٹھہر جائے حالانکہ موضوع کے اعتبار سے مجہول سا لگا اتنی محبت کے باوجود اتنی لاعلمی کہ کبھی مذہبی موضوع زیرِ بحث ہی نہیں آیا ہو دنیا کے سارے موضوع ہی زیرِ بحث آتے ہیں لیکن اختتام بالکل درست تھا کہ غلطی کے بعد مزید غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ دوشیزہ گلستان کے سارے فرمودات اور کالموں سے بھرپور استفادہ ہو چکا ہے۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں اپنا نام شامل نہیں تھا تو صفحہ بہت اُداس لگا...... ہاہاہا...... مذاق کر رہی ہوں۔ کاشی صاحب نے بہت عمدہ شاعری کا کلیکشن کیا ہے پڑھ کر مزا آ گیا۔ لیکن پھر بھی ہم میر سے معافی کے ساتھ ان کے شعر میں اپنا نام لے کر اپنے لیے رطب اللسان رہتے ہیں کہ بقول میر

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ ہے میر کا اندازِ بیاں اور

بہرحال دوشیزہ پڑھ کر عموماً اور آپ کا جواب پڑھ کر خصوصاً منزہ یقین جانیں بڑی توانائی آ جاتی ہے آپ کی خوش اخلاقی کی میں قائل ہوں اللہ آپ کو دین و دنیا کی خوشیاں اور سرفرازیاں نصیب فرمائے آمین۔ ایک غزل ارسال پہلے سے ہے لہٰذا نئی اگلی بار ارسال کروں گی۔ دوشیزہ' کاشی' منزہ اور تمام اراکین و مبصرین و مصنفین کے لیے تہہ دل سے دعاگو۔

ﷺ: بہت ہی اچھی خولہ! تمہارے خط کا انتظار تھا اس لیے کہ مصنفین اُن کی تحریر کو توجہ سے پڑھ کر رائے ایک اچھا مصنف ہی دے سکا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمہاری اپنی تحریر میں بھی جان ہوتی ہے۔ آرے میاں ذاتی طور پر مجھے بہت اچھا لگا وقت نکال کر ضرور لکھا کرو جب خدا نے اس نعمت سے نوازہ ہے کہ انسان اپنے خیالات اور احساسات کو الفاظ دے سکے تو پھر قلم نہیں رُکنا چاہیے۔ دوشیزہ کی پسندیدگی کے لیے میں دل سے مشکور ہوں۔

⋈: لاہور سے یہ آمد ہے ماہ وش طالب کی' لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ اور دوشیزہ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف ممبران' ورکرز کو لکھاری اور قارئین کو میری طرف سے نیا سال بے حد مبارک ہو' ویسے تو ہم مسلمان ہیں اور ہمارا نیا سال' تین ماہ پہلے ہی محرم کے آغاز سے شروع ہو چکا ہے۔ مگر کیا کریں۔ فرنگیوں کی پیروی کرنا ہماری مجبوری ہی تو بن چکا ہے۔ اس لیے اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اسلامی تعلیمات کی پیروی کرتے ہوئے زندگی گزارنے کی توفیق دے' دوشیزہ کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے۔ آپ نے جس طرح دوشیزہ کے لیے محنت کی۔ اس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا معیاری مواد اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سدا خوش رہو۔ آپ کی ہنستی مسکراتی تصویریں' ایک آدھ بار فیس بک کے ذریعے میری نظر سے بھی گزری ہیں۔ آپ کی ہمشیرہ کو اللہ صحت کاملہ عطا کرے آمین۔ فون پر کوشش کے باوجود کوئی نہ کوئی بات رہ ہی جاتی ہے۔ سرورق اچھا لگا' پھر دسمبر کے اداریے (سچ ہے کہ آگے بڑھنے کی لگن اور نئی امید ہی ناکامیوں کے آسیب سے جان چھڑانے کی کنجی ہے) سے سیر ہوتے ہوئے محفل کی جانب بڑھے۔ جو پورے شمارے کی جان ہے۔ سب کے حال' احوال کا معلوم ہوا' عقیلہ حق کا اندازِ تخاطب بے حد دلچسپ ہے۔ اور انہیں کہیے کہ میں نے انہیں یاد کیا تھا۔ مگر وہ بے چارہ خط ہی

دنیا میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں

آپ دوشیزہ کے خریدار بن کر ملک کو
زرِمبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زر سالانہ

ملک	زر سالانہ	ملک	زر سالانہ
کویت	55امریکی ڈالرز	ایران	55امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55امریکی ڈالرز	سری لنکا	55امریکی ڈالرز
یو اے ای	55امریکی ڈالرز	جاپان	55امریکی ڈالرز
مصر	55امریکی ڈالرز	لیبیا	55امریکی ڈالرز
یونان	55امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55امریکی ڈالرز
فرانس	55امریکی ڈالرز	جرمنی	55امریکی ڈالرز
برطانیہ	55امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55امریکی ڈالرز
ناروے	55امریکی ڈالرز	پولینڈ	55امریکی ڈالرز
امریکہ	65امریکی ڈالرز	کینیڈا	65امریکی ڈالرز
افریقہ	65امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65امریکی ڈالرز

88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز 7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

راستے میں کھو گیا' اب اسی لیے بذریعہ ای میل محفل میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ امید ہے شامل ہو سکے گا' شائستہ لودھی کا انٹرویو بھی اچھا تھا' افسانے تو سب ہی ایک سے بڑھ کر تھے۔ زینب ندیم نے بھی اچھا لکھا' رفعت سراج یوں تو نام ہی کافی ہے' مگران سے کہیے کہ انگریزی کا بلاضرورت استعمال کہانی کی روانی میں خلل پیدا کرتا ہے کہ ہم اردو کی ترویج کے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئے ہیں۔ ناکہ انگلش ڈائجسٹ...... خولہ عرفان کا افسانہ بھی عمدہ تھا اُن کے تبصروں کی مانند۔ اور نئے سال کے سلسلے میں جو نئے سلسلے شروع کرنے والی ہیں آپ اُن کا شدت سے انتظار ہے دوشیزہ اور سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ تقریب کا بھی' مجھے دعوت نامہ ملے یا نہیں' اس سے قطع نظر...... کیونکہ ڈائجسٹ میں لکھنے سے پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ رائٹر ایوارڈ اور ایوارڈ تقریب کس بلا کا نام ہے' لہٰذا اب اس میں دلچسپی ہونا فطری بات ہے۔ خط طویل ہو گیا اجازت چاہوں گی۔

٭: بہت اچھی ماہ وش! لو تمہارا تبصرہ محفل میں شامل ہے۔ ڈاک خانے والوں کی کرم فرمائیوں سے کون واقف نہیں۔ نئے سال میں میری شدید خواہش ہے کہ ہمارا ڈاک کا نظام بہتر ہو جائے اور ہاں سچی کہانیاں اور دوشیزہ دونوں تمہارے اپنے پرچے ہیں۔ سچی کہانیاں کی تقریب تو تمہارے اپنے شہر لاہور میں ہو رہی ہے تمہیں اجازت کی ضرورت نہیں' حق سے آؤ۔

✉: لاہور سے تشریف لائی ہیں زمر نعیم لکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی اور ادارے کے تمام اراکین و وابستگین کی خیریت و عافیت کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتی ہوں۔ اللہ سے دعا ہے وہ ہم سب پر ہمیشہ اپنا فضل و کرم رکھے اور عالم اسلام کے علاوہ ہمارے پیارے وطن میں بھی امن وامان قائم و دائم کر دے آمین۔ منزہ جی! زندگی جیسے کسی ٹائم مشین میں چکرا تی چند ساعتوں میں سالوں کا سفر کرتی محسوس ہونے لگی ہے۔ ابھی اڑھائی ماہ قبل اسلامی کلینڈر کے لحاظ سے نئے سال کا آغاز ہوا تھا اور اب عیسوی کلینڈر بھی نئی ابتداء کی طرف پلک جھپکتے گامزن ہو جائے گا۔ ہماری سوچیں اور عمل ابھی جامہ عمل پہن بھی نہیں پاتے کہ وقت کی طرز بدل جاتی ہے۔ فکر بدل جاتی ہے حتیٰ کہ جہت بھی اور ہم وہیں کھڑے رہ جاتے ہیں۔ زندگی آگے بڑھ جاتی ہے کہ وقت یہ بات سمجھ ہی نہیں آرہی...... بہر حال...... وقت کی رفتار تھمے گی نہ زندگی کی اور...... ہم ہر قدم اس آس اور امید پر بڑھاتے چلے جائیں گے کہ ایک نہ ایک دن ہم بھی زندگی اور وقت کے ہم رفتار ہو ہی جائیں گے۔ اللہ سے دعا ہے کہ نئے سال کی ہر ساعت کو ہم سبھی پر اپنی رحمت کی طرح بابرکت اور سایہ ذوالجلال والاکرام کر دے۔ تاکہ پھر ہمیں کسی مصیبت کا خوف رہے اور نہ ہی کسی کی بری نظر کا...... آمین ثم آمین۔ منزہ! پتہ نہیں کیوں دل اُداس ہونے کا سبب ملتا ہے نہ کوئی وجہ..... شاید موسم کی شدتوں نے زندگی میں یک رنگی سی پیدا کر دی ہے آپ بھی کہیں گی زمر پر قنوطیت سی طاری محسوس ہوتی ہے۔ اللہ رحم کرے۔ میرا خط طویل نہ ہو جائے یہ خوف بھی غالب ہے۔ اس لیے اب ذرا نارمل انداز میں گفتگو ہو جائے۔ میں ابھی امکان باقی ہے کی آٹھویں قسط ارسال کر رہی ہوں موصول ہونے پر مطلع ضرور کیجیے گا۔ انشاء اللہ جلد ہی بروقت اگلی اقساط بھی ارسال کرتی رہوں گی۔ آپ کی محبت و خلوص کے ساتھ نومبر تک کا اعزازیہ موصول ہو گیا تھا۔ میں نے فون پر تو شکریہ ادا کر دیا تھا اب تحریری طور پر بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جزاک اللہ...... دسمبر 2016ء کا شمارہ اپنی تمام تر تحریروں بشمول آپ کے اداریہ کے بے مثال اور یادگار شمارہ لگا اور محفل دوشیزہ کا ہر خط محبت کی خوشبو بکھیرتا محسوس ہوا۔ غزالہ رشید سے صرف افسانہ ہی

نہیں کسی طویل سلسلے کی بھی خواہش رکھتی ہوں۔ یقیناً آپ اور قارئین بھی تائید کریں گے۔ سنبل کے بارے میں یعنی سنبل کی تحریر کے بارے میں تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح آنگن کی چڑیاں' اپنے موضوع اور اندازِ تحریر کے باعث دل پر نقش ہوگیا۔ فرح اسلم کو ایوارڈ مبارک ہو۔ مزید قلم کو روانی و تابانی عطا ہو۔ آمین منزہ جی مجموعی طور پر محفل کا ہر خط اور شمارے کی ہر تحریر آپسی محبت اور آپ سب کی محنت و انتخاب کا منہ بولتا ثبوت نظر آتا ہے۔ خولہ عرفان اپنے بارے میں کسر نفسی سے کام لیتی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں جو پختگی و سلاست و روانی ہے۔ وہ بہت کم نظر آتی ہے۔ آڑے میاں شمارے کی بہترین تحریر لگی۔ احمد سجاد بابر بھی دوشیزہ کے لیے اچھی تحریریں پیش کرتے آ رہے ہیں۔ اماؤس میں گھرا چاند موضوعاتی لحاظ سے بہترین اور پُر اثر تحریر لگی۔ نسرین اختر نینا ان پہلے تو اپنی محنت و کاوش پر مبارکباد وصول کریں۔ سپنے سہانے ابھی تک دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ امید ہے اگلی اقساط مزید دلچسپ ثابت ہوں گی۔ باقی افسانے اور تحریریں بھی بھرپور تھیں۔ لائف بوائے کا مستقل ساتھ آپ کی ضرورت اور ہماری عادت بنتا جا رہا ہے۔ اسماء اعوان داد کی مستحق ہیں۔ ایک پروڈکٹ کو اتنی خوبصورت کہانیوں سے جوڑ کر انہوں نے اپنا ہنر و کمال ثابت کر دیا ہے۔ سلسلے اور انٹرویو ہمیشہ کی طرح دلچسپی سے پڑھے۔ منزہ آپ کہیں گی آپ کی ہمشیرہ کے لیے دعا کا کہا گیا تھا۔ زمر نے اس حوالے سے تذکرہ تک نہیں کیا بس کیا کہوں آپ کی تکلیف و دکھ دل سے محسوس کرتی ہوں۔ ہمیشہ آپ سبھی شاملِ دعا رہتے ہیں۔ انشاءاللہ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ منزہ جی! دسمبر کے مہینے میں نجانے کیوں ہر سال کوئی سانحہ ہمارے وطن عزیز کی گود سے عظیم ماؤں کے لعل و گوہر قبر خاک دفن کرنے پر مجبور کر جاتا ہے۔ ادارے کی نااہلی ہے یا نصیب کا لکھا...... بہر حال قیامت بپا تو ہو ہی جاتی ہے۔ پل بھر میں قیمتی جانیں خاکستر ہونے کا الزام کس کو دے سکتے ہیں ہم...... 7 دسمبر کو پیش آنے والا حادثہ یا سانحہ ایک بار پھر سوچوں کو بدلنے کا باعث بن گیا۔ ذہن حاضر ہے نہ خیالات مربوط...... کوئی غلطی یا سہو ہوگیا ہو تو معاف کیجیے گا۔ انشاءاللہ رابطہ رہے گا۔ عقیل حق سے رابطہ ہو سلام کہیے گا۔ اُن کے بیٹے کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اللہ تمام ماؤں کے بیٹوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ انشاءاللہ رابطہ رہے گا۔ میرے بے ربط خط کو ترتیب دے دیجیے گا۔ آپ کی مشکور رہوں گی۔

ﷺ: رانی زمر! اللہ تمہیں مکمل صحت کے ساتھ بے حساب خوشیاں عطا فرمائے۔ تمہاری آنکھوں میں کبھی آنسو نہ آئیں یہ میری دل سے دعا ہے تم لوگ وقت نکال کر مجھے شمارے کے بارے میں بتاتے ہو یقین کرو اس سے مجھے دوشیزہ کو نکھارنے میں بہت مدد ملتی ہے ظاہر ہے تنہا تو میں کچھ نہیں...... تمام لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا یہ اپنا رسالہ ہے دل کھول کر مجھے اپنی رائے سے آگاہ کریں مجھے اچھا لگے گا۔ وقت قیامت کی رفتار سے گزرتا چلا جا رہا ہے بہت پیارے پیارے لوگ چلے گئے ایسے بھی چلے گئے جن کے جانے کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا جنید جمشید بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہیں موت اٹل حقیقت ہے مگر اتنا زندہ دل انسان لمحوں میں چلا گیا کہ اب بھی یقین نہیں آتا اللہ جنید جمشید سمیت ان تمام لوگوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے جو اپنے پیاروں کو تنہائی کی سولی پر چڑھا گئے۔ بس زمر یہی دنیا کی حقیقت ہے۔ پرچا پسند کرنے کا شکریہ محفل میں ضرور آیا کرو میں منتظر رہتی ہوں۔

اس آخری خط کے ساتھ اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے' خوش رہیے اور خوش رکھیے انشاءاللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی' اللہ حافظ۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

یاسر نواز بلوچ

ڈائریکٹر، پروڈیوسر، ایکٹر اور ماڈل

ذیشان فراز

آج ہم آپ کی ملاقات شوبز انڈسٹری کے سب سے روشن ستارے سے کروانے جا رہے ہیں۔ فرید نواز بلوچ جیسے قد آور آرٹسٹ کے سپوت اور دانش نواز جیسے معصوم ہیرو کے بھائی یاسر نواز سے......

یاسر نواز کا شمار اُن چند خوش نصیب اداکاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے آنکھ کھولتے ہی کیمرے، لائٹس اور ٹی وی کی اسکرین دیکھی لہٰذا اداکاری اور اس سے جڑے تمام لوازمات ان کے خون میں شامل ہیں۔ آیئے اپنے پہلے سوال کی طرف بڑھتے ہیں۔

س: یاسر اپنے وقت کے بہترین اداکار کا بیٹا ہونا فائدہ مند ہے یا نقصان دہ؟

ج: میں خوش نصیب ہوں کہ میں فرید نواز بلوچ کا بیٹا ہوں اور یقیناً مجھے اس رشتے سے ہمیشہ فائدہ ہی پہنچا ہے مگر کبھی کبھی لوگوں کی امیدیں آپ سے بہت زیادہ ہوجاتی ہیں۔ اب تو خیر ایسا نہیں مگر مجھے شروع میں کافی دشواری کا سامنا کرنا

پڑا۔ ہر انسان اپنی انفرادیت رکھتا ہے اسی لیے جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ایکٹنگ میری فیلڈ نہیں اور اسی لیے میں ڈائریکشن کی طرف آ گیا۔

س: یاسر ایسے کون سے ڈرامے ہیں جنہیں آپ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کی بہترین تخلیق ہیں؟

ج: یار جیسے انسان کو اپنے سارے بچے ہی پیارے لگتے ہیں اسی طرح مجھے اپنی ہر ڈائریکشن میں تیار کیے تمام ڈرامے ہی بہت پسند ہیں مگر جنہیں عوام میں بہت مقبولیت ملی وہ نادانیاں' اڑان' میری ادھوری محبت' سات پردوں میں' اور پر گوری کا مکان اور ظاہر ہے فلم 'رانگ نمبر.......

س: پاکستانی سنیما کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟

ج: پاکستانی سنیما 2013 کے بعد بہت تبدیل ہوا ہے۔ وار' زندہ بھاگ' میں ہوں شاہد آفریدی' جلیبی' اور نامعلوم افراد جیسی بلاک بسٹر فلموں نے پاکستانی سنیما کا مزاج بہترین کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کچھ وقت ضرور لگے گا اور پھر ہمارا سنیما کامیابی کی منزلیں طے کرنا شروع کر دے گا۔ لوگوں کو بھی چاہیے کہ اپنی

فلمیں ضرور دیکھیں اسی طرح امپروومنٹ ہوگی۔

س: کیا مشکلات محسوس کرتے ہیں فلم میکنگ میں؟

ج: مشکلات تو بہت ہیں وسائل محدود ہیں۔ ہمیں اسی میں رہ کر کام کرنا ہے اس وجہ سے کبھی کبھی Creativity کمپرومائز ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ صرف بڑے بجٹ کی فلم ہی کامیاب ہو Content کی بہت اہمیت ہے۔

س: اچھا یاسر یہ بتائیں کہ بچپن کہاں گزرا اور آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

ج: میری پیدائش 22 جون 1970ء کراچی کی ہے۔

س: والدین کا رعب تھا آپ بہن بھائیوں پر؟

ج: امی ابو کے تعلقات آپس میں بہت اچھے تھے امی ہر چھوٹی بڑی بات ابو کو بتاتی تھیں اور وہ معاملات کو ہینڈل کرتے تھے مگر رعب تو نہیں رکھا وہ بہت اچھے دوست تھے اور ہمیشہ کہتے تھے کہ کوئی بھی بات ہو چھپانا نہیں اگر کوئی لڑکی بھی پسند آجائے تو بتا دینا۔ بلکہ مجھے ایک واقعہ یاد ہے میں نے سگریٹ پینی شروع کر دی تھی چھپ چھپ کر والد صاحب کو پتہ چل گیا وہ سگریٹ چھوڑ چکے تھے کہتے تھے بچوں کے سامنے نہیں پینا چاہیے۔ مگر جب میرا پتہ چلا تو دوبارہ شروع کر دی اور کہا تم لوگوں کی خاطر چھوڑی تھی تم ہی پینے لگے ہو تو میں کیوں نہ پیوں۔ بس اس دن شرم کے مارے جو سگریٹ چھوڑی تو آج تک نہیں پی۔

س: آپ کتنے بہن بھائی ہیں دانش کو تو سب ہی جانتے ہیں اور اُن کے علاوہ؟

ج: ہم 3 بھائی اور ایک بہن ہیں۔ میں 'فراز' دانش اور صنم۔

س: ندا سے شادی پسند کی تھی یا والدین کی خواہش؟

ج: ندا اور میں ڈرامے 'محبت' میں کام کر رہے تھے بس وہیں ہم نے ایک دوسرے کو پسند کیا میرے اور ندا دونوں کے والدین کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے بہت سکون سے شادی ہوگئی۔

س: کوئی ایسی خوشی جو آج تک آپ محسوس کرتے ہیں؟

ج: فرید میرے بڑے بیٹے کی پیدائش پر مجھے جو خوشی ہوئی تھی میں اُس کا کسی بھی خوشی سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فرید کے بعد صلہ اور پھر بالاج میرے بچوں نے میری زندگی مکمل کر دی۔ میں جب انہیں دیکھتا ہوں تو ساری پریشانیاں بھول جاتا ہوں۔

س: بچے آپ پر گئے ہیں یا ندا پر؟

ج: میرے بچے بہت باتونی ہیں اور ظاہر ہے ندا پر گئے ہیں میں بہت خاموش طبیعت کا انسان ہوں میں نے شادی کے شروع میں ندا کو بتا دیا تھا کہ بھئی دیکھو میں کسی بھی فنکشن میں بچوں کو نہیں سنبھالوں گا۔ یہ مجھے پسند نہیں۔ میں گاڑی چلاتے ہوئے بالکل بات نہیں کرتا تو بعد میں اس بات پر مت لڑنا کہ آپ مجھے اگنور کرتے ہیں۔

س: ڈرائیونگ مشکل لگتی ہے جو چپ رہتے ہیں؟

ج: نہیں یار میں گاڑی چلاتے ہوئے سوچتا بہت ہوں سوچتا میں ویسے بھی بہت ہوں مگر گاڑی چلاتے وقت سارے دن کی پلاننگ کرتا رہتا ہوں ایک بار تو خراب ٹرک کے پیچھے 10 منٹ تک کھڑا رہا بعد میں غور کیا تو پتہ چلا کہ وائیں

بائیں سے گاڑیاں گزر رہی ہیں تب ریورس کر کے گاڑی نکالی۔

س: بیگم سے ڈرتے ہیں؟

ج: ہر شریف آدمی ڈرتا ہے گھر میں تو میں بکری ہوں ویسے بھی ہمارے جھگڑے دو تین دن کی خاموشی کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔

س: یاسر کچھ عرصہ قبل آپ کا نام سوہائے علی کے ساتھ لیا جاتا رہا کیا اس سے گھریلو زندگی پر اثر پڑا؟

ج: سوہائے میری فلم 'انجمن' میں کام کر رہی تھی جب آپ ساتھ کام کر رہے ہوتے ہیں تو گھر سے زیادہ وقت ریکارڈنگ میں گزرتا ہے۔ ایسے میں کچھ لوگوں نے یہ افواہ اڑائی تھی مگر اللہ کا شکر ہے کہ 13 سالہ شادی شدہ زندگی اور تین بچوں کے بعد میری شادی شدہ زندگی کو نہ کبھی خطرہ تھا نہ ہوگا، انشاء اللہ۔

س: اچھا یہ بتائیں ٹی وی دیکھتے ہیں؟ اور بیگم کے علاوہ کون سی ہوسٹ پسند ہیں؟

ج: ٹائم کم ملتا ہے مگر مارننگ شوز کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوں لیکن اگر سچ پوچھو تو مجھے ماریہ واسطی کا انداز سب سے زیادہ پسند ہے وہ بہت اچھی طرح اپنا شو ہوسٹ کرتی ہے۔

س: فلمیں کون سی آل ٹائم فیورٹ ہیں؟

ج: مجھے وار' بول' خدا کے لیے' نامعلوم افراد اور انڈین برفی بہت پسند ہیں۔

س: آپ موڈی ہیں؟ یا غصہ بہت کرتے ہیں؟

ج: میں موڈی تو ہوں مگر غصہ بہت نہیں کرتا لیکن اگر آجائے تو کافی گڑبڑ ہو جاتی ہے لیکن ایک عجیب بات ہے کہ فوراً مان بھی جاتا ہوں پھر یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی جھگڑا ہوا تھا 15' 20 دن بعد جب اس شخص سے ملتا ہوں تب وہ اکڑا ہوا ہوتا ہے اور مجھے یاد ہی نہیں آرہا ہوتا کہ ناراضگی کی وجہ کیا ہے۔

س: آپ ڈائٹ کرنے پر یقین رکھتے ہیں؟

ج: یار مجھے کھانے سے پیار ہے میں کھانا نہیں چھوڑ سکتا لہٰذا ڈائٹ کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا حالانکہ ندا بولتی رہتی ہے کہ پیٹ کم کر لیں لیکن مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

س: یاسر اپنے چاہنے والوں سے کیا کہیں گے؟

ج: فی الحال تو یہی کہوں گا کہ سپورٹ پاکستانی سینما یا پاکستانی فلم انڈسٹری کو ہم سب مل کر ہی کامیابی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

اپنے ایڈیٹرز کے اعزاز میں دی گئی ایک ضیافت کا مختصر احوال

منزہ سہام

میرا بہت عرصے سے دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنے ایڈیٹرز کے ساتھ کچھ وقت گزاروں۔ ہم سب مل کر بیٹھیں ہنسی مذاق ہو پرانی باتیں یاد کر کے گزرے دنوں کی یادیں تازہ کی جائیں مگر ہر بار مصروفیت آڑے آتی

اندازہ ہوا کہ فرصت کے لمحات تو نکالنے پڑتے ہیں اور بس اسی لیے میں نے غزالہ رشید، رضوانہ پرنس اور کاشی چوہان کو دعوت دے ڈالی اور پھر نومبر کی دوپہر میرے تینوں مہمان آفس میں موجود تھے۔ میں کام بھی نمٹاتی

بات بات پہ مسکراہٹیں، یہ یادگار ملاقاتیں، بھلا کس طرح باہم مل بیٹھ کر نہ ہوں گی

رہی پھر مینا تاج نے ہم سب کو الوداع کہہ دیا تب مجھے ... رہی اور خوش گپیوں میں بھی بھرپور حصہ لیتی رہی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے......

غزالہ رشید جملے کی تلاش میں، رضوانہ پرنس آنیوالے جملے سے بچاؤ کا طریقہ ڈھونڈ رہی ہیں جبکہ کاشی چوہان کی سنجیدگی کے کیا کہنے

1:30 بجے کے قریب ہم لوگ BBQ ٹونائٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ میزبانی کے فرائض زین کو انجام دینے تھے کیونکہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں تو مہمان ہوں بالکل اپنے ایڈیٹرز کی طرح...... ریسٹورنٹ پہنچنے تک میں رضوانہ اور غزالہ خوب باتیں کرتے رہے بہت دنوں بعد ہم سب بہت ہنسے زین

Downloaded From
Paksociey.com

میں بتاتی ہوں چائے کیسے پیتے ہیں

رضوانہ پرنس اور کاشی چوہان، غزالہ رشید سے چائے پینے کا طریقہ سیکھتے ہوئے

گاڑی ذرائیو کر رہے تھے اگلی سیٹ پر کاشی بیٹھے تھے جو بار بار ہم لوگوں کو احساس دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ ہم لوگ کافی شور مچا رہے ہیں مگر ہمیشہ کی طرح ہم بھار ہا تھا۔ کاشی پورا وقت کافی پریشر میں محسوس ہوئے یقیناً سینئر ایڈیٹرز کی موجودگی اصل وجہ تھی۔ بے انتہا پُرتکلف ماحول میں کھانا کھایا گیا پھر بیٹھے کا دور چلا ہم

ارے کاشی! تمہیں بھی بولنا آتا ہے

منزہ سہام اور رضوانہ پرنس کاشی چوہان کی کسی برجستہ بات پر مسکراتے ہوئے

لوگوں کا گھورنا ہی کاشی کے لیے کافی تھا۔ ریسٹورنٹ پہنچ کر ہم تینوں اوئے بے نیازی سے گاڑی سے اُتر کر ڈائننگ ہال میں داخل ہو گئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ٹیبل کیونکہ پہلے ہی Reserve کروالی تھی اس لیے پریشانی نہیں ہوئی۔ بھوک شدید لگ رہی تھی اس لیے فوراً ہی کھانے کا آرڈر دے دیا اور رضوانہ نے ویٹر کو تاکید بھی کر دی کہ ذرا جلدی کھانا لائیں۔ لہٰذا چند منٹوں ہی میں میز افغانی پلاؤ، فرائیڈ فش، بار بی کیو پراٹھے، نان اور کولڈ ڈرنک سے سجا دی گئی۔ میں رضوانہ اور زرین ایک جانب اور غزالہ اور کاشی دوسری جانب بیٹھے تھے۔ ہمیشہ کی طرح کھانا آرڈر کرتے وقت غزالہ نے مجھے ٹوک کر کہا کہ منزہ پلیز بہت مت منگوایئے گا۔ کھانے کے دوران بھی خوش گپیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ غزالہ کے برجستہ جملے اور رضوانہ کا دل کھول کر ہنسنا دل کو بہت

سب کی فرمائش پر نہایت ہی لذیذ قلفی سرو کی گئی۔ اس دوران بھی خوب جملے بازی چلتی رہی زرین کی نظریں مستقل مہمانوں کی پلیٹوں پر ہی تھیں کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے کوئی چیز کم نہ پڑ جائے میں زرین کی طبیعت سے واقف ہوں اس لیے مطمئن تھی کہ وہ ایک بہت اچھا میزبان ہے۔ کھانے کے بعد ہم لوگ دفتر واپس آ گئے بیٹھے پان اور چائے سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے اور خوب تصویریں بھی کھینچی گئیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ فیس بک پر اب لوڈ نہیں کی جائیں گی۔ سب سے پہلے رضوانہ نے رخصت چاہی...... پھر نسیم بھائی غزالہ کو لینے آ گئے۔ غزالہ کے جانے کے بعد میں نے کچھ ادھورے کام سمیٹے اور گھر کی جانب روانہ ہو گئی یوں ایک بہترین دن اپنے بہترین دوستوں کے ساتھ گزرا۔

☆☆......☆☆......☆☆

لائف بوائے... بالوں کا ہر مسئلہ سلجھائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

پن چکی کی آواز نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ لگتا تھا سورج کے اندھیرے سے نکلنے سے پہلے گاؤں میں یہ آواز ہر سُو معمول کے مطابق اپنا جادو جگانا شروع کر دیتی تھی۔ تاجاں نے اٹھتے کے ساتھ ہی منہ پر لپ جھپ پانی کے چھینٹے مارے اور نئے دن کو خوش آمدید کہنے چل دی۔ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہی اُس کے منہ سے سسکی نما چیخ بلند ہوئی اور وہ......

''سی......'' کر کے رہ گئی۔ سارا سارا دن کھیتوں میں کام کر کے اُس کی کمر اکڑ جاتی تھی۔ اوپر آگ برساتا سورج ہوتا تھا اور نیچے فصلوں کی اپنی گرمائش...... کیا خیال رکھتی اپنا یا اپنے بالوں کا...... بس بالوں میں اصلی سرسوں کی کھلی سے سر دھویا اور تیل لگا کر وہ خدا کی اس حسین نعمت پر گویا احسانِ عظیم کر دیا کرتی تھی۔ اسکول جانا ابھی حال ہی میں چھوڑا تھا کیونکہ اچانک سے ماں کے انتقال نے اُسے پندرہ برس کی عمر میں ہی بہت سمجھدار کر دیا تھا۔ اب ماں کی ساری ذمہ داریاں اُس کے کاندھوں پر تھیں۔ گھر کا چولہا ہانڈی، کھیتوں کا کام...... وہ تو گویا گھر اور کھیت کے پاٹوں میں پس رہی تھی۔ ایک ہی سہیلی تھی شکیلہ اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنا سارا دکھ سکھ شیئر کر لیتی تھی۔

تاجاں نے بیدار ہو کر باورچی خانہ سنبھالا تھا۔ ناشتے کے بعد لسی بلو کر اُس نے مکھن کا پیڑا کٹوری میں نکالا اور روٹی کے پھلکے پر دیسی گھی لگا کر بابا کے لیے چائے کے پیالے سمیت لے آئی۔

''نمانی دھیے! تیرا رب راکھا ہووے...... تُو نے تو میری نکی دھی اپنی ماں کا سارا کام اپنے ہاتھ میں لے کر اس گھر کو زندگی دے دی بیٹی۔''

''ارے بابا...... تُو ہے نا میری ماں اور میرا باپ...... تو پھر فکر کیسی۔'' اُس نے دلار سے باپ سے کہا تو باپ کی آنکھوں میں دو آنسو تیر گئے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی تنہائی کے خیال سے دوسری شادی کا سوچ رہا تھا تاکہ بیٹی کے ساتھ دوسری عورت ماں بن کر ساتھ ہو جائے۔

وہ جانتی تھی کہ بابا اب اُداس ہو جائے گا لہٰذا اُس

نے وہاں سے جانے ہی میں عافیت جانی اور گھر کے کام دھندوں میں لگ گئی اور بابا کھیتوں کو نکل گیا۔

☆......☆......☆

بابا کے لیے کھانا لے کر وہ نکلی تو اپنی ہی دھن میں چلتی چلی جارہی تھی۔

''تاجاں اے تاجاں!'' قدرے فاصلے سے آتی آواز پر تاجاں کے قدم ٹھنک کر رک گئے۔ اس کے ہاتھ میں لسی کا برتن اور سر پر روٹیوں کی چنگیر تھی' دوسرے ہاتھ میں اُس نے ایک چھڑی پکڑی ہوئی تھی' جس سے وہ گاہے بہ گاہے زمین کریدتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر کوئی نظر نہ آیا۔

''ارے اوتاجاں!'' پہلا قدم اُٹھاتے ہی آواز پھر آئی لیکن اب یہ قریب سے آئی تھی پھر کماد کی بھرپور فصل میں سے شکیلہ کا چہرہ اور پھر پورا جسم نمودار ہوا۔

''یہ تُو ہے' یہاں کیا کررہی ہے؟ اور مجھے آواز کیوں لگارہی تھی؟'' اُس نے چھڑی سے شکیلہ کے بازو کو چھوا۔

''تجھ پہ نظر پڑی تھی تو آواز لگالی، ویسے ایویں آواز نہیں لگائی۔ کچھ پوچھنا تھا تجھ سے۔''

''کیا؟''

''ہم شہر جارہے ہیں۔ وہ ماسی صغراں ہے ناں' پاس والے گاؤں والی' اُس کی بیٹی کی شادی ہے۔ اسے خریداری کرنا ہے' ماں کے پاس آئی تھی وہ۔ میں' مینو' کاجل اور عائشاں بھی جائیں گے' تجھے چلنا ہو تو چل۔''

''میں کیا کروں گی جاکر؟'' اُس نے بے پروائی سے کہا۔

''تو؟'' وہ زور سے ہنس پڑی۔

''سنا ہے' چاچا شادی کررہا ہے۔ تو تُو تیاری نہیں کرے گی؟''

''مجھ سے ایسا مذاق نہ کیا کر۔'' تاجاں بُرا مان گئی۔

''لے مذاق کیسا...... کیا خبر چاچا سچ مچ ہی شادی کررہا ہو۔ سنا ہے' اُسے تیری فکر رہتی ہے کہ جوان سیانی بیٹی گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ ماں ہوگی تو دیکھ بھال تو کرلے گی۔''

''ہاں' ننھی بچی ہوں نا میں۔'' وہ تنتنا کر بولی۔

''اسی لیے تو فکر ہے۔'' شکیلہ پھر ہنس دی۔

''اونہہ......'' تاجاں نے منہ پھیرلیا۔

''اچھا بات تو سن...... چھوڑ چاچا کو' تجھے اپنے لیے کچھ نہ لینا ہو پر ایسے ہی چل' سچ بڑا مزہ آئے گا۔ سیر کریں گے شہر کی اور...... اور چاٹ بھی کھائیں گے بازار میں۔'' شکیلہ للچارہی تھی۔

''شکیلہ......او شکیلہ...... میری پیاری سہیلی ذرا یہ دیکھ میرے بالوں کا کیا حشر ہوتا جارہا ہے۔ قسم اللہ پاک کی...... کوئی ناغہ کیے بغیر میں سرسوں کا تیل سر پہ لگاتی ہوں اور کھلی سے سر دھوتی ہوں مگر میرے بال ایسے کھردرے اور بے رونق ہونے لگے ہیں کہ بس...... مجھے تو ایسا لگتا ہے کسی دن یہ گھونسلہ خود بخود ٹوٹ کر میرے ہاتھوں میں آجائے گا۔'' اُس کی وحشت اُس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ شکیلہ اُس کی پریشانی سے واقف تھی مگر یہ تو گاؤں کی ہر لڑکی کا مسئلہ تھا۔ دیسی ٹوٹکوں کے علاوہ وہ لوگ بالوں اور چہرے پر ہر چیز کا استعمال حرام سمجھتی تھیں۔ کتنی ہی لڑکیاں بالوں کی نشوونما نہ ہونے کے باعث بالوں سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں اور پھر بڑے بڑے پراندوں میں رہے سہے بال چھپاتی پھرتی تھیں۔

''تُو ایسا کر میرے گھر آنا پھر اماں سے مل کر کوئی بات کرتے ہیں۔''

''چل ٹھیک ہے۔''

ان لوگوں کے لیے شہر میں بہت کشش تھی اور اگر کسی سبب ان کو شہر جانا پڑ جاتا تھا تو گویا اِن کی

پنک ہو جاتی تھی۔"

"بابا سے پوچھتی ہوں۔"

"جا' جلدی سے چاچا کو روٹی دے آ......اور وہ کہہ دے تو پھر ادھر ہی آ جانا۔ میں چاچا کے کھیت پر ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" تاجاں چھڑی لہراتی آگے بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

شہر جانے کا سوچ کر اس کے چہرے پر خوشی جھلملانے لگی تھی۔ جسم میں خود بخود پھرتی اور توانائی آ گئی تھی۔ بابا نے اسے خود ہی مسکراتے دیکھا تو چونک کر دیکھنے لگا۔

"دھی رانی کیا بات ہے؟ بہت خوش ہے؟" وہ ٹٹولنے والی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

"بابا' میں شہر جاؤں؟"

"کس کے ساتھ؟"

"وہ شکیلہ کے گھر والے جا رہے ہیں خریداری کرنے۔"

"پر تُو نے کیا کرنا ہے جا کے' میرے ساتھ چلنا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"لیکن بابا......" شکیلہ کے ساتھ نہ جانے کے خیال سے وہ کچھ اُداس ہو گئی۔ بابا کے ساتھ وہ مزا بھلا کب آتا جو شکیلہ' کاجل' مینو اور عاکشاں کے ساتھ آتا۔ بابا نے اس کے اُداس چہرے کو دیکھا تو مسکرایا۔

"اچھا چل جا...... اور ہاں' اپنے واسطے دو جوڑے بھی لیتی آنا۔"

"کیوں بابا؟" وہ حیرانی سے مسکرا دی۔

"بس لے آنا۔" اس نے کھیسے میں سے پیسے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

وہ بلا وجہ ہی ہنس دی۔ ایک تو شہر جانے کی اجازت مل گئی اوپر سے بابا نے پیسے دے کر دو جوڑے بھی لینے کو کہہ دیا تھا۔ بات تو خوشی کی تھی ناں۔

☆......☆......☆

"سلام ماسی!" تاجاں نے شکیلہ کے گھر آتے ہی اُس کی ماں شمیم کو سلام جھاڑا۔

"جیتی رہ میری دھی! بڑی مصروف ہو گئی ہے تُو' ماسی کے واسطے تیرے پاس اب ٹیم (وقت) ہی نہیں ہوتا۔" شمیم نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شکوہ بھی کر ڈالا۔

"ماسی! تجھے تو پتا ہے نا گھر کے کام دھندوں میں کہاں ٹیم ملتا ہے' میں تو بس شکیلہ کے ساتھ شہر جانے کے لیے بابا سے اجازت لے کر آ گئی ورنہ کہاں نکلتی ہوں۔" وہ بے بسی سے بولی تو شمیم کو اپنی بات کا افسوس ہونے لگا۔

"چل تُو اُداس نہ ہو...... اور ہاں شکیلہ کہہ رہی تھی کہ تُو اپنے بالوں کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ دھی رانی میں پچھلی مرتبہ شہر سے ایک شیمپو کی بوتل لائی تھی۔ مانو اُس جادو کی بوتل نے تو کمال ہی کر دیا۔ اب ہم آج تیرے لیے بھی وہ جادو کی بوتل خرید لیں گے۔ باقی اللہ مالک!"

"ماسی تُو سچ کہہ رہی ہے؟"

"ہاں میری دھی! رُک میں شکیلہ کو بلاتی ہوں۔ وہ تجھے وہ جادو کی بوتل دکھائے گی۔ نی شکیلہ...... نی کڑیے جلدی آ باہر تاجاں آئی ہے۔"

"دے دی چاچا نے تجھے اجازت۔" شکیلہ اُس سے ملتے ہی خوش دلی سے بولی۔

"ہاں...... بابا نے ہنسی خوشی اجازت ہی نہیں دی ہے بلکہ میرے لیے دو جوڑے کپڑوں کے پیسے بھی دیے ہیں۔" تاجاں نے رومال میں بندھے پیسے اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"ارے پگلی! میں نے تجھے اس لیے آواز دی تھی کہ تو ذرا جا کر وہ شیمپو کی بوتل دکھا اپنی تاجاں کو جو ہم پچھلی واری شہر سے لائے تھے۔"

ماں کے کہنے کی دیر تھی کہ شکیلہ شیمپو کی بوتل اُٹھا

کر لے آئی۔ لال ڈھکن والی اس بوتل پر بادام بنے تھے۔ اور ایک ماں بیٹی نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

''یہ کون سا شیمپو ہے ماسی!''

تاجاں نے بوتل کو ہاتھ میں پکڑ کر غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''یہ ہے لائف بوائے شیمپو۔ دھی رانی اس وقت تمہیں ہی نہیں بلکہ ہر ایک کو اسی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بال ہیں تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ نہیں۔ شکیلہ جلدی سے ثمیم بتا میں چادر اوڑھ کر آتی ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔'' اتنے میں شکیلہ کے گھر میں بجتا ریڈیو لائف بوائے شیمپو کا اشتہار سنانے لگا۔

''بالوں کے معاملے میں نوشارٹ کٹس...... نو چانس...... صرف لائف بوائے شیمپو...... آپ کے بالوں کے ہر مسئلے کا حل۔ 30 فیصد سے زیادہ بالوں کو مضبوط اور گھنا بنائے۔ اپنے ملک پروٹین اور روغنِ بادام کی طاقت کے ساتھ۔''

شکیلہ اور تاجاں لائف بوائے شیمپو کے اشتہار میں اتنا مگن تھیں کہ پتا ہی نہ چلا کب ثمیم چادر اوڑھ کر اُن کے سامنے تھی۔

''ارے کیا ہوا تم دونوں کو۔'' وہ چلائی تو دونوں جیسے ٹرانس سے باہر آئیں۔

''بالوں کے معاملے میں نوشارٹ کٹس۔''

دونوں یک زبان ہو کر بولیں۔

''اوہو شارٹ کٹ کیسائی کڑیوں! چلو دیر ہو رہی ہے صغراں بھی ہمیں اُڈیک (انتظار) رہی ہوگی۔'' اور پھر وہ تینوں شہر جانے کے لیے گھر سے نکل گئیں۔

☆......☆......☆

تاجاں شہر سے لائف بوائے شیمپو لے آئی تھی۔ کھلی سے سر دھونا بھی برقرار تھا اور سرسوں کے تیل کی چمپی بھی مگر اس کے ساتھ ساتھ جادو کی بوتل یعنی لائف بوائے شیمپو کا باقاعدہ استعمال بھی جاری تھا۔ لائف بوائے کے مسلسل استعمال نے اُس کے بالوں کو چار چاند لگا دیے تھے اور تاجاں کے چمکتے' لہراتے بالوں کی دھوم مچ گئی تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں شکیلہ اور تاجاں کے بالوں سے متاثر ہو کر لائف بوائے شیمپو استعمال کرنے لگی تھیں اور لائف بوائے شیمپو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

آج ان کے گاؤں میں لائف بوائے شیمپو والوں نے اشتہاری مہم کا آغاز کیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران تھے کہ اُن کی اس مہم سے پہلے ہی گاؤں والے لائف بوائے شیمپو کی اہمیت اور افادیت سے جانکاری رکھتے تھے۔ اتنے میں تاجاں' ثمیم اور شکیلہ بھی لائف بوائے شیمپو خریدنے اُن کے پاس آ گئیں۔

''لائف بوائے شیمپو ہی آپ کی پہلی ترجیح کیوں ہے؟'' اسٹال پر جو میڈم میٹھی تھیں انہوں نے ان تینوں سے سوال کیا۔

''کیونکہ بالوں کے معاملے میں نوشارٹ کٹس...... بالوں کی زندگی کا ضامن ہے۔ ہمارا نیو لائف بوائے شیمپو اور کچھ نہیں۔''

تاجاں اور شکیلہ یک زبان بولیں تو لائف بوائے شیمپو کی آگاہی مہم کی ٹیم بھی مسکرانے لگی۔

''لیجیے آپ کا بھروسہ اور آپ کا اعتماد...... ہماری طرف سے بطور گفٹ آپ کے لیے۔''

میڈم نے خوش ہو کر تینوں کو لائف بوائے شیمپو کی ایک ایک بوتل پکڑاتے ہوئے کہا۔ تینوں نے شکریہ کہہ کر خوشی خوشی اپنے قدم گھروں کی جانب بڑھا دیے تھے۔

سچ ہے لائف بوائے شیمپو نہ صرف شہروں بلکہ گاؤں دیہات میں بھی اپنی اہمیت و افادیت سے بالوں کے مسائل سلجھا رہا ہے۔ اپنے اعتماد اور بھروسے کا نشان ہر ایک پر ثبت کرتا جا رہا ہے

☆☆......☆☆

نئے برس میں دوشیزہ اور آپ ساتھ ساتھ

(ادارہ)

دوشیزہ کے نئے سال کے موقع پر جو سروے مرتب کیا اس سروے میں آپ کے پسندیدہ مصنفین نے دوشیزہ سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے ان عمدہ سوالات کے جوابات ہمیں ارسال کیے۔ قارئین یقیناً اس سے ضرور محظوظ ہوں گے۔

1) ایسی کوئی خوشی جو آپ کو گزرے سال میں ملی ہو اور جس کا آپ نے برسوں انتظار کیا ہو؟

2) کیا 2016ء کو پچھلے کئی برسوں سے مختلف پایا؟

3) دوستوں اور رشتے داروں نے دکھ دیے یا خوشیاں؟

4) گزرے ہوئے سال سے کوئی شکوہ اور آنے والے سال سے کوئی امید؟

5) اگر 2017ء میں آپ کو جادوئی چراغ مل جائے تو وہ کون سی 3 خواہشات ہیں جو پوری کریں گے؟

احمد سجاد بابر، لودھراں

1۔ ایمانداری سے جواب دوں تو گزرا سال نہ صرف پاکستان بلکہ میرے لیے بھی دکھوں کا سال رہا، کئی نامور شخصیات ملکِ عدم روانہ ہوئیں، لیجنڈز ایک ایک کر کے جا رہے ہیں، کئی چاند چہرے خاک تلے جا سوئے، میرے اپنے خاندان میں ایک سال میں ہی کئی پیارے مٹی تلے چھپ گئے، چند ماہ میں ایسے ایسے رشتے چلے گئے کہ گھر کا آنگن اور صحن جال نوٹنے ہو گئے، یہ سال جب بھی یاد آئے گا، انہی حوالے سے یاد آئے گا۔

2۔ گزرا سال کم و بیش 2015 جیسا ہی رہا، ہاں ایک فرق ضرور رہا کہ پاکستانی افواج نے دہشت گردوں کے خلاف جارحانہ پالیسی اپنائی، ان کی کمیں گاہوں تک ان کا پیچھا کیا، جس کی وجہ سے امن و امان کی صورتِ حال نسبتاً بہتر رہی۔ اگر اپنی ذات کی بات کروں تو تھوڑا سا مختلف یہ رہا کہ ساؤتھ کوریا میں بیس ممالک کی ایک کانفرنس میں اپنے محکمے کی طرف سے پاکستان کی بہت اچھے طریقے سے نمائندگی کی، وطنِ عزیز کا اچھا تاثر قائم کیا، اپنے ملک کے لیے اچھا سفیر بننے کی کوشش کی، آخری دن شرکاء نے اپنی نمائندگی کرنے کے لیے متفقہ طور پر مجھے چنا اور میں نے سب کی طرف سے انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کو پیغام ریکارڈ کرایا اور کلوزنگ سپیچ پیش کی۔ یقیناً یہ پاکستان کا اعزاز تھا۔

3۔ معاشرہ عجیب افراتفری کا شکار ہو گیا ہے، مادیت پرستی بڑھ چکی ہے، اخلاص کے بدلے جزیں کاٹنا، غرض کے لیے سینے سے لگا لینا اور مطلب نکل گیا ہے تو پہچانتے نہیں، کی مثال بن جانا، یہ سب

بہت عام ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے دوستوں اور رشتہ داروں کی طرف سے بھی ایسی ہی مثالیں بنتی رہیں مگر یہ بھی ہے کچھ ایسے رشتے اور دوست تو ہر کسی کی زندگی میں ہوتے ہیں، جن کی محبتیں اثاثہ ہوتی ہیں، ان کا خلوص میسر رہا۔

4۔ سال سے کیا شکوہ کرنا، سال تو لمحوں کے بدلنے، موسموں کے آنے جانے کا نام ہے، جو ہوتا ہے وہ تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے 2016 سے کوئی شکوہ نہیں، بس دعا ہے کہ آنے والا سال گزرے سال سے بہتر رہے، جو ذمہ داریاں ہیں وہ احسن طریقے سے پوری ہوں، خوشیاں نہ بھی ملیں، بڑے دکھ دور رہیں، باقی رُت کا بدلنا، دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں تو ہاتھ کی ریکھاؤں سے جھانکتی ہی رہتی ہیں۔ امید ہے کہ نیا سال کم سے کم پاکستان کے لیے ضرور اچھا ثابت ہو گا۔

5۔ بہت ہی چلبلا سا سوال ہے، اگر مجھے جادوئی چراغ مل جائے تو ایک تو میں چاہوں گا کہ مجھے فارن کا پی ایچ ڈی سکالر شپ مل جائے، یہ میری وہ خواہش ہے جو مختلف مجبوریوں کی بنا پر ٹلتی آ رہی ہے۔ انجینئرنگ میں ایم فل کیے تو کافی سال گزر گئے۔ دوسری خواہش یہ ہو گی کہ پلک جھپکے اور پاکستان ترقی میں، امن میں، فلاحی ریاست کے لحاظ سے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک جیسا ہو جائے، جہاں فٹ پاتھ پر سو جانے میں بھی ڈر نہ ہو، جہاں بھوک کا عفریت نہ ہو، جہاں ریاست ماں جیسی ہو۔ تیسری خواہش یہ ہو سکتی ہے کہ وہ تمام مسائل اور ذمہ داریاں جو میرے سر پر ہیں، وہ آنے والے سال میں حل ہو جائیں، وہ مسئلے جو میری ذات سے متعلقہ تو نہیں ہیں مگر میرے بھائی بہنوں کے ہیں تو میرے ہی ہوئے نا، اس کے علاوہ میں کوئی فلاحی منصوبہ شروع کرنا چاہتا ہوں، جو رفاہِ عامہ کے لیے ہو، اس میں بھی مجھے کامیابی ہو۔ مجھے اندازہ ہے کہ میں نے بہت خشک سے جواب دیے ہیں مگر کیا کروں جو محسوس کیا وہی لکھتا چلا گیا۔ دوشیزہ کے تمام لکھاریوں اور قارئین کو آنے والا سال بہت مبارک ہو۔

خدا کرے مری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

نفیسہ سعید۔ کراچی

سب سے پہلے میری طرف سے دوشیزہ کی پوری ٹیم کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابیوں کے ایسے کئی سال نصیب کرے آمین۔

1) یقیناً 2016ء اس حوالے سے ایک ایسا سال رہا جس میں حقیقتاً مجھے بارہ سال انتظار کے بعد ایک ایسی خوشی نصیب ہوئی جو میں آپ سب کے ساتھ شیئر کر کے اُسے مزید دوبالا کرنا چاہوں گی اور وہ ہے میری بیٹی کا میڈیکل کالج میں داخلہ' جس کا خواب میں نے اُس کے اسکول جانے کے ساتھ ہی دیکھنا شروع کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے میرے اس خواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا' جس کے لیے میں اُس کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔

2) مجھے تو سارے سال ایک جیسے ہی لگتے ہیں وہ جواب تک گزر گئے شاید آنے والا نیا سال کچھ مختلف ہو اور اسی امید کے ساتھ میں اُسے خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوں۔

3) دوست اور رشتہ دار' نام ہی دکھ اور خوشیوں کا ہے۔ جہاں اچھے لوگ اور اچھے رشتے آپ کو خوشیاں دیتے ہیں وہاں کچھ ایسے مہربان بھی ہوتے ہیں جو ہر دم آپ کو ملنے والی خوشیاں برباد کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ دکھ اُس وقت ہوتا ہے جب یہ بظاہر آپ کے ہمدرد بھی ہوتے ہیں اسی لیے جہاں کسی اپنے سے خوشی ملی وہاں غم دینے والے بھی بے شمار ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو نیک ہدایت دے اور

آنے والے نئے سال میں یہ دوسروں کو تکلیف دینے کے بجائے اپنی اصلاح کے قابل ہو سکیں۔

4) اپنی چھوٹی بہن کا جواں عمری میں بیوہ ہو جانا ایک ایسا دکھ اور شکوہ ہے جو اکثر تنہائی میں گزرے وقت سے کرتی ہوں۔ اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنے والے نئے سال میں اس کا دامن ایک بار پھر خوشیوں سے بھر دے آمین۔

1) اگر الہ دین کا چراغ مل گیا تو پہلی خواہش یقیناً یہ ہوگی کہ فلسطین آزاد ہو جائے۔

2) سریا میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم ختم ہو جائیں۔

3) پاکستان کے حکمرانوں کے دل میں جذبہ حب الوطنی پیدا ہو۔

راحت وفا راجپوت۔ لاہور

1) اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے گزرے سال میں مجھے بہت سی نعمتوں سے نوازا۔ مگر ایک خوشی جس کا مجھے انتظار تھا یہ بھی کہ میں نعت پڑھوں۔ مگر میری نہ ہمت تھی نہ حوصلہ...... مگر سال 2016ء میں اللہ پاک نے مجھے نعت پڑھنے کی سعادت سے نوازا۔ اور میرے لیے یہی گزرے سال کی یادگار خوشی ہے۔

2) 2016ء میں مجھے یہ ادارک ہوا کہ انسان جن چیزوں اور لوگوں کو اپنے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے۔ وہ اتنی ضروری نہیں ہوتیں اور یہ بھی تجربہ ہوا کہ ہم جتنے بھی پلان بنالیں اللہ سب سے بڑا planer ہے اور اللہ کے پلان بندوں کے لیے بہترین ہوتے ہیں۔ اور 2016ء اس لحاظ سے بھی مختلف رہا کہ میری کئی ادبی حلقوں میں شناخت بنی اور میں نے اخبار میں کالم لکھنا شروع کیا جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔

3) اچھے دوست اللہ کا تحفہ ہوتے ہیں۔ میرے تمام دوست بہترین ہیں پُر خلوص اور ہمدرد...... میری خوشی اور دکھ میں میرے ساتھ ساتھ رہے۔ رشتے پیار کے قلم سے لکھے گئے حرف ہوتے ہیں۔ ہم انسانوں کی نہیں رشتوں کی عزت کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ سب رشتے دار اچھے رہے اور ان کے اچھا ہونے میں تھوڑا سا کمال میرا بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ میں کسی کی ذاتیات میں دخل نہیں دیتی۔ ہر رشتے کو اس کی جگہ پر رکھا جائے تو توازن رہتا ہے۔ میرے سب سے بہترین دوست اور ہمدرد اور میری زندگی کا سب سے بہترین رشتہ میرے میاں صاحب طارق محمود ہیں۔

بقول شاعر

تجھ سے تو مراسم ہیں میرے اور طرح کے
اُس شخص سے رشتہ ہے ذرا اور طرح کا

4) گزرا ہوا سال کتنے ہی قیمتی لوگوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ عبدالستار ایدھی' امجد صابری اور جنید جمشید...... یہ وہ لوگ تھے جو پاکستان کا غرور تھے۔ شکوہ تو نہیں ہے مگر دکھ گہرا ہے اور آنے والے سال سے امید ہے کہ پاکستان اپنی مشکلات سے نکل جائے گا اور جو کرپٹ عناصر اس کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں وہ بھی کیفر کردار تک پہنچ جائیں گے' انشاء اللہ۔

5) 2017ء میں اگر مجھے جادوئی چراغ مل جائے تو میری سب سے پہلی اور شدید خواہش اللہ کا گھر دیکھنے کی ہے۔

دوسری خواہش یہ ہے کہ اپنے پیارے ملک سے لوڈ شیڈنگ اور دہشت گردی ختم کرا دوں۔

اور تیسری خواہش یہ ہے کہ میں اپنا وزن کم کرلوں۔ ہزار کوششوں کے باوجود بھی وزن کم نہ

ہوا اب تو کوئی جن ہی یہ کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

رضوانہ کوثر۔ لاہور

1) میں کس خوشی کا انتظار کرسکتی ہوں' اب تو صحت کی سلامتی کی دعا کرتی رہی جو اکثر دور دور رہی۔ مگر پھر بھی خدا کا شکر ہے۔ محبت کرنے والوں کا ساتھ رہے تو بلائیں ٹل ہی جاتی ہیں۔ الحمدللہ میں آپ سب کے سامنے ہوں اور کیا چاہیے۔

2) 2016ء میں مختلف کیا تھا' صرف کیلنڈر ہی تو بدلا ہے۔ ملکی حالات ویسے کے ویسے ہی رہے۔ بین الاقوامی مسئلے قطعاً سلجھ نہ سکے۔ وہی کشمیریوں پر بھارتیوں کی بربریت اور ظلم و ستم' وہی آئندہ الیکشن تک سب مسئلے حل ہوجانے کے دلاسے...... وہی بیوقوف عوام اور وہی ہماری خوش فہمیاں......سب کچھ جوں کا توں رہا۔

3) دوستوں نے تو ہمیشہ خوشیوں ہی سے دامن بھرا ہے۔ میرے دوست زندہ باد' رہی رشتوں کی بات تو صرف یہ ہی کہوں گی۔

کتنے دور نکل جائیں رشتے نبھاتے نبھاتے
خود کو کھو دیا اپنوں کو پاتے پاتے
لوگ کہتے ہیں ہم مسکراتے بہت ہیں
اور ہم تھک گئے درد چھپاتے چھپاتے

شکوہ گزرے سال سے نہیں اُن عناصر و عوامل سے ہے جنہوں نے گزشتہ سال میں بھی بے حسی کی انتہا کردی۔ بہرحال اللہ سے اچھی امید ہے کہ دنیا تو امید پر قائم ہے اور اللہ امید کو پورا کرنے والا ہے۔

5) میری کیا خواہش ہوگی جادوئی چراغ پاکر پہلی خواہش تو بغیر جادو کے چراغ کے پوری ہورہی ہے۔ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اور وہ بھی میرے شہر لاہور میں جو 2016ء کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

دوسری خواہش' میرے بیٹے روفی کے لیے نیا سال ایمان اور سکون کے ساتھ ساتھ روزگار لے کر آئے۔

تیسری خواہش' میرے تمام دوست صحت کی دولت سے مالا مال رہیں کہ اس سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں جان ہے تو جہان ہے۔ ورنہ سب ویران ہے۔ اچھے دوست زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔

نعمان اسحٰق۔ جلال پور پیر والا

سب سے پہلے تو آپ سب کی خدمت میں سلام! دوشیزہ قارئین مجھ سے کچھ کچھ تو واقف ہی ہوں گے۔ ارے وہی نعمان تم بھی نا، میرے پرندۂ دل اور اِک فسانہ ہے زندگی والا۔ کسی زمانے میں محفل میں چند خطوط بھی لکھے تھے۔ اور یہ شاید پہلا موقع ہے جو آپ لوگوں سے یوں گفتگو کررہا ہوں۔ یکطرفہ ہی سہی پر اسی پر گزارہ کرلیں۔ سروے کے سوالات خوب دلچسپ تھے۔ مگر میرا حصہ لینے کا ارادہ نہ تھا۔ وجہ وہی...... میں ٹھہرا صنفِ وجاہت اور ماہنامہ دوشیزہ پڑھنے والی بیشتر بہنیں ہی ہیں۔ تو میرا کیا کام...... چلو میرے قلم سے نکلے افسانے اور ناول یہاں جگہ پاتے ہیں۔ پر یوں سروے میں جواب دینا کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ مگر کاشی بھائی کی یاد دہانی اور اصرار پر میں اس بزم کا حصہ ہوں۔

1) سوال کا جواب سوچتے ہوئے ماضی کو کھنگالا تو ذہن میں یہی لفظ ابھرے۔ گھر واپسی کی خوشی...... جون 2006ء کی بات ہے میں میٹرک کے بعد آنکھوں میں خواب سجائے ملتان شہر پڑھائی کے لیے گیا تھا۔ دس سال کس طرح

گزرے پتا ہی نہیں چلا۔ پہلے ملتان میں F.S.C کے دو سال، پھر فیصل آباد میں M.B.B.S اور جاب کے آٹھ سال اور بالآخر گھر کو واپسی، نعمان اسحق سے ڈاکٹر نعمان اسحق کا سفر.... زندگی کے بیتے دس سال اور میں، یادوں کے ٹمٹماتے جگنو، زندگی پر محو سفر وقت اور میں...... اپنے چھوٹے سے شہر جلال پور جہاں میرے ماں باپ، بہن بھائی اور عزیز و اقارب بستے ہیں۔ واپسی نے مجھے بے پایاں خوشی دی۔

2) بے شک 2016ء کو مختلف پایا۔ فیصل آباد میں اسٹوڈنٹ لائف اور بعد میں اپنے بدر ہاسپٹل میں ہاؤس جاب اور جاب ایک طرح سے یہی اسٹوڈنٹ لائف ہی تھی۔ یہاں آ کر زندگی کے سکے کے دوسرے رخ کا لطف بھی محسوس کیا۔ اور زندگی کی حقیقتوں سے بھی روشناس ہوئے۔ خدا کی قدرت کہ آتے ہی گورنمنٹ جاب میری جھولی میں آ گری۔ جہاں جاب کی سیری پرکشش تھی وہاں معاشرے میں پھیلے رشوت، سیاسی بھرتیوں اور اقرباء پروری کے تعفن نے دل کھول کر بدمزہ کیا۔ اور رب سے یہی دعائیں کیں کہ اے اللہ ہر اس گناہ سے دور رکھنا جو آج تک نہیں کیے۔

3) رشتہ داروں نے خوشیاں زیادہ دیں کہ رشتے عبارت ہی محبت سے ہوتے ہیں۔ باقی چھوٹی موٹی کوتاہی تو ہر جگہ ہوتی ہے۔ ابو نے گھر کی تعمیر پر توجہ دی اور عملی زندگی کے اونچ نیچ سکھائے۔ امی نے اپنے ہاتھ کے بنے زیادہ نمک والے (پہلے بھی یہی کھانے کھاتا تھا۔ فشارِ خون کی بیماری کا روگ نہ لگ جائے۔ اس لیے سالن میں زیادہ نمک کی شکایت مجھے عام ہے۔) کھانے کھلائے۔ بھائی فرحان نے فیملی میں ایک اور رحمت کا اضافہ کیا۔ عمران بھائی اپنی شادی پلان کرتے رہے۔ فرحانہ اسپیشلائزیشن کے لیے دوبارہ سے فیصل آباد کوچ کر گئی۔ (میں اور فرحانہ اسکول، کالج اور میڈیکل کالج میں ہم جماعت تھے اور یہ بات میری زندگی کی بنیادی خوبصورتی ہے) رضوان نے بھی پڑھائی میں مناسب کارکردگی دکھائی۔ چھوٹی بہنوں نے یقیناً مجھ سے کچھ سیکھا ہوگا اور امید کرتا ہوں کہ زندگی میں کچھ بن کر ہی دکھائیں گی۔ انشاء اللہ اب اس مختصر مختصر سے آپ خود اندازہ لگائیں کہ دکھ تو کہیں پاس پھٹکا ہی نہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بس عمران تم سے گزارش ہے کہ تھوڑے طنز کم کرو، کہیں کسی دن غصے میں تم میرے ہاتھوں قتل ہی نہ ہو جاؤ۔ اور دوست پیارے تحسین! تم نے مجھے ایک لاکھ ایک ہزار ایک سو ایک دکھ دیے ہیں۔ اگر تم اس کی تلافی چاہتے ہو تو مجھے کچھ پیسے ہی اُدھار دے دو پھر واپس کر دوں گا۔

4) گزرے ہوئے سال سے شکوہ یہی ہے کہ وہ ہم سے کتنے اچھے لوگ دور لے گیا۔ سفال گر کے خالق عمر سعید، ایک کپ چائے والی مینا تاج، دل دل پاکستان والے جنید جمشید، اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے۔ اور جنت میں حضور کا پڑوسی بنائے آمین۔ آنے والے سال سے یہی امید ہے کہ میرا اسی میڈیکل یونیورسٹی میں اسپیلائزیشن کے لیے داخلہ ہو جائے جہاں میری خواہش ہے۔

5) جادوئی چراغ سے خواہش پوری کرنے کی ہرگز تمنا نہیں جو خواہش ہیں ان کے لیے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوں۔

نمبر 1۔ ملک گیر شہرت والا رائٹر بنوں۔ سچی کہانیاں میں شائع ہونے والا میرا ناول بادبان

دوام کو پہنچے۔
نمبر 2۔ اسپیلائزیشن کی وہ ساری ڈگریاں پالوں جن کی مجھے خواہش ہے۔
نمبر 3۔ آنے والا سال بھی گزشتہ سالوں کی طرح پریشانیوں اور تکلیف سے دور گزرے آمین۔

ماہ وش طالب ۔۔ لاہور

1) ویسے تو ہر پل اللہ کا احسان ہے۔ وہ آزماتا ہے تو دہرا نوازتا ہے مگر مصنفہ بننا (فی الحال میں خود کو مصنفہ نہیں سمجھتی' یہ بہت بڑا اعزاز ہے) مگر اس فہرست میں شامل ہونا اور اپنی گریجویشن (بی ایس آنرز) مکمل کرنا' بہت خوشی کا باعث تھا میرے لیے' جن کا برسوں سے تو نہیں مگر بہرحال انتظار تھا۔
2) بالکل' گزشتہ سال کئی لحاظ سے مختلف تھا' غم اور خوشیاں ساتھ ساتھ رہے' بہت سے ناقابل یقین واقعات پیش آئے۔
3) دوستوں کے ساتھ اچھی رہی' اور اب بھی خوشگوار تعلقات قائم ہیں' یہ سدا بحال رہیں' آمین۔
4) خواہشیں ادھوری رہ ہی جاتی ہیں' مگر نئے سال کے لیے اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھے ہر میدان میں کامیاب کرے' اور اس کے لیے نیک نیتی سے محنت کرنے کی توفیق دے' آمین۔
5) یہ تو وہی بات ہے
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ثمینہ طاہر بٹ: لاہور۔۔

1) جناب خوشی کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے بعض اوقات کوئی چھوٹا سا واقعہ، کوئی چھوٹی سی بات ہمیں ایسی بے پایاں خوشی سے نواز جاتی ہے کہ ہمیں خود سمجھ نہیں آتا کہ ہم اس خوشی کا اظہار کیسے کریں، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی بات بھی ہمیں وہ خوشی نہیں دے پاتی جو ہم توقع کررہے ہوتے ہیں۔ 2016 کے شروع میں ہی یعنی جنوری میں ہی مجھے سب سے پہلی خوشی پرل پبلی کیشنز کی طرف سے ہی ملی، مجھے پہلی بار سچی کہانیاں کے ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا، اور میں اس کی خوشی آج بھی اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں۔ دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے علاوہ دوسرے کئی جریدوں میں میری تحریریں شائع ہوئیں، آن لائن ڈائجسٹوں اور بلاگز میں بھی میری تحریریں متواتر شائع ہورہی ہیں اور یہ میرے لیے جہاں بہت بڑے اعزاز کی بات ہے، وہیں بہت خوشی کا امر بھی ہے۔ الحمدللہ کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا اور آپ سب کا بھی بہت شکریہ کہ آپ سب نے مجھے اتنی محبت، اتنی عزت دی جس کی وجہ سے مجھ میں اور زیادہ لکھنے کی لگن پیدا ہوئی جزاک اللہ خیر۔
2) کہنے کو تو 2016 بھی پچھلے سالوں جیسا ہی تھا، کدھر آیا، کہاں گیا کچھ پتا ہی نہیں چلا، مگر یہ سال جاتے جاتے بہت سے ایسے دکھ ہماری جھولی میں ڈال گیا جن کا مداوا شاید کبھی ہو ہی نہیں سکے گا۔ امجد صابری مرحوم، عبدالستار ایدھی مرحوم، اور اب جاتے جاتے جنید جمشید مرحوم بھی ہمیں دائمی جدائی دے گئے۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ اس کے ساتھ ساتھ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والے حادثوں، اور فسادات نے جیسے انسانیت کے چہرے کو داغدار کر کے رکھ دیا ہو۔ کشمیر میں کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے ہندوؤں کے ظلم وستم، شام، سریا اور فلسطین کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تھے، اور بے گناہ مسلمانوں کے خون سے کھیلی جانے والی ہولی، ترکی میں ہونے والی ناکام بغاوت، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ یہ ایسے واقعات ہیں کہ انسان اور انسانیت پر سے بھروسہ ہی اٹھنے لگا ہے۔ اللہ ہم سب پر اپنا رحم فرمائے اور آنے والے سال کو اہلِ اسلام کے ساتھ ساتھ اہلِ دنیا کے لیے امن اور سکون سے بھرا ہوا لائے آمین ثم آمین۔

دوستوں اور رشتے داروں نے دکھ دیئے یا خوشیاں؟

3) دکھ اور خوشیاں سب ساتھ ساتھ ہی چلتے ہیں۔ جو قسمت میں لکھا ہو، وہ مل کر ہی رہتا ہے۔ اس میں نہ تو دوستوں کا ہاتھ ہوتا ہے اور نہ ہی رشتے داروں کا۔ جو خوشی ہمارے مقدر میں لکھی جا چکی اسے ہم سے کوئی چھین نہیں سکتا اور جو دکھ ہمارے نصیب میں رقم کر دیا جاتا ہے، اس سے ہمیں کوئی بچا نہیں سکتا، سوائے اللہ پاک کی ذات کے۔ 2016 نے مجھے دو بڑے دکھ، دو بڑی تکالیف دیں۔ پہلا دکھ، 30 اگست کو ملا۔ اس دن صبح ہی صبح میری خوشدامن صاحبہ قضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔ یہ ہماری پوری فیملی کے لیے بہت بڑا غم، بہت بڑا دکھ ہے۔ مرحومہ نے اپنی پوری زندگی بہت دبنگ انداز میں گذاری، اور پچھلے ایک سال سے وہ ایسی بیمار ہوئیں کہ بس بستر کی ہی ہو کر رہ گئیں اور اس گذرے سال کا دوسرا بڑا دھچکا، دوسری بڑی تکلیف..... نومبر کے آغاز میں میری امی کی میجر سرجری ہوئی۔ آپریشن تو ٹھیک ہو گیا، مگر اس کے بعد امی کے ٹانکے اور زخم خراب ہو گیا۔ نومبر کا پورا مہینہ ہمیں ہاسپٹل میں ہی گذارنا پڑا کہ ڈاکٹرز چھٹی ہی نہیں دے رہے تھے۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں بمشکل ہاسپٹل نے ہماری جان چھوڑی اور ہماری جان میں جان آئی الحمدللہ، امی اب کافی بہتر ہیں۔ اور اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہماری امی کا سایہ ہم پر سلامت رہے۔ انہیں تندرستی اور صحت والی لمبی عمر عطا فرمائے آمین ثم آمین اور رہی بات دوستوں یا رشتہ داروں کی باتوں، یا رویوں سے پہنچنے والی تکلیف کی، تو ہم ایسی باتوں کو نہ تو دل میں جگہ دیتے ہیں اور نہ ہی ان پر اپنے دل برے کرتے ہیں کیونکہ میاں صاحب کہتے ہیں کہ جن کا کوئی ہوتا ہے تو انہیں ہی کوئی بات کرتا ہے ناں، ورنہ دوسروں کو کیا پڑی ہے کہ باتیں بناتا پھرے۔

4) نہیں، گلہ کوئی نہیں اللہ کا بڑا کرم ہے۔ جی، وہ جس حال میں رکھے اس کی مرضی اور پھر وقت سے گلہ کیسا؟ اس کا کام تو گذرنا ہے، اور وہ اپنے وقت پر گذرتا ہی چلا جاتا ہے اور نئے آنے والے سال سے تو بہت سی امیدیں ہیں۔ اللہ اپنا کرم ہم سب پر بنائے رکھے۔

5) جادوئی چراغ اور اس دور میں۔ مزے کا تصور ہے۔ ٹھیک ہے، سوچتے ہیں۔ مجھے اگر ایسا کوئی چراغ مل جائے تو میں سب سے پہلے اپنے ملک کے حالات بدلنا چاہوں گی۔ ملک میں تعلیم کا معیار بلند اور غربت کی شرح دور کرنے کی کوشش کروں گی۔ (اور آپس کی بات ہے اس کے لیے سارے سیاست دانوں کو میں اس چراغ کے ذریعے اپنے ملک سے اتنی دور بھجوا دوں گی کہ وہ چاہ کر بھی یہاں واپس نہ آسکیں۔ حالانکہ ایسا ممکن ہی نہیں) اور دوسری خواہش یہ کہ میں اپنے بچوں کے مستقبل کو روشن اور تابناک دیکھنا چاہتی ہوں، ہر ماں کی یہی خواہش ہوتی ہے اور میری دوسری خواہش یہی ہوگی میں اپنے بچوں کے لیے کچھ اچھا کرسکوں۔ تیسری خواہش اپنی

کتاب کی اشاعت، اور جوائنٹ ٹیمنٹ کے ساتھ جو پراجیکٹ کررہی ہوں، اس کی باعزت تکمیل، فوری طور پر کروالوں اور اپنے ساتھ ساتھ ان سارے رائیٹرز کے لیے بھی کچھ کرسکوں جو کام تو کرنا چاہتے ہیں اور بچی نیت، سچے دل سے کرنا چاہتے ہیں، مگر انہیں مواقع نہیں مل پاتے (خاص طور سے یہ پروڈکشن ہاؤسز والے جس طرح نئے رائٹرز کو خون کے آنسو رلاتے ہیں، اس ناانصافی کو دور کرنے کے لیے تو واقعی کسی جادوئی چراغ کی ہی ضرورت ہے) اور اس دعا کے ساتھ میں آپ سب کو اللہ حافظ کہتی ہوں۔

فریدہ فری۔ لاہور

1) برسوں انتظار تو نہیں کیا مگر کچھ سال انتظار کے بعد ہمارا پہلا مجموعہ پانچواں موسم شائع ہوا اور اُسے کاروانِ ادب آزاد نقیبی کی طرف سے ہماری کتاب پر پہلا ایوارڈ ملا۔

2) ہمیں 2016ء تک دوشیزہ ویسا ہی پایا جو ہم چاہتے تھے اور بے حد بہتری ہوئی۔ اتنی اچھی رائٹرز لکھنے کے حوالے سے ملیں جیسے زمر نعیم، صدف آصف، سنبل اور خولہ وغیرہ بہترین لکھ رہی ہیں۔ فصیحہ آصف بھی بہت اچھی لکھاری ہیں۔

3) ہمیں دوشیزہ سے گزرے ہوئے سال سے اور آنے والے سال سے کوئی شکوہ نہیں۔ دوشیزہ اپنی مثال آپ ہے۔

4) دوستوں سے ہمیں خوشیاں ہی ملی ہیں دکھ نہیں اندر کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔ عقیلہ حق، خولہ عرفان اور سنبل کی تحریروں کی دیوانی ہوں۔

5) اگر مجھے جادوئی چراغ مل جائے تو سب سے پہلے خواہش کروں گی حج کروں یا عمرے پر جاؤں۔

دوسری خواہش میری شاعری میں زیادہ نکھار آئے اور میں نامور شاعرہ بن جاؤں ار جو بیمار ہوں صحت یاب ہوں۔

تیسری خواہش' ہمارا پاکستان خوشیوں کا گہوارہ بن جائے کوئی غریب اور بے بس نہ ہو، ہم آپس میں پیار اور محبت سے رہیں۔

حنا بشریٰ۔ لاہور

1) گزرے سال میں اپنے ایک ناولٹ 'منزلِ عشق' کی اشاعت پر بہت خوش تھی۔ جس کی کامیابی پر مجھے تین ہزار روپے کا انعام ملا۔ ایسی کامیابی کا میں نے برسوں انتظار کیا۔

2) 2016ء کا سال کامیابیوں کے اعتبار سے پچھلے کئی سالوں سے بہتر رہا۔

3) دوستوں اور رشتے داروں کی طرف سے خوشیاں ملیں۔

4) گزرے ہوئے سال سے تو کوئی شکوہ نہیں مگر خود سے بہت سی شکایات رہیں۔ اپنی بہت سی عادتوں کو بدلنے کی خواہش' بہت سے ادھورے کام مکمل کرنے کی خواہش' بہت بہترین سال گزارنے کی خواہش مگر میں گزرے ہوئے سال کو بہت اچھے انداز میں گزارنا چاہتی تھی۔ اور آنے والے سال میں دعا گو ہوں کہ پچھلے سال والی غلطیاں اور کوتاہیاں نہ ہوں آمین۔

5) جادوئی چراغ مل جائے تو مندرجہ ذیل تین خواہشات پوری کروں گی۔

1) دہشت گردی کے ناسور کا پوری دنیا سے خاتمہ.....

2) لوڈشیڈنگ اور سوئی گیس کے بحران کا خاتمہ.....

3) دوشیزہ میں ایک کامیاب رائٹر بن جاؤں.....

☆☆.....☆☆

ناول
رفعت سراج

دامِ دل

قسط 24

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی' رفعت سراج کے جادوگر قلم سے
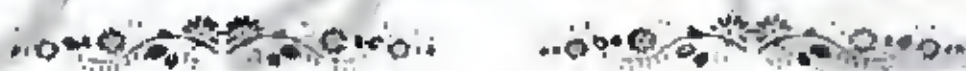
ثمر بھی گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا تھا۔ اُس کا لرزتا ہوا وجود ظاہر کررہا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔
ندا چند ثانیے ایک ٹک ثمر کی طرف دیکھتی رہی۔ جب روتے روتے ثمر کی سسکیوں کی آواز ماحول میں گونجنے

لگی تو وہ جیسے تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور ثمر کے برابر میں جا کر بیٹھ گئی۔
"ثمر دیکھیں ہمت سے کام لیں...... امی جان بہت زیادہ بیمار ہوگئی تھیں اور کئی بار سنبھلنے کے بعد اُن کی طبیعت دوبارہ بگڑ گئی تھی اسی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی گڑ بڑ ہے آپ نے تو مجھے کچھ بھی نہیں بتایا لیکن مجھے بس...... سمجھ آ رہی تھی کہ امی جان شاید...... Survive نا کر سکیں۔"
ندا اپنی فطرت کے بموجب تسلی دے رہی تھی اور جو کچھ دل میں تھا اُس کو من وعن ظاہر بھی کر رہی تھی۔
اگر کوئی ندا کی فطرت سے واقف نا ہوتا تو اِن تعزیاتی کلمات پر مشتعل ہو جاتا مگر ثمر اُس کی فطرت سے بہت اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ اُسے ندا کے یہ الفاظ سن کر محسوس نہیں ہوا......
اُسے تو بلکہ یہی لگا جیسے وہ یہی کچھ کہہ سکتی تھی اور اُس نے کہہ دیا۔
ثمر کی طرف سے جب کوئی ردِ عمل ظاہر نا ہوا تو ندا نے اُس کو دونوں شانوں سے تھام لیا اور اپنا سر اُس کے شانے سے نکا کر بہت اپنائیت سے بولی۔
"ثمر پلیز ہمت سے کام لیجیے اور اٹھیے نا ہاسپٹل نہیں جانا امی کی آخری رسومات ادا نہیں کرنا افشاں بھی آپ کا انتظار کر رہی ہوگی۔"
اِس مرتبہ ندا نے بہت معقول بات کہی تھی ثمر کو بھی ایکدم خیال آیا کہ ہاں واقعی ہاسپٹل میں شدت سے اُس کا انتظار ہو رہا ہوگا۔ اُس نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے ندا کی طرف دیکھا اور بڑی آہستگی سے بولا۔
"تھینک یو مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا...... امی جان چلی گئیں لیکن ابھی تک اُن کے بہت سارے حقوق باقی ہیں......"
یہ کہہ کر وہ اپنے دونوں گھٹنوں پر زور ڈال کر یوں کھڑا ہوا جیسے چند لمحوں میں اُس کی توانائی ختم ہو کر رہ گئی ہو۔
ندا بھی اُس کے ساتھ کھڑی ہوگئی اور اُس نے بڑی محبت سے ثمر کے رخساروں پر پھسل کر آنے والے آنسوؤں کو انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا اور سابقہ انداز میں بڑی اپنائیت سے بولی۔
"ثمر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی اب تو امی جان اِس دنیا میں نہیں ہیں...... مجھے یہ دکھ تو ہمیشہ رہے گا کہ میں اپنی ساس سے بہو کی حیثیت سے ایک بار بھی نہیں ملی......" ندا کے لہجے میں محسوس ہونے والا ایک دکھ تھا۔ جس پر ثمر نے ندا کی طرف بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں چلا گیا تھا۔
ندا اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی دونوں چند ثانیے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر ثمر نے اپنی آنسوؤں بھری آنکھوں کا رخ موڑ لیا......
"نہیں......" اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اور ندا اپنی جگہ پر ششدر کھڑی اُس کی شکل تکنے لگی تھی۔
"نہیں......" ندا نے اُلجھن بھری نظروں سے ثمر کی طرف دیکھا۔
"اب 'نہیں' کا کیا مطلب ہے...... اب امی جان نا مجھے دیکھ سکتی ہیں نا مجھ سے بات کر سکتی ہیں۔ دنیا کے سارے معاملات اُن کے لیے ختم ہو چکے تو پھر کیا میں اُن کی آخری رسومات میں شرکت نہیں کر سکتی۔ آپ کو وجہ بتانا ہوگی ورنہ میں آپ کے ساتھ چلوں گی چاہے آپ کتنا بھی منع کریں۔" ندا کے انداز میں اپنائیت بھرا اصرار تھا زور دباؤ تھا۔
ثمر چند ثانیے سر جھکائے پھر کچھ سوچنے لگا۔ ندا اُس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہی تھی اُس کے چہرے سے

کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ ثمر نے اب اسی طرح نگاہیں جھکائے گہری سانس کھینچی اور ندا کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"ندا I Am Sorry ابھی میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ پہلے تو آپ اس وجہ سے ساتھ نہیں لے جاتے تھے کہ امی جان کو اچانک اطلاع ملے گی تو اُن کی طبیعت خراب ہو جائے گی لیکن اب کیا ہے؟"

"ندا میری بات بہت غور سے سنو۔" ثمر اس وقت بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا ثمر سو فیصد بدلا ہوا لگ رہا تھا۔

"جی جی بولیے میں سن رہی ہوں۔" بے چین نظروں سے ثمر کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

"دیکھو ندا میں نے ابھی تک یہ شادی Delcear نہیں کی ہے۔ امی کی Death کا سن کر سبھی جاننے والے گھر آئیں گے اور اس سچویشن میں، میں تمہارا تعارف نہیں کرا سکتا۔"

"جہاں تم نے اتنا انتظار کیا ہے بس چند دن اور...... دو تین دن لوگ تعزیت کے لیے گھر آتے رہیں گے بس پھر اس کے بعد میں تمہیں گھر لے جاؤں گا۔ پہلے تو یہ فکر لاحق ہو رہی تھی کہ میں تمہیں کہاں رکھوں کوئی گھر کرائے پر لوں یا گیسٹ ہاؤس میں چلا جاؤں۔ لیکن امی جان نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا۔" بولتے بولتے ثمر کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ پھر نئے سرے سے آنسو اترے اُس کے گالوں پر بہنے لگے۔

ثمر کا لب و لہجہ بدلا ہوا انداز اور غمزدہ چہرے نے ندا کو لب بستہ کر دیا تھا وہ بڑی بے بسی سے ثمر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

ثمر اگر سختی سے بات کرتا...... بیزاری سے بات کرتا یا فیصلہ کن انداز میں بات کر کے وہاں سے جانے کی کوشش کرتا تو وہ ضرور مزاحمت کرتی کچھ تو ضد کرتی لیکن اس وقت جو ثمر اُس کے سامنے کھڑا ہوا تھا وہ کچھ دیر پہلے کے ثمر سے بالکل مختلف تھا۔

لہجے میں اپنائیت بھی تھی سوز بھی تھا اور جیسے درخواست بھی تھی۔ ندا لاجواب سی کھڑی تھی ثمر اپنی چیزیں سمیٹنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر علی عثمان ہاسپٹل جانے کے لیے تیار ہو کر چمن کو خدا حافظ کہنے لان کی طرف آئے تھے۔

دونوں بچیاں ابھی تک ٹینا کے ساتھ گڑیوں کے کھیل میں مصروف تھیں۔ ڈاکٹر علی اپنی دھن میں چمن کی طرف بڑھے تھے۔ مگر یہ دیکھ کر اُن کو ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔ چمن دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی اُس نے بچیوں کی طرف سے رخ پھیرا ہوا تھا۔

ڈاکٹر علی چند ثانیے کے لیے تو گویا اپنی جگہ پتھر کی طرح گڑ کر رہ گئے پھر انہوں نے بے اختیاری کیفیت میں بچیوں کی طرف دیکھا۔ تینوں بچیاں اپنے کھیل میں مگن بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

اُن کے دائیں جانب خوشیاں برس رہی تھیں اور بائیں جانب آنسو برس رہے تھے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے خود کو سنبھالا چند قدم آگے بڑھ کر چمن کو آہستہ سے آواز دی۔

"مسز ثمر کیا ہوا؟ کوئی فون کال آئی ہے۔"

اب اُن کا ذہن تیز تیز کام کرنے لگا۔ اُن کو یاد آیا کہ چمن کی ساس بڑی سیریس حالت میں ہاسپٹل میں تھیں۔ اُن کا ذہن چمن کی ساس ہی طرف گیا تھا۔ چمن ڈاکٹر علی عثمان کی آواز سن کر پہلے چونکی پھر سنبھل کر جلدی جلدی ہتھیلیوں سے آنسو پونچھنے لگی۔

ڈاکٹر علی عثمان اب اُس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور غور سے دیکھنے لگے۔ چمن نے بھیگی پلکیں اُٹھا کر ڈاکٹر علی عثمان کی طرف دیکھا۔ کھنکار کر آنسوؤں کے پھندے حلق سے کاٹنے کی کوشش کی۔ بڑی آہستگی سے گویا ہوئی۔

''وہ امی جان ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں.....'' بولتے بولتے چمن کی آواز بھرا گئی۔ اس وقت اُس کے تاثرات دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خدانخواستہ اُس کی سگی ماں داغ مفارقت دے گئی ہو۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون، موت سے کس کو رستگاری ہے آج تم کل ہماری باری ہے۔'' ڈاکٹر علی عثمان نے تعزیتی کلمات کے ساتھ ساتھ صبر کی تاکید کے ضمن میں شعر بھی پڑھ دیا تھا جیسے یاد دلانے کی شعوری طور پر کوشش کی تھی کہ آج اُس کی ساس اُسے چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ اُن کے پیچھے جو زندہ لوگ ہیں وہ بھی اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

''بچیوں کو کھیلنے دیں میں آپ کو وہاں ڈراپ کر دیتا ہوں میرا مطلب ہے آپ کے اپنے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں بعد میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔ بچیاں ڈرائیور کے ساتھ گھر چلی جائیں گی اب آپ اُن کی بالکل فکر نہ کیجیے یوں سمجھیں اب اس وقت یہ میری ذمہ داری ہے آپئے۔'' ڈاکٹر علی عثمان نے گھڑی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ خیال آیا تو اجتناب کر گئے یہ سوچ کر کہ کہیں چمن یہ نا سمجھ لے کہ وہ لیٹ ہو رہے ہیں اور تکلف کرنے لگے۔

چمن نے جلدی جلدی دوپٹے سے اپنی آنکھیں اچھی طرح صاف کیں خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی اور اُٹھ کر بچیوں کے پاس چلی آئی۔

مہوش اور مہ پارہ نے ایک سرسری سی نگاہ چمن کی طرف کی اور بڑے مان سے ضد کرنے کے انداز میں گویا ہوئیں۔

خالہ ابھی ہم گھر نہیں جائیں گے..... ابھی تو ہم نے ڈول کو ٹھیک سے دلہن بھی نہیں بنایا یہ دیکھیں مہ پارہ نے ایک بڑی سی ڈول جو برائیڈل ڈریس پہن چکی تھی اور جیولری پہنانے کا عمل جاری تھا۔ چمن کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''اوکے اوکے..... بیٹا میں آپ کو یہی کہنے آئی ہوں کہ مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے آپ کھیلیں پھر ڈاکٹر انکل کا ڈرائیور آ جائے گا اور وہ آپ کو گھر چھوڑ آئے گا۔''

بچیاں کھیل میں اتنی زیادہ مصروف تھیں کہ اُن کا ذہن اس وقت یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیں گی تو خالہ گھر کیسے آئیں گی۔ دونوں نے جان چھڑانے والے انداز میں جلدی سے گردن ہلا دی۔

''اوکے خالہ آپ جائیں۔'' چمن نے ایک نظر دونوں بچیوں کی طرف دیکھا پھر دونوں کے گالوں پر باری باری بوسہ دیا۔

نینا بہت غور سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ایکدم مچل کر بولی اور ساتھ ساتھ اپنے گال کی طرف اشارہ کیا۔

''خالہ آپ مجھے بھی Kiss کریں میں بھی تو چھوٹی بچی ہوں۔'' چمن نے بے ساختہ انداز میں علی کی طرف دیکھا اور زبردستی کے انداز میں مسکرا کر نینا کی طرف بڑھی اور ایک بوسہ نینا کے گال پر دیا..... بوسہ دے کر وہ ہٹنے لگی مگر نینا نے اُس کو دونوں بازوؤں کے گھیرے میں بھینچ لیا اور اپنی طرف سے جوابی بوسہ چمن کے گال پر ثبت کر دیا۔

''تھینک یو......'' چمن نے پیار سے اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کار پورچ کی طرف بڑھ گئی۔ ڈاکٹر علی تیز قدم ہو کر اُس کے پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔

☆......☆......☆

''عطیہ بیگم چمن کو فون کر کے پتہ کریں کافی دیر ہوگئی ہے۔'' مشکور احمد اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے قدرے فکرمندی سے مخاطب ہوئے۔

''آپ فکر نا کریں بچیاں کئی دنوں سے ٹینا کے پاس جانے کو کہہ رہی تھیں اب وہ اتنی آسانی سے وہاں سے نہیں اُٹھیں گی۔ چمن اگر اُٹھ بھی رہی ہوگی تو ضد کر رہی ہوں گی۔''

عطیہ بیگم اپنی دو بیٹیوں کی پرورش کرنے کے بعد اب دو نواسیوں کو بھی سنبھال رہی تھیں۔ اُن کے انداز سے زندگی کے خوبصورت تجربات جھلک رہے تھے۔

''پھر بھی کئی گھنٹے ہو گئے ہیں۔ فون کر کے پتہ تو کرو کیا ایکٹیویٹی چل رہی ہیں۔'' مشکور احمد شام کے گہرے ہوتے سائے دیکھ کر بڑے متفکر انداز میں گویا ہوئے۔

''بچیاں اکیلی تو نہیں ہیں مشکور صاحب، چمن ساتھ ہے اُن کے۔ پہلے بھی چمن اُن کو ساتھ لے جاتی رہی ہے۔ واپسی میں کئی مرتبہ دیر بھی ہوئی ہے کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ میں ذرا دو تین چپاتیاں ڈال لوں پھر آپ مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا کھا لیجیے۔ آدھے گھنٹے بعد پھر آپ کو کئی دوائیاں لینا ہوتی ہیں۔''

ابھی بھی بہت مصروف انداز میں کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھی ہی تھیں کہ اُن کے موبائل پر رنگ ہوئی وہ جاتے جاتے پلٹ آئیں۔

''لو...... میرا خیال ہے چمن نے خود ہی فون کر دیا اور اُس نے یہی بتانے کے لیے فون کیا ہوگا کہ دیر ہو جائے گی۔'' عطیہ بیگم خود کلامی کے انداز میں بولتی ہوئی فون اٹھا کر دیکھنے لگیں۔

اُن کا اندازہ سو فیصد درست تھا چمن کی کال آ رہی تھی انہوں نے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی اور فون کال سے لگا لیا۔

''ہاں بیٹا خیریت ہے بچیاں تنگ تو نہیں کر رہیں۔ میرا خیال ہے بچیاں تو ٹینا کے ساتھ لگی ہوئی ہوں گی تم بور ہو رہی ہوگی......'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں مخاطب ہوئیں۔ چمن کا سلام لیے بغیر شروع ہو گئی تھیں۔ دوسری طرف سے چمن کی آواز ابھری آواز میں جو دھیما پن اور کمزوری تھی وہ عطیہ بیگم نے فوراً ہی محسوس کر لی اور سن کر قدرے متفکر ہوئیں۔ چمن کہہ رہی تھی۔

''امی جان آپ کو ایک افسوسناک خبر سنانے کے لیے فون کر رہی ہوں۔'' عطیہ بیگم کا کلیجہ دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر علی عثمان کے گھر گئی ہوئی تھی ذہن فوراً ٹینا کی طرف گیا۔

''ہاں ہاں بیٹا بولو میں سن رہی ہوں......''

پریشانی کی کیفیت میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ مشکور احمد بھی اٹھتے اٹھتے بیٹھ کر اُن کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اُن کو بھی تجسس لاحق ہو رہا تھا کہ چمن نے ایسی کیا بات کی ہے کہ عطیہ بیگم کے چہرے کے تاثرات اور لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔

''وہ امی جان ثمر کی امی ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی ہیں۔'' بولتے بولتے چمن کی آواز بھرا گئی کچھ بھی سہی پانچ سال کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں اُن کی محبتیں اتنی سمیٹی تھیں اور اُس کے بعد

اُن کے ناروا سلوک پر اُن کو منانے اور تعلقات اچھے رکھنے کی کوششیں بھی بہت کی تھیں۔ تعلق نفرت کا ہو یا محبت کا قریب ترین ہو یا عام سا بہر حال ایک اثر تو چھوڑتا ہے اور پھر جس ستمگر کو ساری دنیا بھلا کر ٹوٹ کر چاہا تھا وہ اُس کی ماں تھیں اور انسان جس سے محبت کرتا ہے اُس سے وابستہ ہر شے اُسے بہت عزیز ہو جاتی ہے۔ اُس نے بانو آپا کی ستم ظریفیاں نامہربانیاں دونوں ہاتھوں سے یوں پیار سے سمیٹی تھیں جیسے کوئی تبرکات سمیٹتا ہے۔

عطیہ بیگم نے بڑے دلسوز انداز میں پہلے 'انا للہ' پڑھا پھر چمن سے بولیں۔

''ٹھیک ہے بیٹا...... جو اللہ کی مرضی جتنی دیر کی چابی ہے گڑیا تو اتنی دیر ہی ناچے گی۔ وہ چلی گئیں ہم بھی پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ ہمت سے کام لو میں سوچ رہی ہوں کہ بانو آپا نے ضرور کوئی ایسی نیکی کی تھی جس پر اللہ نے انہیں توبہ کی مہلت دی انہوں نے جاتے جاتے تمہیں پیار دیا۔ تم بھی اب دل کی گہرائیوں سے اُن کو معاف کر دینا اور اُن کے لیے بلند درجات کی دعا کرتی رہنا...... تم بچیوں کو لے کر گھر آ جاؤ تو پھر میں اور تمہارے ابو تمہارے ساتھ ہی ثمر کی طرف جائیں گے۔''

عطیہ بیگم چمن سے مخاطب تھیں اور مشکور احمد نے دل ہی دل میں 'انا للہ و انا الیہ راجعون' پڑھ لیا تھا اور اب بالکل خاموش بیٹھے فون بند ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

''امی جان میں ڈاکٹر علی کے ساتھ گھر جانے کے لیے نکل گئی ہوں آپ ابو جان کے ساتھ آ جائیں۔'' چمن نے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

''لیکن بچیاں کیا تمہارے ساتھ ہیں۔'' عطیہ بیگم کو فوراً نواسیوں کی فکر ہوئی۔

''نہیں امی وہ نینا کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ ڈاکٹر علی کہہ رہے ہیں وہ ڈرائیور سے ڈراپ کروا دیں گے۔''

''لیکن بیٹا وہ کہاں ڈراپ کروائیں گے۔ تم جا رہی ہو اور میں اور تمہارے ابو گھر سے نکل رہے ہیں۔ تو بچیوں کا بتاؤ مجھے کہ ثمر کی طرف بلا رہی ہو یا ہم اُن کا انتظار کریں۔''

عطیہ بیگم کو معصوم بچیوں کی فکر ستانے لگی وقتی طور پر مرحومہ آپا بانو کی طرف سے ذہن ہٹ گیا تھا۔

''جب آپ اور ابو اُس طرف آ جائیں تو بچیوں کو بھی وہیں بلوائیں گے امی جان آپ اُن کی فکر نا کریں وہ اس وقت بہت مصروف اور خوش ہیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا تمہارے ابو مغرب کی نماز پڑھ لیں تو پھر ہم نکلتے ہیں۔''

''خدا حافظ امی جان۔''

چمن نے مزید کوئی بات کیے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ عطیہ بیگم نے فون بند کیا ٹیبل پر رکھا اور مشکور احمد کی طرف دیکھنے لگیں۔

جانے والے چلے گئے اب مشکور صاحب کچھ رسم و دنیا نبھانا ہے۔ وہ بہت دلگرفتہ سے انداز میں گویا ہوئی تھیں کیونکہ بانو آپا کے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔

چمن نے ایک جملہ بول کر انہیں نئے سرے سے ایک اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ چمن کہہ رہی تھی کہ وہ گھر جا رہی ہے۔

وہ آج بھی ثمر کے گھر کو صرف گھر کہتی ہے۔ کہیں دل کی خاطر دل کڑا کر کے یا انسانیت کے نام پر جو کچھ کیا تھا بس وہ بھی بانو آپا کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچا۔ میں اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر گھر آ جاؤں گی وہ دل ہی دل میں

تہیہ کرتے ہوئے کچن کی طرف چلیں اُن کو اب گھر سے باہر جانے کے خیال سے اپنی ذمہ داریاں یاد آنے لگیں۔ مشکور احمد کا کھانا کھانا بھی بہت ضروری تھا کیونکہ انہیں رات کو کھانے کے بعد دوا لینا ہوتی ہے...... سوچوں میں گھری ہوئی وہ کچن میں داخل ہوگئیں۔

مشکور احمد اپنے زانو پر ہاتھ رکھے ہوئے یوں بیٹھے تھے۔ جیسے گہرے مراقبے میں ہوں۔

☆......☆......☆

ندا ثمر کے جانے کے بعد بڑی دل شکستہ سی ابھی اُسی جگہ بیٹھی تھی جہاں سے ثمر اُس سے بات کر کے رخصت ہوا تھا۔ یوں جیسے اُس کے جسم کی ساری توانائیاں منجمد ہوگئی ہوں اور اٹھنا محال ہو۔ ابھی تک تو وہ یہ بات تسلیم کرتی رہی تھی کہ ثمر کی ماں بیمار ہے اُن کو کوئی Shocking News نہیں پہنچنا چاہیے۔

سب جگہ مریض کا اِسی طرح سے احساس کیا جاتا ہے خیال رکھا جاتا ہے وہ بھی اِن تمام حقائق کو دل سے تسلیم کر کے ابھی تک خاموش تھی لیکن آج جبکہ بانو آپا دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ آج بھی ثمر اُس کو بیوی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے لے جانے سے کترا رہا تھا۔

شاید اُسے خود سے احساس ہوتا بھی نہیں اگر نرگس اور ارسلان نے اُس سے مختلف اوقات میں اپنے شکوک وشبہات کا اظہار نا کیا ہوتا۔ وہ دونوں جب اپنی اپنی جگہ جب بھی بات کرتے تھے یا شکوک کا اظہار کرتے تھے تو وہ مسلسل اُن شکوک وشبہات کو مسترد کرتی رہتی تھی۔ لیکن دونوں کی کوئی نا کوئی بات اِس طرح سے دل میں گڑ جاتی تھی کہ کافی دیر تک اُس کے ذہن میں بازگشت رہتی تھی۔

''مراقبہ ہو رہا ہے۔'' ارسلان کی آواز نے گہرا سکوت توڑ دیا۔ ندا چونکی پھر بڑی مہارت سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''نہیں بس وہ ایک Sad News آئی تو اُس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''Sad News......'' ارسلان جانے کہاں سے آن وارد ہوا تھا اب اُس کے سر پر کھڑا ہوا بڑی حیرت اور تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

''جی......'' ندا نے جیسے بڑی مشکل سے حلق سے آواز نکالی۔

''وہ......ارسلان بھائی ثمر کی Mother کی Death ہوگئی ہے۔''

''اوہ......Very Sad......'' ارسلان نے امریکی انداز میں بجائے اس کے کہ انا للہ پڑھتا......

''تمہیں کس نے بتایا تھا؟''

''فون آیا تھا۔''

''Obviously فون ہی آیا ہوگا۔''

اُس نے خود سے سوال کیا اور خود ہی جواب بھی دے دیا۔

غالباً اُسے یہ گمان تھا کہ ثمر آ کر جا چکا ہے۔ وہ خود بھی ثمر کا طرز تکلف اور چبھتا ہوا انداز محسوس کر کے گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ وہ یہی اندازہ کر رہا تھا کہ ثمر کے جانے کے بعد اُس کی والدہ کی ڈیتھ کی اطلاع ندا کو فون پر مل ہوگی یا تو ثمر نے ندا کو فون کیا ہوگا یا اُس کی بہن نے......

''ثمر کے پاس فون آیا تھا وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی Deadbody لینے کے لیے ہاسپٹل چلے گئے ہیں۔'' ندا

نے اُسی طرح دھیمے لہجے اور آہستہ آواز میں جواب دیا۔
''تو تم ساتھ کیوں نہیں گئیں......'' ارسلان نے چونک کر ندا کی طرف دیکھا۔ ندا نظر نا اٹھا سکی یوں جیسے جواب دینا محال ہو وہ جانتی تھی کہ ارسلان نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔ اور اب وہ مزید کیا کہہ سکتا ہے۔ جبکہ اتنا واضح منظر نامہ تھا اور ندا نے ہی بتایا تھا کہ ثمر اُسے اپنی ماں کے سامنے ابھی تک لے کر کیوں نہیں گیا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر علی عثمان بہت خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے گھر سے نکلے ہوئے دس منٹ ہو رہے تھے لیکن اس دوران ڈاکٹر علی اور چمن کے درمیان کسی قسم کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ چمن نے بیٹھنے کے بعد ڈاکٹر علی کو ایڈریس سمجھا دیا تھا اور اُس کے بعد گہری خاموشی اختیار کرلی تھی جیسے کرنے کے لیے کوئی بات نہ ہو۔
چمن کا ذہن مسلسل بانو آپا کی ذات میں گم تھا اُس کو بانو آپا کے حوالے سے بہت کچھ یاد آ رہا تھا جس میں سے زیادہ تر بہت تکلیف دہ تھا مگر وہ تکلیف دہ یادوں کو سوچتے سوچتے فوراً ہی وہ سوچنے لگتی تھی کہ اب تو وہ دنیا سے جاچکی ہیں۔
دنیا کے سارے حساب کتاب اُن کے رخصت ہوتے ہی ختم ہو گئے کوشش کروں گی کہ جو کچھ ہوا سب کچھ بھلا دوں اور مجھے بھلا دینا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کر چکی تھیں اور اس کے بعد تو کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ اُن تکلیف دہ باتوں کو غلطی سے بھی یاد کیا جائے۔ وہ بڑی دانائی اور فراست کے ساتھ اپنی ذات کا تجزیہ کرنے لگی۔
معاً اُسے خیال آیا کہ کیا ثمر بانو آپا کی Deadbody گھر لے کر پہنچ چکا ہوگا۔ ظاہری بات ہے افشاں نے تو Death Declear ہوتے ہی اُس کو فون کیا ہوگا اور ڈیتھ اسپتال میں ہوئی ہے اُسے افشاں سے پتہ کرنا چاہیے کہ اُسے گھر جانا چاہیے یا پھر ہاسپٹل اِس خیال کے آتے ہی تمام یادیں دھواں بن کر ذہن سے اڑ گئیں اور ایک عجلت سی لاحق ہوگئی اُس نے جلدی سے اپنا بیگ کھول کر اپنا سیل فون نکالا اور افشاں کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔
ڈاکٹر علی نے کن اکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا مگر کچھ بولے بغیر دوبارہ نظریں ونڈ اسکرین پر جما دیں چمن نے افشاں کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد... سیل فون کان سے لگایا اور کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی افشاں شاید سیل فون اِدھر اُدھر رکھ کر کہیں اور تھی کیونکہ رنگ ہوتی رہی مگر کال اٹینڈ نہ ہوئی۔ اُس نے بڑی بے چینی سے دوبارہ ری ڈائل کیا رنگ پاس ہو رہی تھی اور وہ ہمہ تن گوش ہو کر کال ریسیو ہونے کا انتظار کر رہی تھی اس سے پیشتر کہ وہ مایوس ہوتی اور تیسری بار ڈائل کرنے کا سوچتی کال ریسیو ہوگئی افشاں کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز ابھری۔
''جی بھابی......!''
ایک برچھی سی تھی جو دل میں اترتی چلی گئی لفظ بھابی اب بہت تنگ کرتا تھا۔
''افشاں وہ میں نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا ہے کہ تم لوگ گھر کتنے بجے تک پہنچو گے کیونکہ میں تو گھر جانے کے لیے نکلی تھی پھر خیال آیا شاید تم لوگ ابھی گھر نا پہنچے ہو ہاسپٹل میں ہو...... اندازاً کتنی دیر میں گھر پہنچ جاؤ گے۔'' چمن نے بغیر کسی تمہید کے مدعا بیان کیا۔
''بھابی ہم بس تقریباً 10' 15 منٹ میں نکل جائیں گے۔ تقریباً سب کام Complete ہو گیا ہے۔ ایمبولینس بھی ریڈی ہے میں اور ثمر بھائی Deadbody لے کر پہنچ جائیں گے۔ آپ کہاں تک پہنچی ہیں۔

افشاں اُسی طرح بھیگے ہوئے لہجے میں سوال کر رہی تھی۔
''مجھے گھر تک پہنچنے میں 10 منٹ لگ جائیں گے......''
''ہاں تو ٹھیک ہے شاید اُس وقت تک ہم بھی وہاں پہنچ جائیں لیکن ٹریفک زیادہ ہوا تو زیادہ ٹائم لگ جائے گا۔ تو پھر آپ ایسا کریں کہ آپ ہاسپٹل ہی آجائیں تاکہ آپ کو انتظار نا کرنا پڑے اور ہم ساتھ ہی گھر جائیں۔''
''میرے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہے۔''
افشاں نے بروقت ایک صحیح راستہ اُسے سجھا دیا۔
افشاں ٹھیک ہی کہہ رہی ہے ڈاکٹر علی کو وہاں پر Engage رکھنا مناسب نہیں ہے وہ پہلے ہی تاخیر کا شکار ہو چکے ہیں۔ اُن کو ہاسپٹل پہنچنا ہے اُن کی مہربانی کے انہوں نے مجھے یہ سہولت دی۔ اُس نے سوچا شاید افشاں اُبن کی طرف سے کچھ سننے کی منتظر تھی لیکن چمن نے صرف خدا حافظ کہا اور فون بند کر کے ڈاکٹر علی عثمان کی طرف دیکھنے لگی۔
''وہ ڈاکٹر صاحب...... ایسا ہے کہ مجھے اب گھر نہیں جانا ہاسپٹل جانا ہے کیونکہ افشاں کہہ رہی تھی کہ شاید دیر ہو جائے تو میرے پاس تو چابی نہیں ہے کہ گھر چلی جاؤں۔''
ڈاکٹر علی نے چمن کی بات سن کر بڑی حیرت سے چمن کی طرف دیکھا تھا۔
''آپ کے پاس اپنے گھر کی چابی نہیں ہے یا ای کے ہاں بھول کر آگئی ہیں۔'' چمن کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ جو بات ابھی تک چھپی ہوئی ہے کہیں اُس کی غلطی کی وجہ سے آشکار نا ہو جائے۔
''جی وہ شاید میں جلدی میں بھول گئی ہوں وہ تو مجھے ابھی خیال آیا کہ چابی تو ہے نہیں تو میں کب تک وہاں انتظار کروں' افشاں کہہ رہی ہے کہ آج کل ٹریفک کا بھی یہی حال ہے راستے میں دیر بھی ہو سکتی ہے وہ کہہ رہی ہے کہ ہاسپٹل ہی آجاؤں۔''
''اوکے اوکے' ٹھیک ہے جیسے آپ کہہ رہی ہیں میں ہاسپٹل ہی آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔''
چمن نے اُن کو ہاسپٹل کا نام بتایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ باہر آنکھوں کے سامنے تعمیرات بھی تھیں اور اُن عمارتوں میں اَن گنت لوگ بھی بسے ہوئے ہیں جتنے لوگ عمارتوں کے اندر ہوں گے اتنے ہی اِن عمارتوں کے باہر نظر آرہے تھے۔ اتنی ہی گاڑیوں میں اتنے ہی پیدل...... کتنے لوگ ہیں...... انسانوں کا ایک جم غفیر...... ایک بندہ چلا جاتا ہے تو دنیا میں بے شمار لوگوں کو اُس کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن کوئی ایسا ہوتا ہے جو اِس کے جانے کو اپنا نقصانِ عظیم سمجھ رہا ہوتا ہے اُس کی آنکھوں کے سامنے ثمر کا چہرہ تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ثمر ہاسپٹل پہنچتے ہی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا ابھی Documentation کی کارروائی سے فارغ ہو کر افشاں کی طرف آیا تھا جو رو رو کر نڈھال ہو رہی تھی۔ اُس کے سسرال والے بھی ہاسپٹل پہنچ چکے تھے۔ ساس اُس کو گلے سے لگائے صبر کی تاکید و تلقین کر رہی تھیں۔
ثمر افشاں کے پاس آیا تو سب اُسے دیکھ کر اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ افشاں بھائی کو دیکھ کر پھر سے چیخیں مار مار کر رونے لگی۔
''بھائی امی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ امی جان کو جانے کی کتنی جلدی تھی۔'' وہ بین کر رہی تھی۔ ثمر نے دلاسہ

دینے کے انداز میں اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تو بے اختیاری کیفیت میں بھائی سے لپٹ گئی۔

''بھائی میں بالکل اکیلی ہوگئی۔''

یہ کہہ کر وہ بری طرح ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ ثمر نے اُس کا سر سینے سے لگالیا اور بہت غمزدہ لہجے میں گویا ہوا۔

''افشاں اس طرح نہیں کرتے امی جان چلی گئیں تو ہم کون سا قیامت تک کے لیے بیٹھے ہیں۔ ہم بھی بس اُن کے پیچھے پیچھے ہی جانے والے ہیں۔ ماں سے بہت زیادہ پیار ہے تو پھر اُن کو تحفے بھیجو اُن کو قرآن کی تلاوت کر کے اُس کا ثواب پہنچاؤ اِس طرح رونے سے اُن کو بہت تکلیف ہو رہی ہو گی۔ وہ تو پہلے ہی بہت تکلیفیں جھیل کر اِس دنیا سے گئی ہیں۔''

''ہاں بیٹا بھائی ٹھیک کہہ رہا ہے اِس طرح رونے سے مرنے والے کی روح کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور تمہاری ماں تو تکلیفیں اٹھاتے ہوئے اِس دنیا سے گئی ہے۔ اُن کی مغفرت کے لیے دعا کرو اُن کے بلند درجات کے لیے دعا کرو اور ماتم کرنا تو ویسے بھی ہمارے مذہب میں منع ہے۔''

افشاں کی ساس بھی افشاں کے قریب آ کر اُس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے سمجھانے لگی۔

افشاں کے آنسوؤں کو ایک دم بریک لگ گیا۔ وہ تو یہ سوچ کر ہی خوفزدہ ہوگئی کہ وہ اپنی ماں کو تکلیف پہنچا رہی ہے جو کہ اُس پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

''چلو شاباش یہاں بیٹھو...... بھائی کو ابھی بہت کام کرنے ہیں۔'' پھر افشاں کی نند یعنی اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئیں جو بڑی خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

''سعدیہ بیٹا بھائی کو پانی پلاؤ۔'' پھر ثمر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''ثمر بیٹا ماں کی تدفین میں جلدی کرنا مرنے والے کو جلد سے جلد اُس کی آرام گاہ میں پہنچانا چاہیے۔ جاؤ بیٹا جا کر دیکھو کتنی دیر ہے۔'' انہوں نے ایک طرح سے افشاں کے سامنے سے ثمر کو ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

افشاں کی نند نے اپنے بیگ میں سے پانی کی بوتل نکالی ڈھکن کھولا اور افشاں کے قریب آ کے اصرار کر کے اُس کے ہاتھ میں تھمانے لگی۔

''بھابی لیں پانی پئیں......اور روئیں مت......'' افشاں نے پانی کی بوتل اپنی نند کے ہاتھ سے لی اور دو تین گھونٹ بھر کے واپس کر دی اور دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

ثمر اور اُس کی ساس کے سمجھانے سے اُس پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا اور ایسے موقعوں پر ہی انسان کو احساس ہوتا ہے کہ رشتے کتنے قیمتی اور اہم ہوتے ہیں۔ دنیا انسان کو بے نیاز اور خود غرض بنا دیتی ہے لیکن آفت کی طرح ٹوٹ کر پڑنے والے غم غمگساروں کو پاس دیکھنا چاہتے ہیں آنسو بہانے کے لیے دامن تلاش کرتے غم سے نڈھال وجود سر ٹکانے کے لیے کسی اپنے کا کاندھا تلاش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر علی عثمان کی کار ہاسپٹل کے وسیع پارکنگ میں پہنچی تو انہوں نے چمن کی طرف دیکھا اُن کے انداز سے نظر سے لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی خاص بات چمن سے کرنا چاہتے ہیں۔ چمن اب کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کار کا دروازہ کھولنے کے لیے پر تول رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کے ہزبینڈ سے تعزیت کرنا چاہیے۔'' ڈاکٹر علی عثمان کا جملہ سن کر چمن اس پر بری طرح سے چونکی جیسے اُس نے کوئی بہت ہولناک قسم کی خبر سنی ہو۔ اپنے چونکنے کے انداز پر پھر خود ہی شرمندہ

ہوگئی۔مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے گویا ہوئی۔

''وہ میرا خیال ہے کہ بہت مصروف ہوں گے۔کیونکہ ابھی Deadbody ہاسپٹل میں ہی ہے اور وہ شاید Availaible نا ہوں آپ Al Ready لیٹ ہو چکے ہیں۔'' چمن نے بڑی ذہانت کے ساتھ معاملے کو نا لنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر علی نے چمن کی بات سن کر چند لمحے سوچا پھر بڑی آہستگی سے گویا ہوئے

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... آپ گھر پہنچیں تو Kindly مجھے ایک فون کال کر کے بتا دیجیے گا کہ تدفین کا ٹائم کیا ہے اُسی حساب سے پہنچ جاؤں گا۔''

چمن یہ سن کر بری طرح سٹپٹا گئی وہ ثمر کے گھر آنے کے لیے کہہ رہے تھے کیونکہ وہ گھر اب چند گھنٹے کی دنیا داری کی حد تک ہی اُس کا گھر تھا اُس کے بعد تو شاید اُس نے پلٹ کر اُس گھر کی طرف نہیں دیکھنا تھا۔ڈاکٹر علی عثمان جنازے میں شریک ہوں گے لامحالہ ثمر سے تعزیت بھی کریں گے اور ثمر کا تعارف ڈاکٹر علی سے نہیں ہے۔تعارف کرانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر آن پڑے گی اور وہ یہ ذمہ داری نبھانے کی پوزیشن میں تو بالکل بھی نہیں ہے۔وہ ذہنی خلفشار کا شکار ہونے لگی۔

''آپ کیا سوچ رہی ہیں؟''

ڈاکٹر علی نے قدرے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔

''جی کچھ بھی نہیں ویسے ہی ذہن بار بار اُسی جان کی طرف چلا جاتا ہے۔آپ کو تکلیف ہوگی ہاسپٹل بھی Manage کرنا ہوگا......تو بس آپ نے مجھ سے تعزیت کر لی سمجھیں کہ تعزیت کا حق ادا کر دیا۔'' چمن آپ بات بنانے کی کوشش میں آئیں بائیں شائیں ہونے لگی۔

''ارے نہیں آپ کے تعلق کے حوالے سے اُن پیاری پیاری بچیوں کے حوالے سے ایک انسانیت اور اخلاق کا رشتہ تو آپ سے بن چکا ہے اور جب رشتے بن جاتے ہیں تو اُن رشتوں کو نبھانے کی ذمہ داریاں بھی خود بخود عائد ہو جاتی ہیں وہ بڑی متانت اور سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

''جی ٹھیک ہے......گھر پہنچ کر دیکھتی ہوں۔'' چمن جو کچھ بھی کہہ رہی تھی اُس سے صرف ایک ہی تاثر ابھر رہا تھا جیسے وہ پورا زور صرف کر کے ڈاکٹر علی عثمان کو ثمر کے گھر آنے سے روکنا چاہتی ہو۔

لیکن ڈاکٹر علی عثمان اتنی گہرائیوں میں جا کر اُس کے خیالات نہیں پڑھ سکتے تھے وہ چمن کی بات سن کر مطمئن ہو گئے۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کہتی ہیں۔'' چمن نے یہ سنتے ہی بڑی عجلت کے انداز میں دروازہ کھولا اور خدا حافظ کہنے کے لیے قدرے جھکی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب آپ کا وقت بہت قیمتی تھا لیکن آپ نے میرے لیے نکالا۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں۔'' ڈاکٹر علی عثمان نے تکلفاً کہا اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا اور مسکرا کر گویا ہوئے۔

''یہ میرا اخلاقی فرض تھا میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا، خدا حافظ۔'' چمن آہستگی سے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی سے فاصلے پر ہو گئی۔

ڈاکٹر علی عثمان نے بھی گاڑی کو اسپیڈ دینے سے پہلے اپنا ہاتھ لہرایا تھا۔
ڈاکٹر علی عثمان کی گاڑی مین گیٹ کی طرف روانہ ہوگئی تو اُس نے جیسے کھل کر سانس لیا اور چند سیکنڈ آنکھیں بند کر کے کھول دیں اور اُس طرف چل پڑی کہ جہاں پر گمان تھا کہ افشاں وہاں ملے گی۔
لیکن پلٹتے ہی اُسے زبردست جھٹکا لگا تھا۔ ثمر چند قدم کے فاصلے پر کھڑا بہت حیرت اور تعجب سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو چمن کو کچھ سمجھ ہی نا آئی سامنے وہ ستم ظرف کھڑا تھا جس سے جذباتی رشتے ختم ہو چکے تھے لیکن قانونی رشتے ابھی قائم تھے۔
وہ تو اُس کے دیکھنے کے انداز سے اتنی زیادہ بدحواس ہوئی کہ یہ بھی بھول گئی کہ رسمِ دنیا کے مطابق اُس کے قریب جا کر تعزیت کرے۔
اُس کی بدحواسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ثمر نے اُس کی طرف دیکھنے کے بعد ڈاکٹر علی عثمان کی جاتی ہوئی کار کی طرف بھی گردن موڑ کر دیکھا تھا۔
جس کا مطلب یہ تھا کہ ثمر نے چمن کو ڈاکٹر علی عثمان کی کار سے اترتا ہوا اور پھر اترنے کے بعد باتیں کرتا ہوا دیکھا ہے۔ وہ گاڑی کی طرف کیوں دیکھتا کیونکہ وہاں تو ایک کے بعد ایک گاڑی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔
دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور اپنی اپنی جگہ پتھر کی طرح ایستادہ تھے۔ ثمر کو تو چمن سے بات کرنے کے لیے نا کسی بہانے کی ضرورت تھی اور نا ہی کوئی بات کرنا تھی۔
چمن کے ہاسپٹل آنے کی واحد وجہ اُس کی مرحومہ ساس تھیں اور مرحومہ کا اکلوتا وارث اُس کے سامنے تھا جس کے ساتھ تعزیت کرنا رسمِ دنیا ہی نہیں اخلاقی فرض بھی تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور تھوک نگلتی آگے بڑھی۔
ثمر اپنی جگہ پر اُسی طرح کھڑا تھا چمن آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اُس کے بالکل مقابل جا کر کھڑی ہوگئی۔
ثمر نے بڑی اجنبی نگاہوں سے چمن کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو میرے سامنے آ کر کیوں کھڑی ہوگئی ہو مجھے تو تمہاری شکل سے بھی نفرت ہے۔
''وہ امی جان چلی گئیں، بہت افسوس ہوا۔'' چمن کے حلق سے بہ مشکل آواز نکلی تھی۔ ثمر نے چمن کی بات سن کر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ رخ پھیر کر مین گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ چمن کو کچھ مزید کہنے کا حوصلہ نا ہوا۔ اُس نے صرف چند ثانیے رُک کر ثمر کی طرف سے کسی جوابی کارروائی کا انتظار کیا۔ اور ثمر کی طرف سے مکمل خاموشی پا کر سر جھکا کر ہاسپٹل کے Waiting Lounge کی طرف بڑھ گئی۔
اُس کے جانے کے بعد ثمر نے پھر کھوئی کھوئی گم صم نظروں سے مین گیٹ کی طرف دیکھا تھا جس طرف ڈاکٹر علی عثمان کی گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

اے دیوار و کچھ تو بولو
جھوٹی چپ کے بندھن کھولو
شاید کوئی قلزم نکلے
صحراؤں کی جیب ٹٹولو

ان کا وعدہ صبح کا تارا
یہ چنگاری من میں چھپولو
اس شب کی مجروح سحر تک
جلتے رہنا دل کے پھپولو
رات کا پنچھی کہتا جائے
دن چڑھ آیا آنکھیں کھولو
پھول کھلیں برسات میں جیسے
آج ذرا ہنس ہنس کر رو لو

ایک عالم تحیر تھا...... ہر خیال ابھرتے ہی ٹھٹک جاتا تھا...... وہ معنی پہنانے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جاتی تھی۔

نہ دکھ کا یقین تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔
نہ کسی خوش گمانی کی ڈھارس تھی کہ قوتِ عمل بیدار ہوتی۔
جاگتی آنکھوں کے ساتھ سکتے کی کیفیت تھی۔

☆......☆......☆

''بات سنو تمہاری اُس سے Proper شادی ہوئی ہے ناں۔''

ارسلان اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا ٹہلتے ٹہلتے اچانک اُس نے ندا کی طرف دیکھا تھا جو بڑے آف موڈ میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

ندا نے ایک غصے بھری نگاہ ارسلان پر ڈالی تھی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا؟ وہ ویسے ہی یہاں آتے جاتے ہیں۔ آپ کو شک ہے کیا نکاح نامہ دیکھ لیں رکھا ہوا ہے میرے پاس۔''

ندا جیسے پھٹ پڑی تھی۔

''Thanks God نکاح نامہ ہے تمہارے پاس اب میری بات ذرا غور سے سنو۔'' ارسلان اُس کے قریب آ کر رک گیا اور پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

''بولیں سن رہی ہوں۔'' ندا نے اسی طرح عقل کھرے انداز میں کہا۔

''اب تم ایسا کرو کہ تم اپنے پرس میں یا ہینڈ بیگ میں یہ نکاح نامہ ڈالو اور فوراً روانہ ہو جاؤ۔''

''ہائیں......'' ندا نے آنکھیں پھاڑ کر ارسلان کی طرف دیکھا۔

''کہاں روانہ ہو جاؤں۔''

''ارے بھئی اپنے گھر تم اُس کی بیوی ہو تمہیں ڈر کیا ہے جا کر پکڑو اُسے اور یہی موقع ہے بتا دو دنیا کو کہ تم اُس کی بیوی ہو کب تک بے وقوف بنائے گا وہ تمہیں......'' ارسلان جیسے اب پھٹ پڑا تھا۔

ندا ہکا بکا ہو کر ٹکر ٹکر اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اِس طرح کیا دیکھ رہی ہو میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ابھی تک تو وہ یہ بہانہ بناتا رہا کہ اُس کی ماں بیمار

ہے اُسے اچانک خبر ملے گی تو Shock لگنے گا یہ ہو جائے گا اور وہ ہو جائے گا...... اب ماں دنیا سے جا چکی ہے تو اب کیوں تمہیں دنیا کے سامنے نہیں لا رہا...... مجھے یہ شخص Odd Feel ہو رہا ہے۔ دیکھو اگر تم میری بات نہیں مانو گی تو پچھتاؤ گی ابھی تو میں یہاں ہوں اور میرے سامنے تم بہت کچھ کر سکتی ہو تمہاری Back پر کھڑا ہوں میرے جانے کے بعد یہ شخص تمہاری اتنی ہی بھی پرواہ نہیں کرے گا۔ تم چلی جاؤ چاہے تھوڑی دیر کے لیے جاؤ مگر ایک مرتبہ اُس کے گھر پہنچ جاؤ اور جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھو سین کیا ہے...... میں گارنٹی سے کہتا ہوں تمہیں اُس کے گھر اُس کی پہلی بیوی ملے گی جا کر اسے Red Handed پکڑو اُس نے تماشہ بنایا ہوا ہے ہمارا...... کیا سمجھتا ہے...... کتنا...... چالاک اور مکار ہے یہ شخص...... ایک لڑکی کو مسلسل بے وقوف بنا رہا ہے...... وہ جو Criminal لوگ ہوتے ہیں نا ندا وہ اِسی طرح اکیلی لڑکیوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں بلکہ ایسی لڑکیوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔''

ثمر کی بہت خوفناک تصویر پیش کی جا رہی تھی۔ ندا جو اب تک ثمر کا دفاع کرتی چلی آ رہی تھی اب ارسلان کی بات بہت سنجیدگی سے لے رہی تھی کیونکہ ارسلان کی یہ دلیل اُس کے دل کو لگی تھی۔ پہلے تو ماں کا بہانہ چل رہا تھا اب جبکہ ماں دنیا سے رخصت ہو چکی ہے تو اب کیوں وہ اُسے لوگوں کے سامنے نہیں لا رہا......

جبکہ اُس نے شادی کرنے سے پہلے اور شادی کرنے کے بعد بھی یہی بتایا تھا کہ وہ ساری احتیاط ماں کی وجہ سے کر رہا ہے کیونکہ وہ بیمار ہیں۔

''دیکھو میرا کچھ پتہ نہیں میں کتنے دن پاکستان میں ہوں لیکن میں اب اِس طرح سے واپس نہیں جاؤں گا۔ جب تک کہ یہ معاملہ کلیئر نا ہو جائے۔ اگر یہ شخص تمہارے ساتھ Sincere ہے تو ثابت ہونا چاہیے۔ اگر یہ تمہارے ساتھ فراڈ کر رہا ہے تو پھر میں اِس سے دو دو ہاتھ کر کے ہی یہاں سے جاؤں گا...... اس نے تمہاری ہی نہیں ہمارے پورے خاندان کی انسلٹ کی ہے۔ بس تم فوراً چلی جاؤ اور جو میں نے کہا ہے نا نکاح نامہ اپنے پرس میں رکھ لو تا کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کرے تو یہ نکاح نامہ سب کے سامنے پھینک دینا یہ چیٹر اور دھوکے باز کو پکڑنے کا اِس سے بہتر موقع کبھی نہیں آئے گا میری بات غور سے سن لو ندا......''

ارسلان ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہا تھا۔

اور اِس وقت ارسلان کی ایک ایک بات دل کو لگ رہی تھی کیونکہ وہ ثمر سے بری طرح بدگمان ہو چکی تھی لیکن مجھے تو اُن کے گھر کا ایڈریس بھی معلوم نہیں...... ندا اب پریشانی کی کیفیت میں جیسے خود کلامی کرنے لگی۔

''یہ کون سا مسئلہ ہے اُس کے آفس کا نمبر تو تمہارے پاس ہو گا نا آخر تم وہاں کام کرتی رہی ہو تمہارے پاس ہونا چاہیے۔''

''جی آفس کے تو سارے نمبر میرے پاس ہیں۔''

ندا نے سوچتے ہوئے جواب دیا اور آفس میں بہت سارے لوگ تمہیں جانتے بھی ہوں گے تمہارے وہاں کولیگ بھی ہوں گے تم اپنے کسی کولیگ کو فون کر کے اُس کے گھر کا ایڈریس پوچھ لو کوئی مسئلہ نہیں بتا دو کہ بھئی تعزیت کے لیے جانا چاہتی ہو جس سے پوچھو گی بتا دے گا۔''

ارسلان کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا جبکہ ندا کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اُسے تو اِس وقت ارسلان نجات دہندہ کوئی فرشتہ نظر آ رہا تھا جو اُسے عقل کی باتیں سمجھا رہا تھا۔

''میں Cab کے لیے فون کررہا ہوں تم اتنی دیر میں اپنے کسی کولیگ سے وہاں کا ایڈریس لے لو۔'' ارسلان نے اپنا قیمتی سیل فون جیب سے نکالتے ہوئے ندا سے کہا۔

ندا نے ہامی بھرنے کے انداز میں اپنا سر ہلایا اور اپنا سیل فون اٹھانے چل پڑی۔

''ارسلان بھائی ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔''

اس وقت وہ ارسلان کی ہر بات سے اتفاق کررہی تھی۔

☆......☆......☆

افشاں چمن سے لپٹ کر بہت بری طرح روئی تھی چمن کو سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا۔

''بھابی میرا تو کوئی بھی نہیں رہا امی جان چلی گئیں۔ بھابی اب میرا کیا بنے گا۔''

چمن اُس کو تسلیاں بھی دے رہی تھی اور صبر کی تاکید بھی کررہی تھی مگر افشاں بار بار جیسے ریت کی طرح بکھر جاتی تھی۔

''دیکھو افشاں ہمیشہ کے لیے تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں آتا جو چلے جاتے ہیں پیچھے رہ جانے والوں کو آخر کار صبر کرنا پڑتا ہے تم خود کو سنبھالو تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تمہارا اپنا گھر ہے وہ تو تم خود ہی دیکھو گی نا......''

وہ افشاں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت ہمدردی اور دلسوزی سے سمجھانے کی کوشش کررہی تھی حالانکہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب بڑے سے بڑا دانشور بھی غمزدہ کو نا بہلا سکتا ہے نا سمجھا سکتا ہے اور دکھی دل کو وقت کے ساتھ ہی صبر آتا ہے۔

''افشاں اب تم ایسا کرو کہ تم آنٹی کو لے کر گھر چلی جاؤ۔ وہاں جاکر کچھ انتظامات کرو لوگ پہنچنا شروع ہوجائیں گے۔ اُن کے بیٹھنے کا، پانی وغیرہ کا انتظام کرنا ہوگا...... یہاں تھوڑی دیر لگ جائے گی میں امی جان کو لے کر آتا ہوں......''

ثمر جانے کس وقت آ کھڑا ہوا تھا۔ افشاں اور چمن دونوں کو پتہ ہی نہیں چلا تھا وہ تو جب آ کر گویا ہوا تو چمن ایکدم محتاط ہوکر اپنی جگہ بیٹھ گئی اور افشاں کے سر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا۔

شاباش ہمت سے کام لو اور بس جلدی سے گھر پہنچو میں کچھ دیر میں نکلتا ہوں۔'' ثمر نے آگے بڑھ کر افشاں کے سر پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے اُس کا حوصلہ بڑھا کر اُسے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی ہمت دی تھی۔

افشاں آنکھیں پونچھتی ہوئی بڑے نڈھال انداز میں کھڑی ہوگئی اور چمن کی طرف دیکھا...... آیئے بھابی پھر اپنی ساس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''امی جان چلیے گھر چلتے ہیں......'' افشاں کی ساس اور نند کھڑی ہوکر ثمر کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ٹھیک ہے بیٹا تمہاری بات بھی صحیح ہے آخر تھوڑی دیر بعد لوگ گھر پہنچنا شروع ہوجائیں گے وہاں انتظامات ہونے چاہیے تم نے اس وقت بڑی سمجھداری کی بات کی...... ہم تو اس رونے دھونے میں اس وقت جیسے سب کچھ بھول بیٹھے تھے۔ افشاں کی ساس نے آگے بڑھ کر ثمر کا کندھا دبا کر بہت محبت اور ہمدردی کے انداز میں کہا تھا۔

وہ تینوں اپنی جگہ سے کھڑی ہوچکی تھیں مگر چمن ابھی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

''آیئے بھابی......'' افشاں نے پلٹ کر چمن کی طرف دیکھ کر پھر کہا۔ افشاں کے منہ سے لفظ بھابی سن کر ثمر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ چاروں طرف سے شعلوں میں گھر گیا ہو۔

''یہ افشاں انجانے میں مجھے کس قدر روحانی اذیت دے رہی ہے اب امی جان نہیں رہیں تو پھر یہ گلے میں کیوں گھنٹی باندھے ہوئے ہے کیوں نہیں کہہ دیتی اسے کہ یہ اپنے گھر واپس چلی جائے اس کا یہاں رُکنے کا یا افشاں کے ساتھ نظر آنے کا جواز کیا ہے کیوں بیٹھی ہوئی ہے یہ...... کہیں یہ کسی خوش فہمی میں تو مبتلا نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ امی جان کی تدفین کے بعد فوری طور پر اس کی خوش فہمیاں ختم کرنا پڑیں گی۔ اور جو اُسے ہاسپٹل چھوڑ کر گیا ہے وہ کون ہے یہ بھی تو پتہ چلنا چاہیے۔''

ثمر کی آنکھوں کے سامنے ڈاکٹر نبی عثمان کی کار تھی جس میں سے اس نے چمن کو اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ سابقہ قربتیں سوالیہ نشان بن کر سامنے کھڑی ہوگئی تھیں اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی اس منظر کو اپنے ذہن سے محو نہیں کر پا رہا تھا۔

چمن افشاں کے دوبارہ مخاطب کرنے کے بعد اُٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اُس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ثمر اُس کی طرف دیکھنا نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا کہ وہ اُس کی موجودگی کو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اُس کے سر پر کوئی چٹان لا کر رکھ دی گئی ہو۔ یہ کون تھا جسے آج اُس نے پہلی بار دیکھا تھا؟

☆......☆......☆

ندا نے ارسلان کی ہدایات کے پیش نظر سوگ کا اظہار کرتا ہوا گہرے سرمئی پھولوں کا لباس پہنا تھا کیونکہ وہ بہت شوخ رنگ کے لباس میں ملبوس تھی۔

''تمہیں خود سے کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم ثمر کی بیوی ہو۔ لیکن کوئی پوچھ لے تو جھوٹ مت بولنا...... سچ سچ بتا دینا......'' ارسلان کسی سچے خیر خواہ کی طرح اُسے ہدایات دے رہا تھا۔

''آپ کو میری کتنی فکر ہے...... حالانکہ فکر تو ثمر کو ہونا چاہیے۔'' ندا ہم رنگ دوپٹہ سر پر اوڑھ کر کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے گلہ آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔

''اگر اُس نے تمہیں لاوارث سمجھ کر چار دن کا کھیل کھیلا تھا تو سمجھو پھنس گیا ہے۔ اب میں اسے اچھی طرح سبق سکھا کر ہی واپس جاؤں گا۔''

''ہائے اللہ...... کہیں وہ مجھے چھوڑ نہ دیں......'' ندا ارسلان کی بات سن کر اندیشہ مند ہوئی اور بے ساختہ بولی تھی۔

''ابھی بہت پکڑا ہوا ہے...... ذرا ذرا دیر بعد ایسے بھاگتا ہے جیسے قیدی زنجیریں توڑ کر بھاگتا ہے۔'' ارسلان تب کر برجستہ بولا تھا۔

''ڈونٹ وری...... بہت جلدی تمہیں تمہارے سب رائٹس ملیں گے۔'' ارسلان نے تسلی دی۔ ساتھ ہی وہ اپنے سیل پر گلی میں داخل ہوتی کار کو دیکھ رہا تھا۔ جو اُس نے 'Uber' سے بک کرائی تھی۔

''ہری اپ...... گاڑی آگئی ہے۔''

''اوہ...... ٹھیک ہے...... ارسلان بھائی...... Bye...... Bye......'' ندا بیگ شولڈر پر لٹکاتی باہر کی طرف لپکی۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

بے بی اور باربی

ایک جادو کی چھڑی ہوتی ہے۔ جو وقت کے ساتھ اپنے مالک بدلتی رہتی ہے، کبھی یہ چھڑی ماں کے پاس ہوتی ہے اولاد کو خوش رکھنے، مطمئن کرنے کے تمام ڈھنگ کبھی صرف ماؤں کو آتے ہیں اور کبھی وہ وقت بھی آتا ہے کہ اولاد پر اس جادو کی چھڑی......

''کتاب رخ'' پر جگمگاتی اُس کی نئی تصویر موضوع گفتگو تھی۔ ایک طویل صفحہ جو سراہتے ریمارکس سے مزین تھا۔ واؤ' اوسم' کول' بیوٹی فل' خوبصورت' بہت خوب' ہاٹ...... ایک تصویر کو سراہنے والوں کی تعداد اڑسٹھ تھی۔

ظاہری بات ہے کہ یہ سب اس کی فرینڈز لسٹ میں شامل تھے اور لطف کی بات یہ کہ چند ایک کے سوا بقیہ بے شمار وہ تھے جن سے وہ اس حد تک واقف تھی جس حد تک فیس بک پر ان کے بارے میں بتایا گیا تھا' بلکہ انہوں نے خود بتایا تھا۔ اور بس...... لیکن وہ سب اس کی زندگی کے پل پل سے آگاہ یوں تھے کہ وہ سب کو آگاہ رکھنا چاہتی اور آگاہ رکھنا جانتی تھی۔

کبھی کبھی وہ خود بھی سوچتی کہ اگر الیکٹرونک و سوشل میڈیا کی یہ ایجاد نہیں ہوتی تو وہ خود کیا ہوتی؟ تنہائی کے گنبد میں قید ایک سطحی ملکہ؟ یقیناً ایسا ہی ہوتا۔

سکتے ہیں؟'' بچے بڑے ہو جائیں تو کب تک ماں باپ کی انگلی تھامے رکھیں گے؟'' آخر ایک دن تو یہ ارض و سماء مسخر کرنے نکلنا ہی پڑتا ہے۔ اور یہ تسخیر ہر ایک اپنی صوابدید کے مطابق ہی کرتا ہے۔

دونوں بیٹے باپ کے قد تک پہنچے تو باپ نے پرندوں کا پنجرہ خود کھولا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یکے بعد دیگرے دونوں' عمیر اور عذیر کو کوہ قاف روانہ کیا...... اور کوہ قاف کیا تھا بھلا؟ وہی پہاڑ ناں؟ جس کے پار جانے والے کبھی واپس نہیں آتے' کھو جاتے ہیں' گم ہو جاتے ہیں۔ بس یاد بن جاتے ہیں' کہانی بن جاتے ہیں۔''

عمیر اور عذیر بھی خواب بن گئے' یاد بن گئے' پہلے حصول تعلیم اور پھر حصول روزگار کی تگ و دو نے انہیں اپنی ریشمی بانہوں میں یوں جکڑا وہ بمشکل تمام چند روز کے لیے اپنے آپ کو آزاد کرا کے بھاگم بھاگ آتے۔

بس اتنے سے دن کے لیے کہ ماں کو اُن کا آنا' پرندوں کے پر نکل آئیں تو اڑنے سے بھلا کیسے رو[illegible] ایک خواب سا لگتا۔ ایسا خواب جو

جاگتے سمے میں پتلیوں پر نقش ہو گیا ہو اور دن چڑھے جن کے نقش دھندلے ہوتے جاتے ہوں۔

خوشگوار خواب کو ذہن پر زور دے دے کر یاد کیا جاتا ہے اچھی تعبیر پانے کو بار بار اُن کی تفصیلات یاد کی جاتی ہیں۔ وہ...... وہ بھی یوں ہی اُن خواب نگر کے باسیوں کی یادیں' باتیں بنا لیتی اور صبح شام انہیں دہراتی رہتی اور ان کے 'پھر' آنے پر پکائے جانے والے کھانوں کے مینیو ترتیب دیتی' کہاں کہاں جانا ہے سوچتی...... صرف سوچتی تو کوئی بات نہ تھی وہ بول بول کر سوچتی' سوچ سوچ کر بولتی' ساری یادیں باتیں بن جاتیں' لامتناہی باتیں......

کام والی بختاور بی بی جنہیں سن سن کر اُن کی حافظہ بن جاتی' جھلا جاتی' چڑ جاتی' مگر بس جی بی بی جی......! اچھا باجی جی کرتی رہتی...... ہاں......''

☆......☆......☆

میاں جی عامر صاحب بھی تو تھے مگر ریٹائرمنٹ کے بعد جو انہوں نے کنسلٹنسی کا سلسلہ جاری رکھا تھا سو مصروفیات کم نہ تھیں' بڑھ ہی گئی تھیں کہ اب یہی بزنس بھی تھا ذاتی سوجتنا گڑ اتنا میٹھا...... اور وہ 'میٹھا' بنانے کے چکر میں گھر سے اور لاپرواہ ہو گئے تھے کہ گھر سنبھالنے کو ہے ناں...... یہ بیگم صاحبہ...... رہ گئی۔

''عبیر...... تو وہ سوفٹ ویئر انجینئر تک پڑھ کر گھر کیوں بیٹھی؟''

''ہاں...... ایک ہفتہ کو بیٹھی تھی کسی پروجیکٹ پر دن رات جتے رہنے کے بعد اُس کی تکمیل کی خوشی میں یا تھکن اتارنے کو ایک ہفتہ کی چھٹی پر تھی۔ ڈیڑھ دن تو خوب سوئی' اٹھی تو دیکھا کہ اماں بھی سوئے جا رہی ہیں' آج کل' پہلے

لا پروائی سے پھر توجہ سے اور پھر تشویش سے اس نے نوٹ کیا۔ چھٹی پندرہ دن کی اور بڑھالی۔ سچ ہے بیٹی ہی ماں کو جان سکتی ہے' ماں کے دل کی دھڑکن کے تال پر بیٹی ہی کا دل دھڑکتا ہے۔

''مما چلیں باہر چلیں۔'' سر جھاڑ منہ پھاڑ کی تصویر بنی ٹی وی کے آگے اونگھتی شمائم سے عبیر نے کہا تو انہوں نے غنودہ آنکھیں سوالیہ انداز میں اس پر گاڑھ دیں اور پھر بے زاری سے پھیل کر لیٹ ہی گئیں۔

''اُم...... ہاں...... ں......'' بیٹی لاڈ سے ٹھنکی۔

''کیا حلیہ بنا رکھا ہے آپ نے...... بال دیکھیں......'' اس نے بھوسہ جیسے بالوں میں انگلیاں اُلجھائیں۔

''آ کٹنگ کتنے سالوں پہلے کی تھی؟''

''ہٹو......'' ماں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا جانے کیوں آنکھیں گیلی ہونے لگیں تھیں۔

''چلیں ناں...... آج باہر کھانا کھائیں گے۔'' بٹیا نے اماں کو گھسیٹ گھساٹ کر اٹھایا۔

''چلیں...... اب اچھے سے کپڑے پہن کر آئیں۔''

ایک جادو کی چھڑی ہوتی ہے۔ جو وقت کے ساتھ اپنے مالک بدلتی رہتی ہے' کبھی یہ چھڑی ماں کے پاس ہوتی ہے اولاد کو خوش رکھنے' مطمئن کرنے کے تمام ڈھنگ کبھی صرف ماؤں کو آتے ہیں اور کبھی وہ وقت بھی آتا ہے کہ اولاد پر اس جادو کی چھڑی سنبھالنے کا فرض آ پڑتا ہے۔ اور وہ چھڑی آج عبیر کے ہاتھ میں تھی۔

کبھی جیسے شمائم ننھی سی عبیر کو تیار کرتی تھی آج عبیر شمائم کو تیار کر رہی تھی۔ ایک نیا سوٹ جو تن پر پڑنے کا جانے کب سے منتظر پڑا تھا نکال کر استری کیا۔

''اونہوں...... نہیں اس کے ساتھ تو شلوار ہے...... شلوار نہیں ٹراؤزر چلے گا۔'' اُس نے استری کرنے کے بعد سوچا۔ دوبارہ الماری میں منہ دے دیا اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر ایک فان کلر کا ٹراؤزر نکال ہی لیا۔

''توبہ ہے مما......!'' اس نے بزرگوں کی طرح ماں کو ڈانٹا۔

''آپ کی الماری ہے کہ کباڑ خانہ...... کوئی ڈھنگ کا سوٹ تک نہیں...... حد ہوگئی۔''

''اور یہ......'' ماں کے بالوں میں کنگھی چلاتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

''یہ بال ہیں یا گھونسلہ......'' اور پھر ماں بیٹی نک سک سے درست ہوکر باہر نکلیں تو شام ڈھلے واپسی ہوئی تو لاؤنج میں عامر صاحب کو چائے پیش کرتی بختاور ہی نہیں عامر صاحب بھی لحہ بھر کو سکتے میں رہ گئے۔

واقعی وہ دونوں چھوٹی بڑی بہنیں ہی تو لگ رہی تھیں۔

''کیا پاپا؟'' بٹیا نے اترا کر تعریف چاہی۔

اسمارٹ سی فٹنگ کا ٹخنوں سے ذرا اُچکتا ہوا ٹراؤزر' ڈھیلی سی لانگ شرٹ' کندھے پر پڑا دوپٹہ خوبصورت ہیئر کٹ اور نیا نیا فیشل کیا ہوا ذرا ذرا سا سرخ چمکتا ہوا چہرہ۔

''بھئی واہ......'' عامر صاحب کی آنکھوں نے بھرپور سراہا۔

''یہ کون لڑکی ہے؟'' انہوں نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے شرارت سے پوچھا۔ شمائم بیس سالہ لڑکی کی طرح شرما سی گئیں۔

''یہ میری بے بی......'' بیٹی نے لاڈ سے ماں کو بانہوں میں سمیٹا۔

''اور اب آپ کو ایسا ہی رہنا ہے۔'' دوسری

سانس میں اس نے ماں کو ہلکا سا جھنجوڑ کر کہا۔
''ہم بڑے ہو گئے ہیں' بڑی ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ کے لیے کرنے کو اب کچھ نہیں۔ کیوں پاپا؟'' اس نے باپ سے تائید چاہی۔
''آف کورس بیٹا.....'' انہوں نے دل سے تائید کی۔
تو پھر آپ نے میری ماما کو اگنور کیوں کیا؟''
آج وہ والدین کی اماں بننے پر تلی ہوئی تھی۔
''اگنور.....میں نے؟'' وہ ذرا پریشان ہو گئے۔
''اچھا چھوڑیں.....'' اگلے ہی لمحے وہ ساری باتوں کو کنارے کر کے اب شاپر کھول رہی تھیں۔
''یہ دیکھیں.....'' وہ اب ایک ڈبہ کھول رہی تھی۔ ہتھیلی برابر کوپر کلر میں جدید سلم اسمارٹ فون.....
''ارے.....ابھی دو ہفتے پہلے تو تم نے چینج کیا ہے موبائل۔'' عامر صاحب چیں بہ چیں ہوئے۔
''ابا حضور۔'' لاڈلی بیٹیا نے آنکھیں نچائیں۔
''یہ ماما کے لیے ہے.....''
''یہ ماما کے لیے؟'' وہ مزید حیران ہوئے۔
''یہ کون سا کہیں آتی جاتی ہیں جو ان کو ضرورت ہو گی۔''
''بس پاپا.....'' لاڈلی برا مان گئی۔
''میری ماں کو بھی نئے دور میں آنے دیں' اس پر صرف آپ کا اور ہمارا ہی حق نہیں۔''
''باپ جی.....!'' اگلے ہی پل اس نے موڈ بدلا اور بدلتے موڈ کے ساتھ اس کے اندازِ تخاطب بھی بدلتے تھے۔
''کچھ یاد ہے میری بچی کو آپ نے کب آخری مرتبہ شاپنگ کرائی تھی۔'' وہ اپنی ماں کو ننھی بچی کی طرح آغوش میں سمیٹے ہوئے جھولے دے رہی تھی۔
''لو بھلا؟'' عامر صاحب بلبلا ہی تو گئے۔
''میں نے کب انہیں روکا ہے شاپنگ کرنے کو.....''
''اچھا چھوڑیں۔'' وہ عبیر ہی کیا جو ایک ٹریک پر چلتی رہے۔
''آپ نے کرائی، میں نے کرائی ایک ہی بات.....لیکن عامر صاحب.....کبھی کبھی اپنی بیگم کو آؤٹنگ پر لے جایا کریں' ٹھلوں' کے تنگ کرنے کا خدشہ ہو تو نکاح نامہ رکھ لیا کریں ساتھ.....''
چائے کے برتن سمیٹتی بختاور منہ پر دوپٹہ رکھ کر کھی کھی کرنے لگی اور عامر صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
دو بیٹوں کے درمیان والی یہ اکلوتی بیٹی ایسی ہی تھی بظاہر لاپرواہ' لاابالی مگر درحقیقت بہت باریک بین سمجھدار اور لائق..... اور اس وقت دونوں ماں بیٹیاں دو سکھیوں کی طرح سر جوڑے اسمارٹ فون پر جھکی ہوئی تھیں جو عبیر ماں کے لیے لائی تھی اور اب وہ اس کے فنکشنز سے ماں کو یوں روشناس کرا رہی تھی جیسے چھوٹے سے بچے کو سبق پڑھایا جا رہا ہو۔
شائم پہلے تو اکھڑی اکھڑی' بیزار سی رہیں۔ لیکن ایک نئی دنیا' نیا جہاں اب اُن کی ہتھیلی پر تھا اور عبیر نے انہیں آج یوں خوش کر دیا تھا ذرا سی توجہ اور وقت دے کر کہ اکثر گردن اور کندھوں میں ہونے والا درد' بیزاری اور اُکتاہٹ سب اڑن چھو تھا اور وہ ساری شاپنگ سمیٹ کر اب بڑی فریش فریش' خوشگوار موڈ میں بختاور کے ساتھ ہی کچن میں عبیر کے پسندیدہ چاؤمن کے لیے چیزیں نکال کر کھڑی تھیں کہ کھانے کے بعد ایک اور سرپرائز دینے کا کہا تھا عبیر نے.....''
اور شملہ مرچ کاٹتی شائم سوچ رہی تھیں کہ

میں کیوں سوچتی تھی کہ اب میری ضرورت نہیں کسی کو؟'' میں نے اتنے دن اپنے آپ کو کیوں کھوئے رکھا؟ اپنی ذات کی بازیابی بہت ضروری ہے لیکن کیریئر اور تعلیم کے بکھیڑوں میں اُلجھے بچوں کے والدین ان مصروف بچوں کی مدد کے بغیر اپنے آپ کیسے بازیاب کر سکتے ہیں اور شمائم خوش قسمت تھی کہ ان کی بیٹی نے بروقت ان کو بازیاب کر لیا تھا۔

ابتداء میں تو اسمارٹ فون پردیسی بچوں سے پل پل رابطے میں معاون رہا' واٹس ایپ کی بدولت اب فون کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا' کس نے کب کیا پہنا' کیا کھایا' کیا پکایا' کہاں گئے کب سوئے' کیا خریدا شمائم کو سب پتہ ہوتا تھا۔ واٹس ایپ' وائبر' یوٹیوب' گوگل...... ایک جام جمشید تھا جو انگلی کی پور میں سمٹ آیا تھا۔ ایک جہاں بے پناہ تھا جو ہتھیلی پر بچھ گیا تھا اور یہ بے پناہ از کراں تا کراں دنیا کتنی چھوٹی تھی جو ایک ڈبیا میں سما گئی تھی۔

جیسے جیسے اسمارٹ فون کے فنکشنز اور Apps سمجھ میں آرہے تھے ہر پل غنودہ غنودہ سی شمائم کو جیسے جینے کا' جاگنے کا' جاگے رہنے کا جواز مل گیا تھا۔

اس روز تو مارے ایکسائٹمنٹ کے مرنے کے قریب ہی ہوگئیں جب ان فیس بک پر میسج میں ایک پیغام ملا۔

''کیا آپ وہی شمائم حیدر ہیں جو فلاں سن میں فلاں کالج میں پڑھتی تھیں؟ اگر ہاں تو میں آپ کی فلاں دوست کی بیٹی ہوں امی آپ کا اکثر ذکر کرتی ہیں۔ یہ نام' شمائم' عام نہیں۔ امی کہہ رہی تھیں کہ یہ شمائم ان کی دوست ہی ہوگی۔''

اور یوں دھیرے دھیرے کچھ پرانے دوست ملے۔ بہت سے نئے بنے' اور جس دن عمیر نے اپنی اور اس کی تصویر لگائی اتنے کمنٹس آئے کہ مزہ آگیا۔ اب تو وہ خود بھی کہیں جاتی ایک سیلفی ضرور فیس بک پر جچ جاتی۔ وہ کوئی سیلبریٹی نہیں تھی' کوئی پبلک فگر نہیں تھی' لیکن اس کی فرینڈز لسٹ طویل تھی' اس لسٹ میں عزیز رشتہ داروں کے علاوہ عذیر اور عمیر کے دوست' عمیر کی وال پر کمنٹ کرنے والے بھی تھے۔

اس روز فیس بک پر جو نام اور تصویر People You May Know کے عنوان سے اس کے سامنے آئی۔ وہ اس کے یونیورسٹی فیلو کی تھی۔ بے اختیار ہی انگلی مچلی اور کلک کر دیا۔

ہاں وہ وہی تھا اس کی تصویریں کم تھیں۔ لیکن جو چند ایک تھیں وہ بتاتی تھیں ارتضیٰ آج بھی ویسا ہی تھا۔ ہاں تھوڑا سا بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ بال بھی چھوٹے ہوگئے تھے سامنے سے اڑے اڑے لگ رہے تھے' لیکن...... وہ اس نے سوچا آج بھی کہیں نظر آجائے تو وہ اسے پل بھر میں پہچان سکتی تھی۔ گو کہ اب وہ پہلے کی طرح ہم وقت دانت نکالے نظر آرہا تھا۔ یونیورسٹی کی یادوں کا البم اس کے سامنے روزِ اول سے لے کر روزِ آخر تک ورق ورق ذہن میں کھل گیا تھا۔

''آہ دورِ طالب علمی وہ یورنیورسٹی کے چار سال کیسے بھلائے جا سکتے ہیں۔ وہ وقت جب تھا تو یوں تھا کہ جیسے ہمیشہ یونہی رہے گیا۔
گذرا تو یوں جیسے کہ...... ماچس سلگتے ہی بجھ جائے

پرانے دوستوں سے ملنا کیسا خوشگوار لگتا ہے' یوں جیسے بہت سی آکسیجن مل گئی ہو۔ کچھ عجیب سی بات ہی تھی کہ وہ دو دن تک ارتضیٰ رفیع کی وال چیک کرتی رہی۔ اس کی تصویریں دیکھتی رہی۔ اور پھر رہ نہ سکی اور فرینڈز ریکوئسٹ سینڈ کر دی۔

آج کل بختاور کی جان عافیت میں تھی' بی بی اب 'موبیل' میں بزی ہوتی تھی' اب وہ آملیٹ کچے ہونے ٹوسٹ زیادہ سنکے ہونے اور چائے کبھی ٹھنڈی' کبھی زیادہ میٹھی ہوجانے پر فضیحتے نہیں کرتی تھی۔

ناشتے کی میز پر دس بجے اکثر وہ اکیلی ہی ہوتی اور آنکھیں موبائل اسکرین پر گڑی ہوتیں۔ اب تو اکثر یہ بھی ہونے لگا تھا کہ بختاور پوچھتی کہ باجی جی کیا پکانا ہے؟'' تو باجی جی لاپروائی سے کہتی۔

''جو دل چاہے بنالو......'' سکون کے سانس لیتی بختاور اکثر سوچتی کہ چھوٹی باجی نے اتنی دیری سے کیوں دلایا موبائل بڑی باجی کو......''

☆......☆......☆

تین دن ہوگئے تھے ارتضٰی کو فرینڈ ریکوئسٹ بھیجے' کل ڈول مین کے فوڈ کورٹ میں لی گئی سیلفی پر اتنے کمنٹس آئے تھے کہ وہ حیران رہ گئی۔

''اوسم یار......تُو تو ابھی تک ویسی ہی شمائم ہے۔''

یہ اس کی یونی فیلو ہانیہ کا کمنٹ تھا جو اب ایک بھاری بھرکم اماں تھی بیوٹی فل' گورجیئس' نائس' اف دل چاہ رہا ہے آپ کو پرپوز کردوں' دھڑکتے دلوں کے سائن...... اف اتنے سارے کمنٹس' اس کو ہنسی آگئی۔ اس فہرست میں وہ لوگ بھی تھے جن کو ذاتی طور پر جانتی تھی اور وہ انجان بھی تھے جنہوں نے اُسے ریکوئسٹ بھیجی اور اس نے ایکسپٹ کرلی۔

موبائل اسکرین سامنے کرتے اس نے ایک مرتبہ اپنا آپ دیکھا...... تب ہی بختاور نے چائے کا کپ اور ابلا انڈا سامنے رکھا تو اس کی جانب متوجہ ہوئی فیس بک پر ہی ایک گروپ تھا کوکنگ کی شوقین کچھ خواتین کا' جانے کیوں اس نے بھی جوائن کرلیا تھا۔ آج اس گروپ کا ایک گیٹ ٹوگیدر تھا۔ پر ہیڈ ہزار روپے دینے تھے اور ایک فور اسٹار ہوٹل میں ہائی ٹی پر سب جمع ہورہے تھے۔ عبیر آج کل آفس سے دیر سے آرہی تھی' عامر صاحب حسب معمول صبح نکلتے تو شام اور اکثر رات ہی ہوجاتی اور آج کل تو وہ کسی کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ سو ڈرائیور اور ان کی گاڑی دسترس میں تھی۔

یہ گروپ 'آج کیا پکائیں' اور ایسے ہی دو تین گروپ شمائم نے اکیلے ہی جوائن نہیں کیے تھے بلکہ ہانیہ اور بتول کو بھی اس نے فورس کرکے شامل کرلیا تھا یوں اب اکثر دو چار مہینے بعد کہیں نہ کہیں 'گیدرنگ' کے نام پر تفریح ہوجاتی تھی۔

آج 'آج کیا پکائیں' کے گیٹ ٹو گیدر میں جانے کے لیے ہانیہ کو اس نے پک کرلیا تھا اور اب دونوں بچوں' گھر' مہنگائی' بوریت کے قصوں سے ہوتی ہوئی اولڈ میموریز میں کھوگئی تھیں۔ یار مجھے تو آج بھی خوابوں میں کیمپس کی راہداریاں آتی ہیں۔'' ہانیہ نے ہنسی کے نام پر کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

''حالانکہ اس دور میں سب سے بور اور سڑیل تم ہی ہوتی تھیں۔'' شمائم نے ہنس کر کہا۔

''ہاں ناں!'' ہانیہ نے منہ بنایا۔ ہفتے میں چار دن اماں سے شرافت' عزت' حیاوشرم کا لیکچر جو لی پی کرآتی تھی۔

''ہاں ...... کیسے تھے ہم چاروں سڑیل سے 'بیوقوف شمائم نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اور...... میں تم تینوں (شمائم' بتول' اسماء) سے زیادہ...... ہانیہ نے حقیقت پسندی سے کہا۔

''تم کو ارتضٰی رفیع یاد ہے؟'' ہانیہ نے اچانک پوچھا۔

''ارتضٰی؟'' شمائم نے خاموش نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ہاں ارتضٰی؟'' ہانیہ نے باہر ٹریفک کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''وہ نہیں ہوتا تھا ڈھیروں' جو بڑے بالوں والا'

چلبلا سا...... ارے وہی...... جس نے ایک مرتبہ تم کو......'' ہانیہ کے کچھ کہنے سے پہلے منزل مقصود آ چکی تھی وہ دونوں اُتر کر ہوٹل میں چلی گئیں۔ بات گو کہ ادھوری رہ گئی...... لیکن...... اس ادھوری بات میں ہی کتنی کہانیاں تھیں...... لیکن...... اب ان کی کیا حیثیت اور حقیقت؟'' شمائم نے سر جھٹکا۔

ایک بھرپور شام انجوائے کرکے وہ گھر پہنچی تو رات ہو چکی تھی' عمیر ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر دراز تھی۔

''کھانا کھایا؟'' اس نے پیار سے بیٹی سے پوچھا۔

''جی ماما......'' وہ ٹی وی اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''واؤ ماما' یور آر لوکنگ سو کول......'' بیٹی نے سراہا تو وہ ہنس دی۔

''آپ کا یہ سوٹ صبح میں پہن کر جاؤں گی۔'' وہ بلیک ٹیولیپ شلوار اور میرون اور بلیک شرٹ کو دیکھ کر شرارت سے بولی۔

''شیور جانو!''

''لو یو بے بی...... اجازت ملنے پر عمیر نے لوفروں کی طرح فلائنگ کس کا اشارہ کیا اور شمائم ایک چپت لگا کر ہنستی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ رات گئے جب بستر پر لیٹی تو بے ارادہ ہی موبائل آن کیا۔ فیس بک میں لاگ ان ہوئی۔

''اوہ...... ارتضٰی نے ایک میسج ان باکس کیا تھا ریکوئسٹ قبول کرنے کے بعد......''

''میں آپ کو یاد ہوں؟''

''یاد تھے تب ہی تو...... بے سوچے سمجھے ہی ٹائپ کیا اور ان باکس کر دیا۔

''اب کیا فائدہ۔'' (اور ایک لٹکے ہوئے اُداس چہرے کی شبیہہ) چند منٹوں میں ہی جواب آیا۔

شمائم لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ بے اختیار ہی نظر عامر صاحب کے تکیے پر گئی۔

''آج فون بھی نہیں آیا اُن کا......'' اس نے سوچا۔ موبائل آف کرکے دھیرے سے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور سر تکیے پر رکھ کر لیمپ اف کر دیا۔ اور......

اس رات وہ بھی ہانیہ کی طرح یونی کی راہداریوں میں بھٹکتی پھری۔ بس ایک اس یاد سے ہی بچتی رہی جس کے لیے وہ اپنے آپ کو بھی یقین دلا چکی تھی کہ......

''مجھے تو نہیں پتہ...... مجھے تو کچھ یاد نہیں۔''

بہت بے چین نیند کے باوجود صبح بڑی خوشگوار تھی۔ عمیر آفس جا چکی تھی۔ عامر صاحب کو شام کو آنا تھا۔ آج موبائل اس نے لاپرواہی سے ایک طرف ڈالا ہوا تھا۔ کل کے گیٹ ٹو گیدر کی تصویریں اپ لوڈ ہو چکی ہوں گی لمحہ بھر کو خیال آیا۔ اور پھر وہ کچن میں جا کھڑی ہوئی۔

''بالکل یوں جیسے...... جیسے...... فرار......''

''فرار؟ کس سے؟ کیوں؟ ہونہہ......''

کتنے ہی دنوں بعد آج بختاور سے کچن کی صفائی کروائی۔ خود کھڑے ہو کر باتھ رومز دھلوائے اور...... شام کے لیے کھانا خود پکانے کھڑی ہوگئی۔

''باجی جی! تہاڈا موبیل خراب ہو گیا اے؟'' بختاور نے پوچھا اور اس کے گھورنے پر جلدی جلدی سنک کو دم سے رگڑنے لگی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد عامر صاحب اور عمیر کے پسندیدہ کھانے بنا کر نہانے کے لیے واش روم جانے سے پہلے ذرا دیر کو کمر ٹکائی اور یونہی موبائل آن کیا تو واٹس اپ پر عذرا' عمیر کے کئی میسج تھے۔ ہانیہ کی کال تھی۔ اور میسج تھے...... کہاں مرگئی؟ کہاں مرگئی؟ نیٹ آف ہے کیا؟ آج کیا پکا رہی ہیں۔'' میں پکس دیکھ کیا آنت ہے یار...... میں

تو دبلی ہو نہیں سکتی' ایسا کر تو موٹی ہو جا..... میرے جوڑ کی تو لگے ناں.....''

''اُف..... یہ ہانیہ بھی ناں.....''

فیس بک میں لاگ ان ہوئی۔ واقعی تصویریں کل والی بہت ہی اچھی لگی تھی۔ ایک دو جگہ اس کا کلوز اپ تھا۔ اور..... آخر میں اس نے میسج کا سائن دیتا اِن باکس چیک کیا۔

''کیسی ہو؟ یار تم تو بالکل نہیں بدلیں۔''

''میں ٹھیک ہوں..... آپ کیسے ہیں؟'' اس نے جواباً لکھا۔

ورقِ خیال وصل تھا سونے کا کنگنا
اس میں تیرے جمال کا ہیرا جڑا ہوا
سارا جہاں مجھ کو بلاتا تھا چھاؤں میں
لیکن میں تیری دھوپ میں جا کر کھڑا ہوا

چند لمحوں بعد ایک قطعے کی صورت جواب آیا۔

وہ سن سی ہو گئی۔ دل کچھ عجیب انداز سے دھڑکا۔

لاگ آؤٹ ہو کر موبائل رکھا اور الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔ عامر صاحب چار دن بعد آ رہے تھے۔ بے ارادہ ہی ہاتھ جس ہینگر کی طرف بڑھا وہ لیمن کلر کی ساری کا تھا جس کا میرون بلاؤز تھا۔ عامر صاحب کو ساڑیاں پسند تھیں اور اب وہ کم کم ہی ساڑھیاں پہنتی تھی۔ شام کو ٹیرس پر چائے پیتے ہوئے اُس نے موبائل آن کیا فیس بک میں لاگ ان ہوئی۔ ارتضیٰ نے میسج کیا تھا۔

''ناراض ہو گئیں؟''

''نہیں تو.....'' اس نے جواب دیا۔

''اچھی بچی.....'' جواب آیا۔

''کیا مصروفیات ہیں؟'' شمائم نے سوال کیا۔

اور اس روز عامر صاحب کے لیے شمائم کا گرمجوش استقبال حیران کن اور دل خوش کن تھا۔

..... ورنہ وہ تو عرصہ سے ایک لاپرواہ اور تھس سے رویے کی حامل ہو چکی تھی۔

''ہاں بیگم رانی! سنایئے..... کیسے گزرے یہ چار دن.....؟''

''پاپا.....'' عبیر جو ابھی ابھی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی چہکی.....

''اگر آپ فیس بک یوز کرتے ہوئے تو آپ کو سوال کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔''

''ہاں..... یہ تو ہے.....'' پاپا نے تائید کی۔

''مگر یار..... یہ ہمارے بس کے کام نہیں۔''

''یو اولڈ مین.....'' عبیر نے چڑانے والے انداز میں کہا۔

''ہاں بھئی..... ہم اولڈ ہی بھلے۔''

''لُک مائے بے بی.....'' عبیر نے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال کر پیار اور شرارت سے ماں کی طرف اشارہ کیا جو شانوں سے ذرا نیچے آتے بال بلوڈرائی کیے سمیٹ کر ایک طرف ڈالے ساڑھی کا لمبا سا پلو پھیلائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے موبائل میں کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔

''ہاں..... لُک یور بے بی..... اینڈ مائے بار بی.....'' عامر صاحب نے ہنس کر کہا۔ اور ارتضیٰ کو میسج کرتی شمائم کی انگلیاں چند لمحوں کو تھمیں۔ اور پھر تھر کنے لگیں۔

بہت خوبصورت' آسودہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر تھی۔

''اور..... وہ بے بی سے باربی کب بنی اس بات سے بے خبر وانجام عاصر صاحب اس کے بہت کول اور واقعی ادسم شوہر..... اور مست قلندر ٹائپ بیٹی جو اگلے تین ماہ بعد سسرال سدھارنے والی تھی۔ دونوں کسی سیاسی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔

☆☆.....☆☆

افسانہ

غزالہ رشید

دل کے لاکرز

''وہ لوگ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ وہاں جاکے اپنا آپ فالتو لگنے لگتا ہے۔ اور آپ نے وقت پر کھانا کھانے کی ایسی عادت ڈال دی ہے کہ خالہ جانی کے پاس محبت سے جانے کے باوجود، میں تو بے ہوش ہونے لگتا ہوں۔'' شاہ میر کو جلدی میں......

''مالی بابا آپ نے ٹماٹر کا پودا لگا بھی لیا، میں نے کہا تھا، اس دفعہ پودا لگائیں تو بلائیے گا مجھے، میں بھی آپ کے ساتھ لگاؤں گی۔'' حنا نے منہ بنایا۔

''میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا تھا، وہ بولیں۔ آپ دوست سے فون پر بات کر رہی ہیں۔'' مالی بابا نے ٹماٹر کے پودے کو پانی دیتے ہوئے کہا۔

''اُف I Missed it۔'' اُسے ہر نیا کام کرنا اچھا لگتا تھا۔

حنا دو بھائیوں کی لاڈلی...... ہر بات میں صرف اپنی مرضی چلانے والی اور...... اور دوستوں کی سالگرہ یاد رکھنے والی، اُن سے اپنے ناز اٹھوانے والی ایک ایسی نازک سا دل رکھنے والی لڑکی تھی کہ تنقید تو وہ کسی کی بھی ایک لمحہ برداشت نہیں کرتی، نہ کہ انڈیا سے آنے والے لکھنؤ کے اس بانکے، چھبیلے، شاہ میر کی لکھنوی اردو سہہ پاتی۔ جسے ہر لمحہ پاکستان کی لڑکیوں کے فیشن پر تنقید کرنے کی عادت تھی اور تو اور ان صاحب کو اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ وہ ہر لمحہ اُردو میں انگریزی کا تڑکا لگانے کی کوشش ہی کیوں کرتی ہیں۔'' لو بھلا یہ کون سی اعتراض کرنے والی بات تھی۔

☆......☆......☆

عشرت خانم اور سطوت خانم دونوں ایسی بہنیں، جن کی محبت پر پورا خاندان رشک کرتا تھا۔ یقین نہ آئے تو عید الفطر کے کارڈ کا مضمون ملاحظہ ہو...... جو شادی لکھنؤ میں ہونے اور رخصت ہونے کے بعد پہلی عید پر میکے سے دوری کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے عشرت خانم نے سطوت خانم کو لکھا تھا۔

پیاری سطوت!

سدا پھولوں کی طرح مسکراتی رہو۔

رمضان کا چاند دیکھا تو دل چاہا فوراً ہی تمہارا چاند سا چہرہ بھی نظر آجائے، لیکن ویزے کی مجبوری...... اور تمہارے بہنوئی صفدر درانی کی ناسازی طبیعت کی بنا پر دل مسوس کے رہ گئی اور پھر آنسوؤں نے تو جیسے میرے دل کا رستا ہی دیکھ

لیا...... جب دیکھو تارے بن کے آنکھوں میں چمکتے ہیں۔ اوپر سے تائی امی کا کہنا' ان دنوں سفر سے پرہیز کرنا چاہیے' ہائے دل بے چارہ کیا کرے رسم و رواج اور شہر نہیں...... بلکہ سرحد کی دوری دل میں زخم بن کے رستی جا رہی ہے۔ دل بہت بھاری ہو رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں ساغر صدیقی کا شعر کیا، غزل پوری گنگنانے کو جی چاہ رہا ہے۔ اور لو تم بھی میرے ساتھ گنگناؤ، جیسے ڈھولک گیت...... کتنا مزا آیا تھا ناں ماموں صغیر کی شادی میں......

پوچھا کسی نے حال کسی کا تو رو دیے
پانی میں عکس چاند کا دیکھا تو رو دیے
بادل فضا میں آپ کی تصویر بن گئے
سایہ کوئی خیال سے گزرا تو رو دیے

لگ رہا ہے، تائی امی آ رہی ہیں کمرے کی طرف، بس تم جلدی سے خط کا جواب لکھ بھیجنا، اور ہاں امی ابو کے ساتھ تصویریں بھی...... اور پوچھنا ذرا...... کاہے کو بیاہی بدیس......!

اچھا اب اجازت دو۔
تمہاری اپنی ہمشیرہ عشرت خانم، لکھنؤ

☆......☆......☆

اور جب شاہ میر پیدا ہوا تو اُن کی بس ایک ہی دعا تھی۔ یا اللہ سطوت کو پیاری گڑیا عطا کر، میں اُسے اپنے چاند سے شاہ میر کے ساتھ بیاہ کر اپنے پاس لے آؤں تاکہ میری تنہائی دور ہو، اس سے میں کبھی قائداعظم کے مزار کی سیر پر جانے کا ذکر کروں، اور کبھی کلفٹن کے ساحلوں کی ہوا کی باتیں...... اور بھلا کیوں نہ کروں، کیا صرف میں تاج محل کی تعریفیں سنتی رہوں ہر وقت...... میرا بھی تو جی چاہتا ہے۔ کراچی کی شادیوں پر ہر سال

جانے کو...... وہاں تو سب کو شاید صرف میرا نام ہی یاد رہ گیا ہے اور میں ہوں کہ سانسوں کی مالا پر اُن سب کے نام ہی جپتی رہتی ہوں۔

☆......☆......☆

''دیکھو شاہ میر! سطوت نے کتنے پیار سے بلایا ہے تمہیں، کیا مسئلہ ہے تمہیں کیوں منع کرتے ہو وہاں جانے سے، تمہارے ابا بیمار نہ ہوتے تو میں بھی ساتھ چلتی۔'' عشرت خانم نے شاہ میر کے امتحان ختم ہوتے ہی وہی پرانا راگ الاپنا شروع کیا۔

''وہ لوگ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ وہاں جا کے اپنا آپ فالتو لگنے لگتا ہے۔ اور آپ نے وقت پر کھانا کھانے کی ایسی عادت ڈال دی ہے کہ خالہ جانی کے پاس محبت سے جانے کے باوجود، میں تو بے ہوش ہونے لگتا ہوں۔'' شاہ میر کو جلدی میں یہی وجہ سمجھ آئی جبکہ وجوہات اور بھی بہت ساری تھیں۔

''تم تو ایسے نہ کہو، میری جان تم جانتے ہو ناں سطوت کس طرح ہر سال میری عیدی، تمہاری عیدی یہاں بھیجتی ہے۔ ہر سال تمہاری تصویر منگواتی ہے۔ اور تم سے تو مجھے یہ امید نہیں تھی۔ سارے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ایک بہن ہی ہے میرے پاس۔'' جملہ مکمل ہونے سے پہلے عشرت خانم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

شاہ میر باپ کا مزاج جانتا تھا۔ ماں سے پیار بھی بہت تھا وہ شرمندہ ہو گیا۔ ایک عرصے سے دادی کی خدمت کرنے والی بیمار باپ کا چڑچڑا پن برداشت کرنے والی اس کی سادہ سی ماں اس کا آئیڈیل تھی، جسے وہ کبھی نا بتا سکا کہ اس کی بچپن کی دوست کومل، آج بھی اس کی موٹر سائیکل کی آواز پر بالکونی سے نیچے صرف اور صرف اُسے دیکھنے آتی ہے۔ اور وہ اُسے صرف اس لیے نظر اُٹھا کے نہیں دیکھتا کہ وہ جانتا ہے ماں اس کے لیے کچھ اور ہی ایک زمانے سے سوچ بیٹھی ہے۔ دعا ضرور کرتا تھا کہ پیارے اللہ میاں کوئی ایسی معجزہ دکھا دیں ناں پلیز کہ اس کی کزن حنا کی شادی کسی اور سے ہو جائے۔ انکار اس فیملی کی طرف سے ہو تا کہ وہ ماں کی عدالت میں سر جھکا کے نہ کھڑا ہو۔ آزادی کا متن اس کے نام خود ہی جاری ہو جائے کیونکہ دعا ہی مومن کا ہتھیار ہے۔'' یہ اس نے مولوی صاحب سے قرآن مجید پڑھتے ہوئے بارہا سنا تھا۔

☆......☆......☆

''اُف پھر آ جائے گا آنے والا ہے لکھنؤ سے...... شاہ رخ خان اور سوری شاہ میر خالہ کی جان، بتاؤ ناں کیسے اُس سے پیچھا چھڑوایا جائے، تصویر تو دیکھی ہے ناں اس کی تم نے؟'' اس نے فون پر عائشہ سے دکھ کہہ ڈالا۔

''اچھا خاصا چارمنگ بندہ ہے، تمیز و تہذیب والا، یہ تو نہیں ہے ناں کہ فون پر کسی سے دوستی اور ہوٹلنگ کسی اور کے ساتھ۔'' عائشہ نے سمجھایا۔

''تمہارے اندر تو کسی زیب النساء، امراؤ جان کی روح ہے۔ بندہ بات کر کے سوچے کہ کیوں کی، دیوار سے سر پھوڑ لے تو اچھا ہے۔'' حنا بےزار ہوئی۔

''بھئی وہی ہے ناں جو شمیل بھائی کی شادی پر آئے تھے۔ کتنی پیاری اُن کی ای ہیں یار، اور نہ کوئی نند ہے اور نہ دیورانی، جٹھانی...... ورنہ تو اچھا خاصا اسٹار پلس کا ڈرامہ بن جاتا ہے بندہ شادی کے بعد، دیکھا نہیں سامعہ کو کتنی اسمارٹ تھی اور اب صرف اور صرف مصالحہ چینل والی گفتگو سن لو اس بےچاری سے، مجھے تو رحم آتا ہے۔'' عائشہ

نے طویل تبصرہ کیا۔
''تم تو کسی چینل پر دو ٹوک، روک ٹوک کی اینکر بن جاؤ، بس میں اب جا رہی ہوں فوزی کے لیے گفٹ لینے، تمہارا کیا موڈ ہے؟'' حنا نے مزید شاہ میر پر رائے لینے سے بہتر سمجھا کہ فون بند کر کے کوئی اور کام کیا جائے۔

☆......☆......☆

ہم ساری زندگی اسی خوش فہمی میں گزار دیتے ہیں کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ ہر کام اپنی مرضی سے کر سکتے ہیں۔ ایسے میں کاتب تقدیر ہمارے اس بچپنے پر مسکراتا ہے اور بندہ جانے انجانے طور پر ان فیصلوں کی زنجیر میں خود بخود بندھتا چلا جاتا ہے۔ دل مانے نہ مانے، دماغ لاکھ دلیلیں دے لکیریں Magnifying Glass سے دیکھتا رہے یا نجومی کے سامنے جا بیٹھے، ہوتا تو وہی ہے جو رب کائنات چاہے۔

☆......☆......☆

''کیا کر رہی ہو ذرا شاہ میر کے لیے ایک چائے کا کپ تو بنا دو، رانی آج آئی نہیں ہے۔'' سطوت بیگم نے اُسے سامنے سے آتے دیکھ کر کہا۔
''امی مجھے شازمہ کی سالگرہ میں جانے کے لیے گفٹ لینے جانا ہے ناں عاشی کے ساتھ...... پلیز۔'' حنا نے عذر تلاش کیا۔
''شاہ میر کو میں نے گاڑی کی چابی دی ہے اس کے ساتھ چلی جانا، اُسے بھی کچھ شاپنگ کرنا ہے۔'' سطوت خانم نے کہا۔
''نہیں امی، آپ چلی جائیں میں نہیں جا رہی۔'' سطوت نے کندھے اچکائی حنا کو اس کے اس جملے پر گھورا۔ شاہ میر آ چکا تھا سامنے......
اس بار وہ بمشکل موڈ بنا کے آیا تھا کہ وہ حنا سے اچھے تعلقات رکھے گا۔ شمیل بھائی امریکہ جانے والے تھے اور فیصل بھی اپنی پڑھائی میں مصروف تھا، لیکن حنا نے تو شاید دل میں کچھ اور ہی ٹھان رکھا تھا۔
''او کے...... میں چائے بنا دیتی ہوں۔ کباب بھی فرائی کر دیتی ہوں۔'' حنا کو سطوت خانم کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اب شازمہ کی سالگرہ میں بھی جانے کی اجازت نہ ملے گی۔
''مجھے عادت ہے میں خود چائے بنا سکتا ہوں خالہ جانی، آپ حنا کو کیوں روک رہی ہیں۔'' اس نے کچن کی طرف قدم بڑھائے۔
''ارے نہیں شاہ میر بھائی، آپ تو فوراً ہی جذباتی ہو جاتے ہیں میں ابھی دو منٹ میں لائی۔ پلیز آپ اپنی خالہ جانی کے ساتھ بیٹھ کے ڈرامہ دیکھیں۔'' حنا کا انداز شاہ میر کا دل ہی جلا گیا۔
وہ قریب آتے آتے ہمیشہ اس سے دور ہو جاتا وہ اس کو ناپسند تو نہ کرتا تھا لیکن اس کی خود پسندی اسے ہمیشہ اس سے انتقام لینے پر اُکساتی، جس کا احساس شاید دونوں کو ہی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

''حنا...... برا نہ مانو تو موبائل کی کبھی جان بھی بخش دیا کرو، اگر تمہارا ملازم ہوتا یہ تو نوکری چھوڑ جاتا۔ ویسے بھی لڑکیوں کا اتنا زیادہ باتیں کرنا مناسب نہیں لگتا۔'' اس نے چلتے چلتے رائے دی۔
''جی درست خیال ہے آپ کا، آپ کے انداز میں جینا ہی زندگی ہے، ورنہ تو بندہ خودکشی کر لے، آپ کے نزدیک بہترین تفریح فلم دیکھنا ہے، اُف تین گھنٹے ایک ہی کرسی پر بندہ بیٹھ کے گزارے۔'' اُس نے بھی جواب دینا ضروری سمجھا۔
''نہیں آپ کوئی بہتر کتاب بھی پڑھ سکتی ہیں۔'' شاہ میر نے مسکرا کے کہا۔
''اگر آپ عشرت خالہ کے بیٹے نہ ہوتے تو

میں آپ کو ایک لمحہ بھی برداشت نہ کرتی۔'' اس کی خوبصورت آنکھوں میں غصہ تھا۔

''اوہ تو آپ کا خیال ہے اب آپ ایسا نہیں کر رہی ہیں۔'' وہ اس کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔

''آپ چاہتے کیا ہیں؟'' وہ بے بسی سے بولی۔

''اتنی جلدی بتانا مشکل ہے جلد بازی سے معاملات بگڑ بھی جاتے ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر چل دیا۔

حنا کا جی چاہا پاس سے ٹیبل لیمپ اُٹھا کے اس کے سر پر دے مارے اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

☆......☆......☆

''غصہ حرام ہے۔'' وہ شام کو اپنا پسندیدہ چینل لگائے گانے سن رہی تھی کہ وہ پیچھے سے نہ جانے کب ٹی وی لاؤنج میں گنگناتا گزر رہا تھا۔ آواز اچھی خاصی تھی جس میں شاعری کے تڑکے لگانے میں ماہر تھا...... وہ بے اختیار ہی متوجہ ہو گئی تھی۔

غصہ حرام ہے
کیوں نہ سیکھیں ایسے کام
جس پر رب کا انعام ہے

''اونہہ بچوں جیسی شاعری۔'' وہ بڑبڑائی۔

''بات بچوں والی نہیں ہے غور کیجیے گا۔ شاید کام آئے تو دل سے دعا نکلے۔'' وہ سامنے آ کے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''میں ایک وقت میں ایک ہی پروگرام دیکھنے کے موڈ میں ہوں۔'' اس نے والیم بڑھا دیا۔

''Live پروگرام کی اپنی بات ہے آپ چھوڑیں۔ اس کی آواز سلو کر دیں یہ تو کسی وقت بھی دیکھ کے آپ بور ہو سکتی ہیں۔'' اس کی مسکراہٹ اُسے زہر لگتی اوپر سے ہر وقت آپ جناب!''

''کیا مسئلہ ہے؟'' وہ بے اختیار چیخی۔

''آہستہ...... آہستہ چیخ کے بولنے سے گلا تو خراب ہوتا ہے اچھی خاصی صورت بھی خوفناک دکھائی دیتی ہے۔'' اطمینان سے صوفے پر تشریف فرما ہوا۔

''آپ کب تک واپس جائیں گے؟'' اس نے بےزاری سے پوچھا۔

''آپ تشریف رکھیں یہ بات بیٹھ کر ہی سمجھائی جا سکتی ہے ناں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''سمجھوتہ ترین آپ ہی چلائیں۔ مجھے معاف رکھیں۔'' اس نے موضوع سے خود کو بچانے کے لیے...... قدم آگے بڑھا دیے۔

''کوئی دلچسپی نہیں آپ سے...... پلیز۔'' وہ بڑبڑائی۔

''خوش فہمی بھی بہت ہے محترمہ۔'' شاہ میر نے میٹھے لہجے میں سخت بات کر دی۔

اور پھر شاہ میر نے بھی کچھ سوچ کر رخت سفر باندھ لیا۔

☆......☆......☆

کل رات سے کومل بار بار خواب میں آ رہی تھی۔ وہ امی جان کی خاطر کب تک اس بدمزاج میزبان کے ساتھ گزارتا۔ خالہ جان کو بھی ایک ہی شوق تھا۔ کہ آتے جاتے اُسے کہتیں۔

''میر میرا بہت دل چاہتا ہے تم اور تمہاری فیملی مل کے پاکستان میں رہیں۔ اب بھلا ضروری تھا کہ ان کی محبت میں وہ دونوں بھی محبت کے جھولے جھولنے لگیں۔ یہ تو زیادتی ہی تھی ناں اور وہ سمجھوتہ کر بھی لیتا ماں کی خاطر۔ لیکن حنا کے تو مزاج...... ساتویں آسمان پر رہتے، اسے تو پاکستان کی محبت سے زیادہ امریکہ کی محبت تھی۔ اس کا خواب تو شاید ڈیوڈ یا مائیکل ٹائپ کوئی بندہ

تھا جو لا کھ نام سے فہد یا فیصل ہو مزاج مائیکل ہی ہوگا۔ اس نے لکھنؤ واپسی کا سفر پھر سے اختیار کیا۔ خالہ جان کے آنسو بھی اس کا راستہ نہ روک پائے۔

رخصتی کے وقت اس کا خیال تھا حنا شرمندہ تھی، لیکن یہ بھی اُس کا ہی خیال تھا۔ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''خالہ جان سے کہیے گا وہ میری شادی پر کراچی ضرور آئیں۔ لیکن آپ تو وہیں رُک جائیے گا کیونکہ آپ کو تو ذرا ڈھولک، گانے بجانے سے بےزاری ہوتی ہے ناں، ڈانس وغیرہ بھی۔'' آنکھوں میں تحقیر تھی۔

''جی جی کوشش ہوگی کہ آپ کی خواہش فرمائش پر اپنی پیاری امی جان کو راضی کرسکوں۔'' شاہ میر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''وہ میری خالہ جانی ہیں۔'' وہ اترائی۔

''اوکے اللہ حافظ۔'' شاہ میر نے مسکرا کر خدا حافظ کہا۔

☆......☆......☆

''اس بار تو حنا نے واقعی سچ ہی کہا تھا اس نے اپنی پسند کے بندے کے لیے گھر والوں کو راضی کیا۔ کس طرح یہ وہ جان نہ سکا۔ نہ ہی اس نے امی کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی اور حالا پھر حالات نے بھی سطوت خانم کو مجبور کیا کہ وہ اپنی دلی خواہش کو دباتے ہوئے حنا کو کسی اور کا ہوتے دیکھ سکیں۔ یوں حنا کی اشعر سے لو میرج دکھی دل کے ساتھ ارینج ہو کے طے پا گئی۔ نظر انداز ہونے کے دکھ سے تو وہ آشنا تھا اب ریجیکٹ ہونے کے بعد اس نے مکمل توجہ پڑھائی اور کوثر کی طرف کرلی اور شاید یہ ہی اس کی بہتری کی راہ تھی۔

زندگی وقت کے ہاتھوں اُسے کٹھ پتلی بنا کے اپنے کھیل کھیلتی ہی رہتی ہے۔

☆......☆......☆

اُن ہی دنوں سطوت خالہ بیوہ ہوگئیں اور پھر وہ سب امریکہ منتقل ہوگئے، حنا نے امی کے ساتھ بات چیت کرنا جب سے شروع کی تھی۔ امی بہت ہی خوش رہنے لگی تھیں۔ اس کی ایک پیاری سی بچی کی تصویر جب اسے امی نے دکھائی تو اسے بھی بےاختیار اس پر پیار آ گیا۔ نام تو سندس رکھا تھا۔ لیکن دیکھنے میں وہ بچی بالکل کوثر سی لگی۔ پتلی سی ناک والی، دبلی پتلی سی بچی، سہمی سہمی سی اور بالکل بھی یقین نہ آیا کہ وہ اس شوخ سی حنا کی بچی ہے جسے ایک پل چین نہ تھا اگر وہ اس کی سچ بتی' اپنی پیاری ماں سے نہ سنتا۔ شاہ میر کو اپنی ماں سے بہت پیار تھا کیونکہ پیار کے سارے رنگ اسے ماں سے ہی ملے تھے۔ وہ اب بھی حنا اور سطوت خالہ کے گن گاتے نہ تھکتی تھیں۔ آج بھی وہ ایک خط ضرور لکھتیں، اور کہتیں۔

''شاہ میر سطوت کو خط پوسٹ کردو۔'' شاہ میر بھی نہ کہہ پاتا کہ ماں اب خطوں کے زمانے گزر گئے۔ کیسے کہتا جب یقین ماں کا اتنا مضبوط دیکھتا۔ امریکہ جانے سے آسانی ہوگئی تھی وہ اکثر ہی اسکائپ پر بھی بات کرلیتیں۔ وہ جب بھی ان سے بات کرتا وہ موقع نکال کے سطوت خالہ کی باتیں کیا کرتیں۔ ایسی باتیں جو اُن کی آنکھوں کو روشن کرتیں۔

ابو بھی ریٹائرڈ ہو کے گھر میں ہی سارا وقت گزارتے، ان کی ساری عادتیں اپنی ماں جیسی تھیں۔ اس لیے امی کچن سے نکلتیں تو سلائی مشین سنبھال لیتیں کیونکہ ابو کو کرتا سفید رنگ کا ان ہی کے ہاتھ سے سلا اچھا لگتا۔ اور آج کے دور میں وہ اپنی پیاری سی ماں کو سر جھکا کے ابو کی فرمائشیں

پوری کرتے دیکھتا تو اس کا جی چاہتا..... کاش وہ ماں کو دنیا کے وہ رنگ بھی دکھا سکے جو اس نے چاہ کر بھی دل میں رکھے ہوئے تھے۔ خواب پورے نہ ہوں تو ان کی کرچیاں آنکھوں کے زخم بن جاتی ہیں۔ یہ ریاں' تھکن، گھٹن ماؤں کے مقدر کیوں بن جاتے ہیں۔ اب اکثر ہی اسے یہ خیال آتا تو حنا پر غصہ اور بڑھ جاتا۔

☆......☆......☆

آج کل وہ انٹرویو لیٹر پوسٹ کرنے کے بعد نوکری نہ ملنے کے غم سے دکھی ہوتا تو اسے پتا نہیں کیوں کومل کی جگہ اب اکثر خواب میں حنا نظر آنے لگی تھی۔ یہ وقت کیسے سرسراتا ہمارے اندر سے نئی کونپلیں نئی پیتریاں لگانے لگتا ہے۔ وہ موسموں کے ساتھ شاید پہلے والا شاہ میر بھی نہ رہا تھا اب اُسے غصہ بھی زیادہ آنے لگا تھا۔

کومل نے اس کی خاموشی سے تنگ آکر شاید ہتھیار ڈال دیے تھے اب وہ اس کی موٹر سائیکل کی آواز پر اپنی بالکونی میں بھی نہ آتی مایوسی کی کیفیت انتظار کو کیسے اقرار میں بدلتی ہے' یہ اسے اس دن پتا چلا جب امی نے اس کے ہاتھ میں شادی کا کارڈ تھماتے ہوئے کہا۔

''اچھی لڑکی تھی اگر حنا کو دلہن بنا کے لانے کا خواب دل میں نہ ہوتا تو میں اسے اپنی بہو ضرور بناتی۔ پر کیا کروں نہ تمہاری نوکری کا کچھ ہوا اور نہ ہی حنا کی جگہ میرے دل میں کوئی پر کرسکا۔ بالکل سطوت کی جوانی لگتی ہے اب تو' بس مزاج پھوپو پر ہے۔'' امی کی آہ اس رات دل میں درد کی لہر جگا گئی۔ اسے اپنی ڈگریوں سے شدید ترین نفرت ہوئی۔ بے روزگاری ایک ایسا کینسر ہے کہ جس کا علاج کم از کم ترقی پذیر ممالک میں نہیں ہے۔ روز کے سیاسی جھگڑے' حالات اسے بے روزگاری کے ساتھ ساتھ بے زاری کا بھی شکار کررہے تھے۔

وہ اب چائے اور سگریٹ کے ساتھ ڈپریشن کی دوائیں بھی لینے لگا تھا۔ کیا کرتا امی ابو کے مایوس چہروں پر خوشی لانے کے لیے زندگی مسکرا کے سہنی بھی تو تھی۔

☆......☆......☆

قسمت کے کھیل نرالے ہیں۔ اسے پچھلے سال کی خبر امی نے نہ جانے کیوں آج دی۔

''تم جانتے ہو حنا کے میاں کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی ہے نشے کا بہت عادی تھا۔ سطوت بہت رو رہی تھی۔ اسے اشعر کے بارے میں جب امریکہ گئی تو پتا چلا' حنا تو ایک عرصے سے جاب کر کے گھر چلا رہی تھی۔''

''اوہ..... تب ہی تو اس کی بچی بالکل بھی اس جیسی نہ تھی۔'' شاہ میر کے لبوں سے ایک ہی جملہ نکلا۔

''وہ بس بچی ہی کی وجہ سے رشتہ نبھا رہی تھی۔ ورنہ تو اشعر نے اس کا جینا حرام کردیا تھا۔'' عشرت کو بھانجی کا غم کھائے جا رہا تھا۔

''تمہیں تو بتائی بھی ناں کیونکہ تم تو پہلے ہی اس سے متنفر رہتے تھے۔ میری ہی خاطر اس سے دوستی کر لیتے تو وہ اشعر کی طرف تو متوجہ نہ ہوتی۔ سطوت نے بتایا تھا تم دونوں کی ایک منٹ کے لیے بھی نہیں بنتی تھی۔'' اُن کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''اب آپ ایسی باتیں تو نہ کریں ان کے اور ہمارے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے امی جان' اس کی کبھی بھی خواہش نہ تھی کہ وہ رخصت ہوکر لکھنؤ جیسی جگہ پر آئے۔ اس کے اپنے خواب تھے سچ پوچھیں تو نانا ابو نے اپنے بھائی کی چاہ اور محبت میں آپ کو دیس نکالا دے دیا اور جو پردیسی

ہو جائے اسے پھر دیس کی مٹی راس نہیں آتی۔'' شاہ میر کے لفظوں میں آج تلخی تھی۔

'' جانتی ہوں شاہ میر...... محبتوں کے قرض' کبھی کبھی اتارنے میں زندگی کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن انسان کی فطرت محبت سے گندھی ہے...... محبت سے...... یہ یاد رکھنا...... محبت ہی ہر رشتے کو مضبوط کرتی ہے۔ ماں کی بات یاد رکھنا۔'' وہ دودھ کا گلاس رکھتے ہوئے دہراتی رہیں۔

☆......☆......☆

آج اس کے انٹرویو کی Date تھی۔ وہ پُرامید تھا اسے یقین تھا کہ اس کی کوالیفکیشن کے مطابق اس جاب پر اس ہی کا حق تھا۔ لیکن اس کا نمبر سب سے آخر میں آیا۔ اس سے پہلے آنے والے کمپنی کے منیجر کے رشتے دار تھے۔ وہ پھر ناکام لوٹ آیا۔ قدم آج بھاری ہو رہے تھے شاید وہ تھک رہا تھا۔

'' کیا ہوا شاہ میر کیوں ایسے آکے لیٹ گئے۔ آج تو تمہاری پسند کا مٹر قیمہ بنا ہے۔ باجی نے کل ہی کمیٹی کے دس ہزار دیے تھے۔ اب تو تمہارے ابا بھی پوچھنے لگے ہیں کہ کیا ہوا نوکری کا۔'' انہوں نے بھی سارے سوال آج ہی کرنے تھے۔

'' اگر نوکری ہو جاتی تو یوں سر جھکا کے تو نہ لوٹتا ناں۔'' اس نے جواباً سوال کر ڈالا۔

'' کوئی بات نہیں مل جائے گی۔ پتا ہے سطوت حنا کے ساتھ یہاں آنے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ اس کے پاس امریکن نیشنلٹی ہے ناں آنا آسان ہے اس کا۔'' امی آج خوش تھیں' تب بھی سوال جواب ہو رہے تھے۔

'' اچھا...... حنا کا دل لگ جائے گا اب تو وہ امریکن بھی ہو چکی ہے۔'' شاہ میر کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

'' بہت بدل گئی ہے دیکھو گے تو یقین بھی نہیں آئے گا۔ بچی بھی ساتھ آرہی ہے۔ چار سال کی ہوگئی ہے ماشاء اللہ' مجھے تو سوچ کر ہی خوشی ہو رہی ہے۔ سوچ رہی ہوں کل سے مشین لے کر بیٹھوں' اس پر موٹر لگا دینا' تمہارے ابو کے تو ہاتھ کانپتے ہیں ناں۔ وہ بھی خوش ہیں۔ ان کے آتے پڑ بیٹوں کا تو کبھی دل نہ چاہا خالہ سے ملنے کو' حنا نے ہی ماں سے کہا ہے کہ چلیں عشرت خالہ سے ملنے چلتے ہیں۔ تم اب پہلے کی طرح جملے نہ دینا...... وہ تو پہلے والی حنا ہی نہ رہی جو ہنستی تھی تو پیار آتا ہے۔ اب تو دھیمے سے مسکراتی ہے۔ ماں کی آواز میں خوشی تھی۔

'' آپ کی طرح۔'' وہ ایک دم شوخ ہوا۔

نئے پودے' نئے موسم' خوشیوں کی نوید لاتے ہیں۔ آج ہی تو کسی نے فیس بک پر یہ اسٹیٹس شاید مین شن کیا تھا۔ اور اس کے دوست نے جو فیس بک سے ہی شاہ میر کو ملی تھی۔ ایک خوبصورت شعر کے ساتھ اس نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے لکھا تھا۔

'' جاتے ہوئے سال کا غم نہ دل میں رکھنا۔''

'' اجنبی دوست کے لیے...... نیا سال مبارک ہو۔''

'' جاتے دسمبر کے سارے دکھ آتشداں میں ڈال دیں کیونکہ...... وقت بدلتا ہے...... ہمیں بھی تو بدلنا چاہیے۔''

دلی ہو کہ لاہور' کوئی فرق نہیں ہے
سچ بول کے ہر شہر میں ایسے ہی رہو گے

اب آپ بھی تو سمجھدار ہیں...... اور شاہ میر بھی...... تو بھلا حنا کی آمد اس کے اندر خوشبو جیسے لمحے کیوں نہ بیدار کرتی...... دل تو ہے دل ناں......!''

☆......☆......☆

لوٹر ائی اینگل

سارا قصور انابیہ کا ہے۔ جب یہ کہہ رہی تھیں مجھے گاؤں گھمانا ؤ تو لے جانا چاہیے تھا نا۔ میں اتنا بھی خونخوار نہیں ہوں کہ میری وجہ سے جانے سے انکار کرتی رہی۔ غصے میں آ کر اکیلی نکل گئی تھیں اور راستہ بھٹک گئیں۔ صد شکر میں اسی سمت نکلا ہوا تھا تو......

''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے مام!'' اس نے جھنجلا کر چھری کانٹے کی مدد سے چکن لیگ کو بھنبھوڑا۔ گویا مما پر آیا غصہ اس پر اُتار رہا تھا۔ ٹشو کی مدد سے اس نے لبوں کے کونوں کو مدھم سا دبا کر ٹشو کو واپس پلیٹ میں پٹخ دیا۔ وہ صرف طرحدار نہیں تھی۔ بہت اعلیٰ ذوق کی مالک اور کسی حد تک مغرور اور خود پسند بھی تھی۔ وہ خوبصورت تھی بلکہ بے حد خوبصورت تھی جبھی اہمیت و خاصیت کے ساتھ ہر جگہ توصیف، ستائش سے بھی نوازی جاتی۔ یہ اس کا ذاتی خیال تھا کہ اس کی خوبصورتی کا حق تھا تعریف وصول کرنا۔ وہ مغرور اور بے نیاز تھی جبھی اپنے آگے کسی کو کم ہی کچھ گردانتی تھی۔ وہ تو انابیہ شاہ ہی تھی جو اس کے عشق جنوں خیز میں مبتلا ہو گئی تھی اور کچھ اس طرح اس کے عشق میں ڈوبی تھی کہ اس کی تھوڑی سی ہی سہی مگر کچھ نہ کچھ دیوانگی اس کے اندر بھی منتقل ہو گئی تھی۔ جس پر انابیہ بلاشبہ خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی اور اس کا کہنا تھا یہ سراسر اس کی دعاؤں کی قبولیت کا نتیجہ ہے۔

ان کی دوستی کا آغاز کالج سے ہوا تھا۔ دو سال ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ کی طرح گزر گئے تھے۔ انابیہ شاہ کا تعلق پنجاب کے جاگیردار گھرانے سے تھا جبھی وہ روایتی رسموں و رواج کی زنجیروں سے جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے برعکس حرمت یعنی حریم فاطمہ کے والد لاہور کے مشہور صنعت کار تھے۔ وہ صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ آفاق تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ گریجویشن کے بعد ہائر اسٹڈی کے لیے ڈیڈ حرم کو بھی ملک سے باہر بھیجنے کے خواہش مند تھے مگر اس موقع پہ آ کر جس کا صرف ڈیڈ کو ہی نہیں مام کو بھی انتظار تھا وہ انوکھی ضد لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ ہاسٹل میں انابیہ کے ساتھ رہ کر پڑھنے کی ضد...... جو کم از کم مام کو تو بالکل پسند نہیں آ سکی تھی۔

اک عام سی لڑکی (انابیہ شاہ) کے لیے اپنی بیٹی کا یوں دیوانہ ہو جانا انہیں ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ جبھی اعتراضات کے ساتھ ایک بحث چھڑ گئی

تھی۔

''حرج کیوں نہیں ہے۔ یہ ہمارا اسٹینڈرڈ نہیں ہے حرم کسی بھی لحاظ سے..... ہمارے خواب تمہارے متعلق، بہت اونچے ہیں تمہارے متعلق..... اپنا برائٹ فیوچر چھوڑ کر اک معمولی لڑکی کی خاطر یہاں ہاسٹل میں سڑنا حماقت نہیں تو پھر اور کیا ہے؟''

انار کے جوس کا سپ لے کر مما نے اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ کر ڈانٹنے کے انداز میں کہا تو حرم کی پیشانی پر بل پڑنے لگے تھے۔

''وہ معمولی لڑکی آپ کی بیٹی کی بیسٹ فرینڈ ہے مام! اس کے خاص ہونے کا سب سے اہم پوائنٹ ہی یہی ہے۔ اور ڈیڈ میں فی الحال صرف ہاسٹل جاؤں گی۔ بعد میں اگر موڈ بنا تو یو کے بھی چلی جاؤں گی۔'' اس نے اپنے مخصوص فیصلہ کن، دوٹوک اور قطعیت سے بھرپور انداز میں کہا تھا اور کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اپنی ذات کو فوقیت اور اہمیت دینے والی، اس کے نزدیک اپنی خوشی، اپنی ذات اور اپنے فیصلے بہت خاص تھے۔ وہ جا چکی تو مام کی طیش بھری نظریں جن میں واضح بے بسی تھی۔ ڈیڈ کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔ گویا اُن سے بیٹی کے رویے کی شکایت کر رہی ہوں۔ ڈیڈ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے محض کاندھے اُچکا سکے۔

☆......☆......☆

''آج ہم کالج سے واپسی پر مارکیٹ چلیں گے۔'' کلاس بنک کرکے وہ دونوں اس وقت کینٹین میں تھیں۔ حرم کے ہاتھ میں چیز برگر تھا ساتھ میں پیپسی کاٹن پیک...... انابیہ بھی یہی کھا رہی تھی۔ اسے ہمیشہ ہی ہر معاملے میں حرم کو فالو کرنا اچھا لگتا تھا۔ اتنی ہی متاثر تھی وہ حرم سے۔

''مارکیٹ؟ اب کیا لینا ہے یار؟ ابھی چند دن پہلے تو گئے تھے۔'' بازار کا سنتے ہی انابیہ کی جان ہوا ہونے لگتی تھی۔ حرم نے جواباً اسے گھورنا ضروری سمجھا تھا۔

''خبردار جو انکار کیا ہو۔ میرے کزن کی شادی ہے۔ مجھے اپنے سلور لہنگے کے ساتھ میچنگ جوتے چاہئیں جیولری بھی لوں گی۔ اور تمہارا وہ کھڑوس منگیتر ہر روز یہاں شہر کے وزٹ کو تھوڑی نکلا ہوتا ہے جو باہر نکلنے کا سن کر ہی منہ پہ ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔'' وہ اسے جھاڑنے لگی تھی۔ انابیہ کی کیا مجال تھی کہ انکار کر دیتی، منمنا کر کہا تو صرف اتنا......

''یار وہ پچھلی بار بھی انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا نا......''

''ہاں تو......؟ کہا تو کچھ نہیں تھا نا۔ الٹا تمہیں چائے پلوائے آئسکریم کھلانے کی آفرز کر رہا تھا۔ ویسے بڑی جھوٹی ہو تم انا...... ہر وقت اس کی بے حسی اور لاتعلقی کے رونے روتی رہتی تھیں اور......'' وہ اُسے گھورنے لگی۔ انابیہ بری طرح سے جھینپی تھی۔ پھر گویا اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

''رئیلی...... قسم سے یار! اس دن تو خود انہوں نے اپنے رویئے سے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ تو حویلی میں بھی مجھ سے بات نہیں کرتے زیادہ، آمنا سامنا ہونے پر بھی اگر میں سلام کر دوں تو سرسری انداز میں جواب دے دیں گے۔'' انابیہ کے لہجے سے پھر سے حیرانی چھلک پڑی تھی۔

''اونہہ نخرہ، اچھی بھلی لڑکی کو اگنور کرکے وہ ثابت کیا کرنا چاہتا ہے۔ اتنا تو عام سا ہے۔ اجڈ اور دیہاتی سا، میں تو کہتی ہوں شادی سے انکار کر دو اُس سے۔'' حرم کے پاس ایسے مفت کے مشورے وافر مقدار میں جمع رہا کرتے تھے۔ جبکہ

انابیہ تو تڑپ اٹھی گویا۔

''ایسے تو نہ کہو حرم! اتنے تو ہینڈسم ہیں وہ...... ہمارے پورے گاؤں کی لڑکیاں مرتی ہیں دانی پہ، یہ ہے بھی حقیقت اس جیسا خوبرو کڑیل اور شاندار کوئی دوسرا نوجوان نہیں ہے پنڈ میں۔'' وہ اس کی تعریفوں میں رطب اللسان ہوئی تو حرم نے بے زاری سے سر جھٹک دیا تھا۔ انابیہ سے دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں بیتا تھا۔ تب اس کی پہلی بار بالکل اتفاقیہ دانیال سے ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ انابیہ سے نوٹس لینے ہاسٹل آئی تھی۔ اُس کے لیے نوٹس ہمیشہ انابیہ ہی تیار کرتی تھی۔ جب سے اُن کی دوستی ہوئی تھی انابیہ نے عقیدت مندانہ انداز میں یہ کام از خود اپنے ذمے لے لیا تھا۔ وہ تو اسے ہاسٹل آنے کی بھی زحمت نہیں دیا کرتی تھی مگر اس روز وہ نوٹس لانا بھول گئی تھی۔ جبھی حرم کو اس کے ہاں مجبوراً ہاسٹل آنا پڑا تھا۔ واپسی پر دونوں باتیں کرتیں ہاسٹل کے گیٹ تک آگئی تھیں کہ ایک دم حرم نے اُسے بڑی طرح سے گھبراتے اور سٹپٹاتے دیکھا تھا۔

''کیا ہوا یار؟ جنگل میں شیر دیکھ لیا؟'' اس کے کھنکتے شوخ لہجے میں شرارت تھی۔ انابیہ کا فق چہرا اسے مذاق پر اُکسا رہا تھا۔

''یہی سمجھ لو شیر، وہ بھی خونخوار، یار یہ ابھی اس اس گستاخی پر مجھے سالم نگل جائیں گے۔ انہیں میرا یوں بے مہار باہر آنا پسند نہیں۔'' وہ اس کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتی روہانسی ہوکر بولی تھی۔ دانیال کی نگاہ اس پر پڑ چکی تھی۔ اس کی ہر قسم کی افی شینسی بھی اب کسی کام نہیں آسکتی تھی۔ انابیہ کی حالت خوف سے پتلی ہوتے دیکھ کر حرم نے بے اختیار گردن موڑی تھی۔ گرے چمچاتی پیجارو کے کھلے دروازے سے ٹیک لگائے سفید کاٹن کے کھڑ کھڑاتے لباس میں ملبوس بڑی بڑی مونچھوں والا وہ خالص دیہاتی نوجوان انہی کی سمت متوجہ تھا۔ اس کی خوفناک سی سرخ آنکھوں میں یقیناً غصے کی ہی لالی تھی۔ اونچا لمبا دیہاتی قد کاٹھ لیے وہ بہت غصیلا ہی نہیں خود پسند اور تند خو بھی محسوس ہوا تھا حرم کو جبھی وہ کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔

''اوہ......! تو گویا آپ ہیں منگیتر اُس کے......؟'' دانیال کا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد وہ کسی قدر نخوت سے بولی تھی۔ اسے خود پر بہت زعم تھا اپنے پُراعتماد انداز پر بے حد ناز، اس کا خیال تھا وہ اپنے مقابل آنے والے ہر انسان کو کنفیوز کرسکتی ہے۔ اس کا یہ خیال غلط بھی نہیں تھا۔ وہ صرف پُراعتماد نہیں تھی۔ اس کے پاس دولت تھی ذہانت تھی قابلیت تھی۔ وہ واقعی اپنے سامنے کسی کو ٹھہرنے نہیں دیا کرتی تھی۔ یہی زعم اس وقت دانیال سے بات کرتے ہوئے بھی اس کے لہجے سے، اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ دانیال نے جواب دینے کی بجائے محض نگاہ بھر کے اس بے حد فیشن ایبل لڑکی کو دیکھا تھا۔ جس کے ہر انداز سے خود اعتمادی چھلکتی تھی۔

''ہاں...... آپ کو اعتراض......؟''

اس کا انداز جواباً تحقیر آمیز ہی نہیں تلخ و ترش بھی تھا۔ حرم نے اسے از سر نو سرتاپا جانچا پھر زور سے ہنس پڑی تھی۔

''اگر میں کہوں مجھے اعتراض ہے تو آپ انابیہ سے شادی نہیں کریں گے؟'' اس جواب نے مقابل کو صرف ٹھٹکایا نہیں تھا۔ غم و غصے و توہین کے احساس سمیت اس کی آنکھیں بھی سلگا کے رکھ دی تھیں۔

''اگر میں کہوں ہاں اور اس کے بدلے میں، میں آپ سے شادی کروں گا تو آپ کو اعتراض کا

بھی حق نہیں ہوگا۔'' جواب تھا یا طمانچہ، حرم تو جیسے ہل کر رہ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے اس سے یوں نہ صرف پنگا لیا تھا بلکہ پہلی ہی بار میں زمین پر پٹخ دیا تھا۔ اس عزت افزائی پر آنکھیں دہک کر انگاروں کی مانند سلگنے لگیں۔

''شٹ یور ماؤتھ دانیال شاہ! تم ہو کیا چیز ہاں؟ کبھی آئینے میں شکل دیکھی ہے دھیان سے؟'' وہ پھٹ پڑی تھی اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ انابیہ کے تو اوسان خطا ہونے لگے۔ پھر بڑی مشکلوں سے وہ اسے کھینچ تان کر وہاں سے لے کر گئی اور منت سماجت کر کے کتنی دقتوں سے اس کا موڈ بحال کیا تھا۔

''جاہل، اِل مینرڈ، گھٹیا، وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟'' اس کا غصہ کسی طور بھی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

''حرم تمہیں انہیں کچھ کہنا ہی نہیں چاہیے تھا یار۔'' انابیہ بیچاری بری پھنسی تھی۔ ہاتھ مسلتے ہوئے مضطرب لگ رہی تھی ابھی دانیال سے پتہ نہیں اسے کس انداز میں بے عزت ہونا تھا۔ اسے صرف حرم کے موڈ کی نہیں دانیال کے مزاج کی برہمی بھی سہنی تھی اور یہی اصل تشویش کا باعث تھا اس کے لیے......

''تم ٹھیک کہتی ہو، مجھے اس تھرڈ کلاس آدمی کے منہ ہی نہیں لگنا چاہیے تھا، ڈیم اٹ۔'' اس نے تو یہ بات یہاں ختم کر دی تھی۔ مگر یقیناً دانیال نہیں کر سکا تھا۔ اس بات کا اندازہ وہ بہت بعد میں جا کر لگا سکی تھی۔

☆......☆......☆

حالانکہ اگلی ایسی ہی اتفاقی ملاقات میں وہ بہت شائستگی سے اس کے ساتھ معذرت کر چکا تھا۔ اس بار ان کا ٹکراؤ مارکیٹ میں ہوا تھا۔ انابیہ کو زبردستی ساتھ گھسیٹتی وہ ونڈو شاپنگ میں مصروف تھی جب ایک دکان سے نکلتے ہوئے اس کا دانیال سے تصادم ہوگیا تھا۔ حرم کے ہاتھ سے اس ٹکراؤ کے نتیجے میں شاپنگ بیگ چھوٹ کر نیچے جا گرے تھے۔

''تم......؟'' اسے روبرو پا کے وہ آنکھیں نکال کر غرائی تھی۔

''اوہ...... آئی ایم سوری۔'' وہ اچھا خاصا گھبرا گیا، پھر جھک کر شاپنگ بیگز اُٹھا کر بہت احترام بھرے انداز میں اس کی جانب بڑھا دیے۔

''آگین سوری مس حرمت! کیسی ہیں آپ؟'' حرم کے گھورتی نظروں کے جواب میں اس نے مسکراہٹ دبائی تھی۔ حرم نے جھپٹ کر اس سے اپنا سامان لیا تھا۔

''اپنی ڈیئر فرینڈ سے میری سفارش کر دیں نا پلیز۔'' جس وقت وہ بوکھلائی ہوئی انابیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ کھینچتی آگے بڑھ گئی تھی۔ دانیال نے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ایک دو قدموں میں ہی اُسے آن لیا تھا اور اتنی لجاجت سے بولا تھا کہ انابیہ تو گنگ ہو کر رہ گئی تھی جیسے، حرم کے چہرے پر نخوت سی چھانے لگی۔

''دیکھیں مسٹر! خوامخواہ کمبل ہونے والے لوگ مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔'' اس نے جتلانا بے حد ضروری سمجھا تھا۔ دانیال نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھ کر سر کھجایا۔

''مگر میں آپ سے بگاڑ بھی نہیں سکتا۔ پلیز سمجھیں مجبوری ہے میری۔'' اس کا لہجہ ہی نہیں انداز بھی یکسر بدلا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خود کو بہت چالاک اور سمجھدار سمجھنے والی حرم مرد کے چلے اس داؤ میں آتی چلی گئی تھی۔

''مجبوری اور وہ بھی آپ کی؟'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا اور کسی حد تک خفا بھی، جواب میں دانیال نے زور دار قہقہہ لگایا تھا۔

''سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے، جانتا ہوں میں.....'' اور حرم جو اسے گھور رہی تھی کسی طرح بھی مسکراہٹ نہیں دبا سکی تھی۔

''لیکن میں آپ کی سالی نہیں ہوں۔ آپ کی ہونے والی بیوی کی سہیلی ہوں۔'' اس نے ٹوکتے ہوئے تصحیح کی۔ دانیال نے کاندھے جھٹکتے ہوئے اس پل بہت گہری اور جانچتی نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''جو بھی ہے میرے لیے بہت اہم ہے۔''

''کون انابیہ؟'' حرم کے انداز میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ جواب میں دانیال کی آنکھوں میں کچھ لمحوں کو سہی مگر عجیب سی تپش اُتر آئی تھی۔

''آپ کے اس سوال کا جواب میں کسی اور وقت کے لیے اُٹھا کر رکھ رہا ہوں۔'' اس کی نظروں کے ساتھ اس کے لہجے میں بھی آنچ اتر آئی تھی۔ جسے حرم محسوس کیے بنا ہنس پڑی تھی۔

''چلیں ٹھیک ہے، بیگم سے رونمائی کے وقت کہہ دیجیے گا۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔''

دانیال نے بہت فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے سینے پر ہاتھ باندھ کر گردن کو ذرا سا خم دیا۔ یوں اس تلخی اور چپقلش کا خاتمہ ہوگیا تھا جو پہلی ملاقات سے پیدا ہوئی تھی۔ مگر وہ تلخی کیا واقعی اتنی آسانی سے ختم ہوگئی تھی کیا اتنی آسانی سے تلخیاں ختم ہوجایا کرتی ہیں۔ اس بات پر حرم نے غور کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ دانیال انہیں آئس کریم کھلانے یا پھر کافی پلانے پر اصرار کرتا رہا تھا مگر حرم پر عجلت سوار تھی۔

''ڈیو رہی آپ پر، پھر بھی سہی، اور سنیں آپ یہ اپنی بھاری بھرکم مونچھیں کٹا دیں تو یقیناً کچھ بھلے لگیں گے ہمارے مذہب میں بھی مونچھیں رکھنا جائز نہیں ہے او کے؟'' وہ جاتے جاتے بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آئی تھی مگر اگلی بار ملاقات میں جب اس نے دانیال کو مونچھوں کے بغیر دیکھا تو حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''بڑے فرمانبردار شوہر ثابت ہوں گے آپ تو قسم سے۔'' وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنسے گئی تھی۔ جواباً دانیال کی ہلکی سرخی لیے گہری اور پرتپش نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

''شکر ہے آپ کو یقین تو آیا غور کریں جلدی ہے۔''

''یہ تو انابیہ کا کام ہے۔ میں تو ابھی سمجھاتی ہوں اسے کرلے غور، مگر بے چاری مشرقی لڑکی ہے ایک ہی کھونٹے سے بندھی رہ کر بھی خوش ہے۔''

دانیال کی بات کی گہرائی اور ذومعنیت کو سمجھے بغیر وہ اپنی ہانکے گئی تھی۔ انابیہ کے ہاتھ دبانے کے باوجود، دانیال نے اس جواب پر ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے۔ یوں جیسے خود پر ضبط کررہا ہو۔

''ان چھٹیوں میں آپ انابیہ کے ساتھ ہمارے ہاں آکر ٹھہریں نا۔'' دانیال نے خاصی تاخیر سے اسے مخاطب کیا تو اس کا لہجہ و انداز ایک بار پھر متوازن ہوچکا تھا مگر اس آفر کے جواب میں حرم کے چہرے پر تمسخر سا پھیلتا چلا گیا۔

''آپ کے گاؤں؟ اتنی گرمی ہوگی وہاں، میرا ابھی سے مرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ ویسے بھی میں سمر ویکیشن یوکے میں گزارتی ہوں ہمیشہ۔'' اس کے لہجے میں پھر وہی نخوت بھر گئی تھی جو اس کی ذات کا خاصا تھی۔ دانیال کے چہرے

پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''زیادہ نہ سہی چند دن کو آ جانا حرم! ویسے بھی ہمارے ہاں ہر قسم کی سہولتیں ہیں۔ تمہیں گرمی نہیں لگنے دیں گے پر اس۔'' انابیہ پُرجوش ہو کر اصرار کرنے لگی تھی۔ حرم کو جان چھڑانے کو سہی مگر حامی بھرنی پڑی۔

☆......☆......☆

''مجھے لگتا ہے دانیال سے تمہاری دوستی ہو گئی ہے۔ پھر اب کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟'' اس نے اپنی ضد پوری کر لی تھی۔ اور انابیہ کی خاطر گھر کا سکھ آرام چھوڑ کر اس کے پاس ہاسٹل آ گئی تھی۔ انابیہ کی خوشی کا تو ٹھکانہ تھا ہی کہاں..... جو فخر تھا وہ اسے ہواؤں میں اڑاتا تھا۔ پتہ نہیں اسے حرم میں ایسا کیا نظر آتا تھا کہ یوں اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی تھی۔ حرم نے جو یہ محبت کا معمولی ثبوت دیا تھا اس کی وجہ ہی اس کی محبت کے احساس کو تقویت دیتا تھا۔ بہر حال وہ محبت کی قدردان تو ضرور تھی۔ مگر انابیہ کے لیے اس کے اس اقدام سے زیادہ خوشی کا باعث دانیال سے صلح تھی۔

''دوستی کہاں یار..... میں تو تمہاری وجہ سے اس کا لحاظ کرتی ہوں۔ ورنہ پسند، سند وہ مجھے اب بھی نہیں ہے۔ میری آفر ابھی بھی موجود ہے۔ انکار کر دو اس پینڈو کو، اپنے بے حد اسمارٹ اور گڈ لکنگ بھائی کے لیے تمہارا رشتہ مانگ لوں گی۔'' اس کے لہجے میں صرف شرارت تھی۔ انابیہ نے منہ لٹکا لیا تھا۔

''میری بھی آفر اپنی جگہ قائم دائم ہے۔'' اس نے کسی قدر ناراضی سے جتلایا تھا۔ جن دنوں ان کی دوستی کا آغاز ہوا تھا ان کی ایک دوسرے کے لیے محبت اور یگانگت کے مظاہروں کو تکتی ان کی ایک کلاس فیلو نے مذاق میں وہ بات کی تھی جسے بعد میں انابیہ نے دل پر لکھ لیا تھا۔

''یار ثناء کی بات قابلِ غور ہے۔ میں سوچ رہی ہوں، ہمیں ایک ہی آدمی سے شادی کر لینی چاہیے تاکہ ہم ہمیشہ ایک ساتھ رہیں۔''

انابیہ کی سنجیدگی سے کہنے پر وہ اتنا جھنجلائی تھی کہ ہاتھ میں موجود بھاری بھرکم کتاب ہی اس کے سر پر دے ماری۔

''دماغ درست ہے تمہارا؟ یہ محض مذاق کی حد تک ہی ٹھیک ہے بات..... شوہر شیئر کرنے کی چیز نہیں ہوتا۔''

''کیوں نہیں ہوتا؟ اسلام میں ایویں ہی مرد کی چار شادیوں کی اجازت ہے۔'' انابیہ چمک کر بولی تھی۔

''وہ عالی ظرف عورتیں ہوتی ہوں گی۔'' حرم نے بات ختم کرنی چاہی۔

''تمہارے معاملے میں، میں بہت اعلیٰ ظرف ہوں قسم سے۔'' انابیہ نے اب کے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں تو حرم اسے غصے سے آنکھیں دکھانے لگی تھی مگر وہ پرواہ کیے بغیر اپنے سوٹ کیس سے تصویروں والا البم نکال لائی تھی۔

''یار تم اک نظر دانی کو دیکھو تو ہمارے پنڈ کی ساری خوبصورت لڑکیاں اس گھبرو جوان پر مرتی ہیں۔'' اور جب اس گھبرو جوان کی حرم نے تصویریں دیکھیں تو کیسے بدک گئی تھی۔

''میں تو مر کے بھی ایسے آدمی سے شادی نہ کروں۔ خبردار جو آئندہ ایسی بات کہی ہو۔ اگر اتنا ہی میرے ساتھ رہنے کو مری جاتی ہو تو پھر اس پینڈو کو گڈ بائے کہہ دو۔ میں اپنے بھائی کی دلہن بنا لیتی ہوں تمہیں۔'' اب کے وہ سنجیدہ تھی جبکہ

انابیہ نے منہ لٹکا لیا تھا۔

''تمہیں دانی کا پتہ نہیں ہے نا اس لیے، جان سے مار دے گا وہ مجھے مگر کسی اور کا نہیں ہونے دے گا۔ پھر اس کا فائدہ بھی تو کوئی نہیں ہے نا یار۔ میرا دل تو تم سے لگا ہے مقصد تمہارے ساتھ رہنا ہے نہ کہ تمہارے گھر میں، تم سسرال سدھار جاؤ گی میں کیا کروں گی؟''

''چلو تمہاری خاطر میں شہریار کو گھر داماد بننے پر غور کر لوں گی۔ مجھے بہت پسند کرتا ہے شاید مان لے میری بات۔''

وہ ہنوز غیر سنجیدہ تھی اور شرارت آمیز انداز میں بات کر رہی تھی۔

''اگر میرے لیے کچھ کرنا ہی ہے تو پھر گھر کی بجائے دل میں گنجائش نکالو...... اپنے شہریار کو مجھ سے شیئر کر لو۔ دانی کو بھی صرف اسی صورت میں گڈ بائے کہہ سکتی ہوں۔'' انابیہ کے سنجیدگی سے کہنے پر حرم کی ساری چونچالی اور مذاق دھرا رہ گیا تھا۔

''تم اس قدر فضول بات بھی کر سکتی ہو انابیہ؟ آئی کانٹ بلیو اِٹ؟'' اور انابیہ اس کا اس درجہ شدید ردعمل دیکھ کر بری طرح سے خائف ہو کر رہ گئی تھی۔

'' مذاق کر رہی تھی یار! ریلیکس!'' وہ گڑبڑانے لگی۔

''مجھے مذاق میں بھی ایسی باتیں پسند نہیں ہیں انابیہ شاہ! تمہارے دل میں یہ گنجائش ہو تو ہو، میرے دل میں نہیں ہے بی کیئرفل نیکسٹ ٹائم!'' اس نے سختی سے کہا تھا اور اُٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

''اُف اتنا یونیک اور اسٹائلش ڈریس، کہاں سے لیا؟'' حرم کالج سے واپس لوٹی تو انابیہ کے بستر پر پڑی وہ شرٹ اُٹھا کر دیکھتے ہوئے اشتیاق اور ستائش یک بارگی اس کے چہرے و آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ یہ بلیک علاقائی ڈریس تھا۔ جس پر شوخ دھاگوں سے بہت خوبصورت ایمبرائیڈری کی گئی تھی۔

''بے جی نے بھیجا ہے، آج دانی دے کر گئے ہیں۔'' انابیہ آج طبیعت کی خرابی کے باعث کالج نہیں گئی تھی۔

''تو یوں کہو نا منگیتر صاحب تحفہ دے کر گئے ہیں، محبت کی نشانی۔'' وہ آنکھیں نچا کر بولی۔ انابیہ نے بے اختیار ٹھنڈا سانس بھر لیا۔

''تمہارے ایسے نصیب کہاں؟ لائے بے شک وہی تھے مگر بھیجا اُن کی اماں نے ہے۔ مجھے یقین ہے انہیں تو یہ بھی نہیں پتہ ہوگا اس بیگ میں ہے کیا، ویسے تمہارا بالخصوص پوچھ رہے تھے۔''

خلافِ معمول انابیہ کے لہجے میں اداسی تھی۔ جو آخری فقرہ بولتے پھر سے غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ ہلکی سی شرارت اور مسکراہٹ نے لے لی تھی۔

''مجھے تو سچی بات ہے یہ بندہ بہت گھنا اور خطرناک لگتا ہے، ذرا بچ کے رہنا اوکے۔'' شرٹ اپنے ساتھ لگا کر دیکھتی وہ شرارت سے بولی تھی۔ پھر ایک دم اسے دیکھنے لگی۔

''یار یہ ڈریس فیرویل پارٹی میں پہنوں گی اوکے؟''

''اتنا پسند ہے تمہیں تو رکھ لو یار یہ دیکھو اس کے میچنگ کے جوتے بھی ہیں۔'' انابیہ نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبہ برآمد کیا۔ جس کے کھلنے پر کڑھائی والا خوشنما رنگوں کا نازک سا جوتا سامنے تھا۔

''واؤ امیزنگ......'' حرم کی آنکھیں خوشی

سے جگر جگر چمکنے لگیں۔
اس نے فوری طور پر جھک کر اپنے جوتے کے اسٹریپ کھولے تھے اور اپنا دودھیا مخمل جیسا شفاف پیر جوتے میں ڈالا۔ جو ریشمی رنگین ڈوریوں سے مزین تھا۔ وہ عام سا جوتا جیسے ایک دم انمول ہو گیا تھا۔
''یار یہ تو لگتا ہے بنا ہی تمہارے لیے ہے۔ دیکھو ذرا کتنا اچھا ہے تم پر۔'' انابیہ نے دل سے تعریف کی تھی۔ وہ کھلکھلا اٹھی۔
''یار اپنے پاس ہی رکھو۔ میں بس اک بار پہنوں گی۔'' انابیہ کو اٹھ کر دونوں چیزیں اس کی الماری میں رکھتے دیکھ کر حرم نے بے اختیار ٹوکا تھا۔ وہ مسکرا دی۔
''نہیں تمہیں پسند ہیں اب یہ تمہاری ہیں۔''
''اتنی فراخدلی اچھی نہیں ہوتی ہے انابیہ۔'' حرم کا انداز ناصحانہ ہو گیا تھا۔
''میں صرف تمہارے معاملے میں فراخدل ہوں اور مجھے پورا یقین ہے تم کبھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔'' انابیہ کی محبت اس درجہ مان و یقین پر حرم مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

☆......☆......☆

ان کے ایگزامز ختم ہوئے تو تعطیلات شروع ہو گئیں۔
''تم میرے ساتھ چل رہی ہو نا؟'' انابیہ کی پھر وہی رٹ شروع ہو گئی اور یہ اصرار اتنا بڑھا تھا کہ حرم عاجز ہو کر رہ گئی تھی۔
''یار میں منع کر چکی تھی نا تمہیں۔'' اس نے بے زار ہو کر کہا تھا۔ وہ انابیہ کا دل رکھنے کو بھی اس کے گاؤں نہیں جانا چاہتی تھی۔
''ایسے تو نہ کہو حرم! بے جی بھی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے تو اُن سے انہی چھٹیوں کا وعدہ کر رکھا تھا۔ کتنی شرم آئے گی مجھے جب وہ یہ سوچیں گی کہ جس سہیلی کی میں اتنی تعریفیں کرتی ہوں وہ میری خاطر چند دن کو گاؤں بھی نہ آ سکی۔ محض اس لیے کہ وہ گرمی نہیں برداشت کر سکتی۔''
انابیہ کی مزید ایسی ہی باتوں کی وجہ سے حرم کو مجبوراً ہی سہی مگر حامی بھرنی پڑی تھی کہ وجہ اس موقع پر ہونے والی انابیہ کی بہن کی شادی بھی تھی جس میں انابیہ کا خیال تھا حرم کی شرکت بے حد ضروری تھی۔ ایک بار پھر اس کی مام سے شدید جھڑپ ہو گئی تھی جو انہیں اس کے گاؤں جانے کا اختلاف سے بحث سے شروع ہوئی تھی۔ ممی ہرگز بھی اسے یکسر انجان اور غیر لوگوں میں بھیجنے کو تیار نہیں تھیں۔
''انابیہ بھی تو ہمارے گھر آتی رہی ہے نا ممی! ہم نے کھا لیا اُسے؟'' وہ جس حساب سے چڑی تھی اتنے ہی غصے سے بولی۔
''وہ محض گھنٹے دو گھنٹے کو آتی رہی ہے یہاں، تم اتنے دنوں کو جاؤ گی، ہے کوئی تک یہ؟'' مام کے کہنے پر اس نے بے حد ناگواریت سے انہیں دیکھا تھا۔
''کیا ہو گیا ہے ممی! ویسے تو آپ بہت لبرل بنتی ہیں۔ مجھے اسٹڈی کو تنہا یو کے بھیج سکتی ہیں تو یہاں اپنے کنٹری کے ایک گاؤں میں فرینڈ کے ہاں کیوں نہیں۔'' اسے اب طیش آنے لگا تھا خوامخواہ کی اس فضول ضد سے۔
''وہ ایک یکسر مختلف بات ہے۔ پھر وہ لڑکا تم میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟ فیانسی کی فرینڈ سے اسے کیا لینا دینا۔''
ممی کے اعتراض پر اس نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ ممی شاید اُن کی وہ بات چیت سن چکی تھیں جو کچھ دن پہلے ان کے درمیان ہوئی تھی۔ جب

انابیہ اس کے گھر آئی تھی اور یہ بات ثابت کرنے پر مصر تھی کہ دانیال اس میں انوالو ہو چکا ہے۔

''کمال ہے ممی! حد ہے دقیانوسیت کی بھی، ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ میں اس کی وجہ سے نہیں اپنی دوست کی وجہ سے جارہی ہوں۔ (اس بندے میں ایسا کچھ بھی خاص نہیں کہ میں یہ حماقت کرتی پھروں)۔ اس نے تنفر سے سوچا تھا اور تلملا کر جتلایا۔

''تم ہاسٹل فرینڈ کے ساتھ ہی اتنا عرصہ رہی ہو۔ اب بس کرو یہ چونچلے مجھے پسند نہیں ہیں۔'' ممی کے جھڑک دینے پر وہ غصے میں آگئی تھی۔

''مجھے ہر صورت جانا ہے ممی! میں بتا چکی ہوں آپ کو، ڈیڈ سے میں نے بات کرلی ہے۔ انہیں آپ کی طرح اعتراض نہیں ہے۔'' پیر پٹخ کر کہتی وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اور گاؤں جانے کے ارادے سے ملازمہ سے پیکنگ کرانے میں مصروف ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

پختہ ہموار سڑک سے اُتر کر جیسے ہی گاڑی نیم پختہ دھول اڑاتی دورویہ درختوں کی قطاروں سے گھری سڑک پر آئی۔ زبردست جھٹکے لگنے لگے۔ شدید گرمی کا عالم جوبن پر تھا اور آگ برساتے سورج کو غالباً کچھ زیادہ ہی جلدی تھی کہ صبح دس بجے ہی سروں پر آکر چمکنے اور شعاعیں نوکیلی سوئیوں کی طرح زمین پر مارنے لگا تھا۔ گاڑی میں آن اے سی بھی جیسے اس پرتپش اور موسم کے آگے ہار مان چکا تھا۔ وہ اندر بیٹھی پسینوں میں ڈوبنے لگی تھی تو اس میں اس کے شاہانہ مزاج کی نزاکت کا عمل دخل زیادہ تھا۔

''اُف اتنی گرمی یار...... مرواؤ گی تم مجھے۔'' اس نے اپنے دوپٹے سے ہی خود کو ہوا دیتے ہوئے انابیہ پر آنکھیں نکالی تھیں جو مزے سے بیٹھی تھی اور بیرونی نظاروں میں مگن تھی۔

''اتنی بھی گرمی نہیں ہے، ویسے اگر آپ کو ساری زندگی انہی جگہوں پر گزارنی پڑگئی تو کیا کریں گی؟'' انہیں پک کرنے دانیال ہی آیا تھا اس کی آہ و بکا سن کر ویو مرر سے جھانکتی اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکیت اتر آئی تھی۔ جس پر ظاہر ہے حرم کا دھیان نہیں جاسکتا تھا۔

''میرا دماغ خراب ہے جو میں ایک جگہ پر زندگی گزاروں گی؟'' اس نے نروٹھے پن سے کہا تھا اور کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا گرد و غبار سے بوجھل ہوا کا گرم جھونکا اندر آیا اور اس کے چہرے کے ساتھ لباس کو بھی دھول مٹی سے بھر گیا۔ اس کی طبع و نازک پر جیسے سخت ناگوار گزرا تھا۔ اس نے کھٹاک سے پھر شیشہ بند کردیا تھا۔ انابیہ بری طرح ہنس کر لوٹ پوٹ ہورہی تھی۔

''تمہیں کس نے کہا تھا یہ کرنے کو۔'' وہ یونہی ہنستے ہوئے سرخ چہرے سے بولی۔ حرم نے غصیلی نگاہ سے اُسے دیکھنے پر اکتفا کرتے چٹکی سے پکڑ کر گرد سے اَٹا دوپٹہ اُتار کر سیٹ پر دھر دیا۔ نیوی بلو شرٹ کی ہاف سلیو سے جھانکتے اس کے سفید موی بازو اور راج ہنس جیسی گردن ایک دم نمایاں ہوکر جگمگانے لگی۔ دانیال کی نگاہ اس پر پڑی تو جیسے پلٹنا بھول گئی۔

اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ بہکے تو گاڑی ڈانوال ڈول ہوکر رہ گئی تھی۔

''اُف دھیان سے دانیال صاحب! لگتا ہے آپ ہمیں یہیں دفنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' حرم چیخ پڑی تھی۔ اس کی پیشانی سامنے سیٹ سے جاکر ٹکرائی تھی۔

''اگر اکٹھے جی نہیں سکتے تو مر ہی جانا

چاہیے۔'' انابیہ نے اس پر جھک کر سرگوشی کی تھی۔ حرم نے اُسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

''ایسا ارادہ ہے تو براہِ کرم مجھے گاڑی سے اُتار دو۔ پھر جو مرضی کرتے رہنا دونوں۔'' اس نے دانت کچکچائے تھے۔ انابیہ اتنا جھینپی کہ اسے دو تین اکٹھے ہی گھونسے دے مارے تھے۔

''بدتمیز...... میں اپنی اور تمہاری بات کر رہی ہوں ظالم لڑکی! نہ میرے منگیتر کو قبول کرتی ہو۔ نہ اپنے فیانسی کو مجھ سے شیئر کرنے پر آمادہ ہو۔ پھر جدائی تو نصیب بنے گی نا۔'' حرم ہنسے گئی تھی اور دانیال کی گاہے بگاہے خود پر اٹھتی اور پھر ٹھہر جانے والی نظروں سے بے خبر رہی تھی۔ اور اس بات سے بھی کہ اس کی نگاہوں کی تپش ہر لحہ بڑھتی جارہی تھی۔

☆......☆......☆

شام کا وقت تھا۔ فضا پرندوں کے پروں کی کاٹ سے بوجھل تھی۔ دور چلتے کولھو کی آواز بھی ماحول میں گونجتی تھی۔ فضا میں حبس تھا اور ہر سو غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ دوپہر سے پہلے وہ لوگ حویلی پہنچے تھے۔ حویلی ویسی نہیں تھی جیسی حویلیاں حرم کے تصور میں آباد تھیں یا جیسی اس نے عموماً ٹی وی پلے یا پھر موویز میں دیکھ رکھی تھیں۔ بڑے بڑے دالانوں اور برآمدوں والی جس کی دیواریں سنگ مرمر کی تو کھڑکیاں بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں یہ تو عام سی حویلی تھی جس کا صحن بہت وسیع تھا اور اس میں طرح طرح کے درختوں کی بہتات تھی۔ سرخ اینٹوں کے فرش پر انہی درختوں کے خشک پتے اڑتے پھرتے تھے جو آتے جاتے لوگوں کے قدموں تلے آکر چرمراتے تھے۔ جنہیں ملازمہ وقفے وقفے سے جھاڑو اُٹھا کر سمیٹتی مگر ہوا کے ایک تیز جھونکے سے آنگن پھر ایسے ہی بھر جاتا۔

درختوں کے نیچے چارپائیاں بچھی تھیں۔ جن پر حویلی کی عورتیں براجمان تھیں۔ روایتی ریشمی کپڑوں اور زیورات سے لدی پھندی تھیں۔ ان کے لباس موسم کی مناسبت سے نفیس اور خوشنما رنگوں کے تھے۔ ان میں دو بزرگ خواتین دانیال کی والدہ بے جی اور انابیہ کی ماں تھیں۔ جنہوں نے حرم کا خیر مقدم بہت تپاک سے پیشانی چوم کر گلے لگا کر کیا تھا۔ دو نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جن کا تعارف انابیہ کی بھابی اور بہن کے طور پر کرایا گیا تھا۔ دانیال اکلوتا تھا۔ اس وقت موسمی پھولوں کے کریٹ اور ٹوکرے وہاں موجود تھے اور دونوں نوجوان لڑکیاں اپنی نگرانی میں ملازمہ سے پھل دھلوا کر فریج میں رکھوا رہی تھیں۔ بزرگ خواتین گاؤں کی کچھ عورتوں میں گھری غالباً اُن کے مسائل سننے میں مصروف تھیں مگر یہ ساری مصروفیات حرم اور انابیہ کے پہنچنے پر ترک کردی گئی تھیں۔

''تیری شہرن سہیلی واقعی بہت سوہنی ہے انابیہ' میم ہے بالکل......!'' بے جی نے اپنے سادہ پُرخلوص انداز میں حرم کی تعریف کی تھی۔ اور انابیہ یوں خوش ہوگئی جیسے یہ حرم کی نہیں خود انابیہ کی ہی تعریف ہو۔

''ارے بے جی میم تو کچھ بھی نہیں ہے اس کے سامنے، یہ تو حور ہے جنت کی حور۔'' انابیہ نے ہنستے ہوئے اُن کی بات کو بڑھاوا دیا تھا۔

''سنا ہے جنت میں مردوں کو حوریں ملیں گی۔ مگر میں تو اس دنیا میں حور کا طلب گار ہوں۔'' اپنی تعریف پر وہ فخر سے گردن اونچی کیے زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ جب اس مدھم مگر معنی خیز سرگوشی پر ایک دم سے متحیر ہو کر پلٹی۔ دانیال اس سے کچھ فاصلے پر جھک کر اس کا بیگ رکھ رہا تھا۔

آنکھوں میں اتنی چمک تھی اتنی گہرائی تھی کہ حرم جیسی پُراعتماد لڑکی بھی اس پل کنفیوژ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس پر ذومعنی مسکراہٹ اچھال کر پلٹ کر چلا گیا۔ حرم اس کے بعد بھی کتنی دیر تک سنبھل نہیں سکی تھی۔ غصے کا شدید احساس اسے دانت اور مٹھیاں بھینچنے پر مجبور کرتا رہا تھا۔ اس کا دماغ دانیال کی اس لفظی جسارت پر سلگن کا شکار ہوتا رہا تھا۔ پھر کمرے میں آ کر نہا کے اور کپڑے بدل کر کھانا وغیرہ کھانے کے بعد کچھ دیر ستانے کو جب وہ بستر پر لیٹی تب بھی اس کے دماغ کی یہ سلگن کم نہیں ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا حرم! نیند نہیں آ رہی؟'' نیم تاریک کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک کی سرسراہٹ تھی۔ کھڑکیوں پر تنے ریشمی پردے اس سرسراہٹ کی زد میں ہولے ہولے ہلتے تھے جب اپنی جگہ پر لیٹی انابیہ نے اس کی بے چینی محسوس کر کے تشویش سے پوچھا تھا اور وہ پھٹ پڑتے پڑتے ایکدم سے ہونٹ بھینچ گئی تھی۔

''تھنک، نئی جگہ ہے نا، مجھے اجنبی جگہ پر ایڈجسٹ ہونے میں ذرا وقت لگتا ہے۔'' اس نے سارا طیش اندر دبا کر رسانیت سے کہا تھا۔ اسے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ دانیال کی کسی بھی کمینی حرکت میں بہرحال انابیہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ خود دانیال کا منہ توڑ سکتی تھی۔ اس نے خود کو تسلی دے لی تھی۔ مگر اس کی یہ خواہش شاید کبھی پوری نہیں ہونی تھی کہ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا اس میں حرم کے لیے قطعی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن وہ سارا دن بہت مگن رہی تھی۔ اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو چکا تھا کہ وہ وہاں رہ نہیں سکتی۔ اتنی اہمیت اور محبت اسے ہمیشہ سرشار اور مگن رکھتی تھی۔ سو اس وقت بھی مگن ہو چکی تھی۔ اس شام اس نے آنگن کی صفائی میں مشغول ملازمہ سے پانی کا پائپ لیتے ہوئے انابیہ کے لتے لینے شروع کر دیے تھے۔

''تم مجھے یہاں اپنی حویلی میں اس لیے لے کر آئی تھیں کہ یہاں قید کر دو۔ اپنے باغات کی سیر نہیں کرواؤ گی تو شادی میں بھی شریک ہوئے بغیر واپس چلی جاؤں گی۔'' مصنوعی خفگی سے کہتے اس نے پائپ کا رخ اس کی جانب کیا تھا اور پانی کی دھار سے اسے بھگو ڈالا۔ انابیہ تو بدک کر تیزی سے پرے ہٹ گئی مگر اسی پل وہاں آ جانے والا دانیال ضرور پانی سے شرابور ہو گیا تھا۔ حرم نے بوکھلا کر اسے دیکھا تھا پھر ایکدم خفت زدہ ہو گئی اور گھبراہٹ میں پائپ چھوڑ دیا۔

''سوری...... میں تو......'' اس نے بے ساختہ وضاحت دینی چاہی تھی۔

''اٹس او کے، تیار ہو جائیں، میں آپ کو باغات اور کھیتوں میں گھماتا ہوں۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ رُکے بغیر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ انابیہ نے متحیر نظروں سے پہلے اسے پھر حرم کو دیکھا تھا۔

''مائی گاڈ! کتنا بدل گئے ہیں یہ، میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں اگر تمہاری جگہ یہ حرکت مجھ سے ہوئی ہوتی تو اتنا ڈانٹتے کہ حد نہیں۔'' انابیہ اس کے کاندھے سے کہنی ٹکا کر پورے وثوق مگر شرارت سے بولی تھی مگر حرم نے کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔

''مہمان کو اتنا سا ایڈوانٹیج تو ملنا چاہیے۔''

''وجہ صرف یہی نہیں ہے۔'' انابیہ کے آنکھیں نچانے پر حرم چونک اٹھی تھی۔

"کیا مطلب؟" اس نے ناگواریت سے کہتے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ جو بندہ کسی لڑکی کے کہنے پر مونچھیں کٹوا دے جبکہ وہ 'مچھ نئیں تے کچھ نئیں' کے فارمولے پر عمل بھی کرتا رہا ہو۔

"پھر ناک پر غصہ دھرا رہنے کے باوجود اس لڑکی کی بدتمیزی پر اسے معاف بھی کر دے اور اس کی گستاخی یعنی پانی سے بھگو دینے کے باوجود اسے بینڈ گھمانے کی آفر کرے تو اس کے دل میں زیادہ نہ سہی تھوڑا تو اس کا خیال ہوگا نا۔" انابیہ کے چہرے پر شرارت کے سارے رنگ تھے اور آنکھوں میں شوخی بھری ہوئی تھی۔ حرم نے پہلے اس کا بازو جھٹکا تھا پھر اسے بے حد ناراضی سے گھورا تھا۔ وہ دونوں باتیں کرتیں کمرے میں آگئی تھیں۔

"شیم آن یو انا! وہ بندہ تمہارا فیانسی ہے اور......"

"اور کچھ نہیں، جا کے تیار ہو جاؤ۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا کہہ گئے ہیں۔" انابیہ نے اسے واش روم کی جانب دھکیلا تھا۔ مگر وہ حیرانی سے پلٹ آئی تھی۔

"صرف مجھے......؟ تم ساتھ نہیں چلوگی؟"

"نہیں ہمارے ہاں منگیتروں کے ساتھ کھلے عام پھرنے کا رواج نہیں ہے۔" جواب انابیہ کی بجائے اسی پل دستک کے بعد اندر قدم رکھنے والے دانیال نے دیا تھا۔ اس کا لباس تبدیل ہو چکا تھا۔ اور سلیقے سے بنے بالوں پر نمی کا احساس اس کے تازہ غسل کا گواہ تھا۔ حرم کی پیشانی پر ایکدم شکنیں پڑتی چلی گئیں۔

"یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی منگیتر کی آپ کی نظروں میں عزت ہے اور میری......

"دیکھیں مس حرمت میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں یہ میری عزت کا ہی ثبوت ہے کہ میں آپ کو......" وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے وضاحتی انداز میں ہاتھ اُٹھا کر کہتا ایک دم تھم سا گیا۔ اس کی نگاہ انابیہ پر اٹھی تھی۔ جانے کیا تقاضا تھا اس نگاہ کا جسے انابیہ نے ہی سمجھا تھا اور ہونٹ بھینچے سرعت سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ حرم کا دھیان اس جانب نہیں گیا۔ وہ سوالیہ واستعجابی نظروں سے دانیال کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

"اپنا فقرہ مکمل کریں گے مسٹر دانیال؟" اس کا لہجہ سلگا ہوا ہی نہیں طنز آمیز بھی تھا۔ دانیال بہت پُراعتماد اور دلکش انداز میں مسکرایا تھا۔

"میں یہ ثبوت آپ سے شادی کر کے دینا چاہتا ہوں۔ سمجھ لیں آپ آج سے میری پابند ہیں۔ اس حویلی کی بہو، دانیال شاہ کی ہونے والی بیوی، اس سے بڑھ کر بھی آپ کو کوئی اور ثبوت چاہیے تو دوں؟ بتاؤ کب آؤں تمہارے گھر تمہارے مانگنے؟" صرف اس کے الفاظ بھک سے اڑانے کو کافی نہیں تھے۔ وہ استحقاق بھرا لہجہ متبسم جتلاتی نظریں اور سب سے بڑھ کر حد سے بڑھی ہوئی جسارت کہ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ طلائی بریسلیٹ اس کی کلائی میں زبردستی پہنا دیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے کہ یہ ہماری خاندانی روایت کا حصہ ہے۔ جس سے ہم کسی بھی لڑکی کو اپنے نام کرتے وقت اسے پابند کرتے ہیں۔" اگر زمین اس کے قدموں تلے سے سرکتی یا آسمان سر پر ٹوٹ پڑتا تب بھی اسے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اس پل دانیال کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر ہوئی تھی۔ صرف حیرت نہیں غم و غصے سے اس کا

دماغ سلگ اٹھا تھا۔

''یو آر میڈ؟ تمہیں اندازہ ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' بریسلیٹ نوچ کر اس نے اس طرح سے اپنی کلائی سے الگ کیا تھا کہ اس کی نازک چین ٹوٹ کر دو ٹکڑوں میں بٹ گئی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سامنے کھڑے دانیال کا چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر ڈالے۔

''اسمیں اتنا مائنڈ کرنے والی کیا بات ہے۔ کیا آپ نے کسی سے شادی نہیں کرنی؟'' اس کے قہر و غضب کے آگے وہ کسی درجہ سکون اور معصومیت سے سوال کر رہا تھا۔

''تم نے شکل دیکھی ہے اپنی اور پھر اپنا یہ گھر...... ہے کچھ ایسا قابل ذکر کہ مجھ سے یہ بات کہنے کی جرأت کی۔'' وہ بولی نہیں غرائی تھی۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو چکا تھا۔ صرف اس کا نہیں دانیال کا بھی منہ سرخ ہو گیا تھا۔

''تم حد سے بڑھ رہی ہو حرمت۔'' وہ چیخ پڑا تھا بالآخر، حرم نے اچھنبے میں گھر کر مگر حقارت زدہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔

''میں حد سے بڑھ رہی ہوں؟ میں؟ میرا تمہارے بارے میں یہی خیال ہے۔ میں حیران ہوں تمہیں مجھ سے یہ بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ کچھ لوگوں کو عزت بھی راس نہیں آتی ہے۔ تمہارا شمار انہی لوگوں میں کیا جا سکتا ہے۔ پسند تو میں پہلے بھی تمہیں نہیں کرتی تھی مگر اب...... چلے جاؤ یہاں سے اگر مزید ذلیل نہیں ہونا چاہتے ہو تو، ورنہ تمہاری فیملی کے سامنے تمہارے کرتوت کھول کے رکھ دوں گی۔'' بریسلیٹ اس کے منہ پر مارتے ہوئے اس کے لہجے میں اتنی تضحیک اس درجہ تلخی و ترشی کے ساتھ تکبر و نخوت کا انداز تھا کہ دانیال کو اپنے چہرے پر سے بھاپ نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ اتنی ذلت اور سبکی کہ وہ ایک منٹ بھی مزید وہاں نہیں ٹھہر سکا تھا۔ حرم ہونٹ بھینچے سر جھٹکتی جیسے اس ناخوش گوار واقعہ کی تلخی اپنے ذہن سے جھٹک رہی تھی۔

☆......☆......☆

رات کو مایوں کی تقریب تھی۔ حرم کے ذہن پر اس تلخ واقعہ کے اثرات ہنوز باقی تھے۔ وہ جیسے اپنی جگہ پر بے چین ہو گئی تھی۔ کئی بار جی میں آئی انابیہ کی دوستی اور اس شادی دونوں پر لعنت بھیج کر واپس چلی جائے مگر اسے بزدلوں کی طرح راہ فرار اپنانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بولڈ تو تھی ہی اس کے ساتھ ساتھ انا پرست بھی بہت تھی۔ جبھی واپسی کا ارادہ صرف اس لیے بدلہ کہیں دانیال یہ نہ سمجھ لے وہ اس سے ڈر کے بھاگی ہے۔ بے وقوف تھی نہیں جانتی تھی کہ لڑکیوں کی عزت آبگینے کی طرح نازک ہوتی ہے اس کی حفاظت کی خاطر اٹھایا گیا مصالحت کا قدم بزدلی میں شمار نہیں ہوتا مگر اس خود پسند مغرور لڑکی کو یہی تو پتہ نہیں تھا اسے تو دانیال کی اس بات پر ہی غصہ چڑھے جا رہا تھا جو اس نے شام کو دوبارہ سامنا ہونے پر اس سے کہی تھی۔

''یقیناً آپ جا رہی ہوں گی؟'' اس کے چہرے کے ناگوار تاثرات اور نظر اندازی کو محسوس کر لینے کے باوجود دانیال نے اس کا راستہ اس وقت روک لیا تھا جب وہ بالائی منزل پر موجود انابیہ کے پاس جانے کو سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ مخالف سمت سے آتے دانیال سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

''میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔'' وہ ناک چڑھا کر پھنکارتے ہوئے کہہ کر سائیڈ سے گزرنا چاہتی تھی کہ وہ تیزی سے پھر راستہ روک گیا۔

''اسے منہ لگنا تو نہیں کہتے، تین فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوں۔'' کیسا لہجہ تھا۔ زچ کرتا ہوا تاؤ دلاتا ہوا۔ حرم بے شرمی و بے غیرتی کے اس مظاہرے پر ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ اتنی عزت افزائی کے بعد بھی اگر وہ اس سے منہ ماری کر رہا تھا تو اس سے بڑھ کر حرم کے خیال میں کوئی بے شرمی نہیں تھی۔

''راستہ چھوڑو میرا......'' حرم کی پیشانی پر بل پڑنے لگے تھے۔

''اگر میں کہوں تمہارا ہر راستہ مجھ پر آ کر ختم ہوتا ہے تو پھر......'' اس کی نگاہوں میں اپنی ذات کا زعم بولتا تھا۔ حرم کو اس کی ڈھٹائی ششدر کر گئی۔

''اپنی بکواس بند کرو سمجھے، اور یہ ڈائیلاگ بازی اپنے معیار کی لڑکی سے کرنا۔ میرا معیار اتنا گرا ہوا نہیں ہے۔'' وہ غصے میں صحیح معنوں میں آپے سے باہر ہونے لگی۔ اس کی بات پر دانیال کے چہرے نے کتنے رنگ بدلے تھے۔

''بہت غرور ہے تمہیں خود پر۔ اس غرور کو خاک میں نہ ملا دیا تو دانیال شاہ نام نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ و انداز یک دم بدل گیا تھا۔ آنکھوں سے جیسے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔

''میں اِن دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں، کیا کرلو گے تم ہاں؟'' وہ جواباً اس سے بڑھ کر بلند آواز سے چیخی تھی۔ دانیال کچھ دیر اسے کینہ توز نظروں سے تکتا رہا تھا پھر ہونٹوں کو سختی سے بھینچے ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ حرم کا چہرہ کتنی دیر تک غصے سے دہکتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

مایوں کی تقریب کے بعد دو تین دن بیچ میں خالی تھے پھر مہندی کی تقریب تھی۔ حرم سچی بات ہے اس روٹین کی زندگی سے بھی اکتا گئی تھی۔ جبھی اس روز پھر انابیہ کے سر ہوگئی تھی۔

''تم مجھے اپنا گاؤں دکھا رہی ہو یا میں خود چلی جاؤں؟''

''یار میں کرتی ہوں کچھ، بے جی سے کہتی ہوں۔ وہ دانی سے مجھے اجازت دلوادیں۔'' انابیہ اسے تسلی دے کر خود کمرے سے باہر چلی گئی۔ حرم نے اس انتظار کی کوفت سے بچنے کو کتاب اُٹھا کر کھول لی تھی ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے جب دستک دے کر ملازمہ نے اندر جھانکا تھا۔

''حرمت بی بی آپ کو انابیہ بی بی بلا رہی ہیں۔'' حرم نے حیران نظروں سے ملازمہ کو دیکھا۔ پھر کتاب بند کر کے رکھتے ہوئے بولی تھی۔

''کہاں ہے انابیہ......؟''

''میرے ساتھ آئیں۔'' ملازمہ کے کہنے پر وہ اسی طرح اُٹھ کر اس کے ساتھ ہولی تھی۔

''اِدھر کہاں جا رہی ہو؟'' ملازمہ کو حویلی کے پچھواڑے باغ کی سمت جاتے دیکھ کر حرم کو اُلجھن ہوئی تھی۔

انابیہ بی بی اِدھر ہی گئی ہیں۔ دراصل بی بی وہ بے جی کی اجازت سے تو جا رہی ہیں آپ کے ساتھ پر دانیال صاحب کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ اسی لیے انہوں نے کہا میں آپ کو اُن کے پاس چھوڑ جاؤں۔'' ملازمہ کے مسکرا کر تسلی دینے پر حرم نے گہرا سانس بھر کے کاندھے اُچکا دیے۔ اسے انابیہ پر ترس سا آنے لگا۔ بے چاری کی زندگی کتنی مشکل تھی۔ اتنی پابندیوں میں جینا اور دل کو مار کر زندگی گزارنا کتنا مشکل کام ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں غلطاں کتنا فاصلہ طے کر آئی اندازہ

ہی نہ ہو پایا۔ یہ حویلی کا پچھلا باغ تھا جس کا اختتام یہاں پر لکڑی کے بڑے سے پھاٹک پر ہو رہا تھا۔ اطراف میں اونچی فصیل تھی۔ کچی زمین خار دار جھاڑیوں اور سبز گھاس سے بوجھل تھی۔ ملازمہ نے خود پھاٹک کا نسبتاً چھوٹا دروازہ کھولا تھا اور احتراماً اسے باہر جانے کا راستہ دیا۔ باہر سفید مرسیڈیز کھڑی تھی جس کے شیشے ڈارک تھے۔

''انابیہ اس گاڑی میں ہے؟'' وہ تپتی دوپہر میں سڑک کنارے کھڑی تھی۔

''ہاں بی بی آپ بھی بیٹھ جاؤ گاڑی میں.....'' ملازمہ کے کہنے پر وہ مسکراہٹ دبائے گاڑی کی سمت چلی آئی۔ ارادہ انابیہ کو ایسے چوروں کی طرح سے اقدام پر چھیڑنے کا تھا۔ جبھی دروازہ کھولتے ہی محض دھوپ سے بچنے کی غرض سے جلدی سے خود کو سیٹ پر گرا لیا۔

''قسم سے انا مجھے لگ رہا ہے تم میری دوست نہیں بوائے فرینڈ ہو جو گھر والوں کو دھوکا دے کر مجھے ڈیٹ پر لے جا رہا ہے۔''

اس کی ہنسی چھوٹ رہی تھی۔ گاڑی کا نیم تاریک سرد ماحول اس کے مزاج پر خوشگوار تاثر ڈال گیا تھا۔

''اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کی دوست نہیں آپ کا بوائے فرینڈ بیٹھا ہوا ہے۔ دیکھنا پسند کریں گی مجھے، مگر دھیان سے خوشی سے بے ہوش نہ ہو جائیے گا۔''

یہ پھنکارتی ہوئی سرد آواز اس کے داہنے پہلو سے ابھری تھی۔ وہ جیسے کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی۔ باہر تیز دھوپ سے اندر کے نیم تاریک ماحول سے اس کی آنکھیں فوری طور پر کچھ بھی واضح نہ دیکھ پائی تھیں جبھی وہ جان نہیں سکی تھی کہ اُس کے برابر سیٹ پر انابیہ نہیں دانیال شاہ ہے۔

''تم؟'' حرم کے اعصاب کو اتنا شدید دھچکا لگا تھا کہ وہ خود کو قطعی نہیں سنبھال سکی تھی۔

''کوئی شک ہے تو اسے دور کر دوں؟'' اس نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا انداز میں نگاہوں میں اُمڈتی شرارت کے ساتھ تلخی بھی تھی، حقارت بھی، مگر حرم کے اوسان خطا ہو چکے، اتنا تو وہ بھی سمجھ سکتی تھی کہ اگر وہ اتنا بڑا دھوکہ دے چکا ہے اسے تو اس کے ارادے ہرگز نیک نہیں ہو سکتے تھے۔

''گاڑی روکو، کہاں لے کر جا رہے ہو مجھے۔'' حواس باختہ سی وہ پہلے چیخی تھی پھر سراسیمہ سی ہو کر دروازہ کھولنا چاہتی تھی کہ اسی پل دانیال اس پر عقاب کی طرح جھپٹا تھا اور اسے نہایت بے دردی سے اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ حرم کا چہرہ اس کے کاندھے سے اتنی شدت سے ٹکرایا کہ اس کے حواس جھنجھنا اٹھے تھے۔

''جہاں لے کر جا رہا ہوں ناں تمہیں وہاں سے واپسی پر شاید تم خودکشی کا فیصلہ کر چکی ہو۔ اپنے آپ سے نظریں بھی نہیں ملاؤ گی یقیناً، کیوں لے جا رہا ہوں اس کا جواب تو تمہیں پتہ ہی ہوگا۔ کسی مرد سے پنگا لینے کی یہ سب سے معمولی سزا ہے۔ بہت زعم تھا تمہیں خود پر اپنی حسین صورت پر؟ اس کو خاک میں ملا کے رکھ دوں گا۔ آئندہ اپنی نسلوں کو بھی اس طرح کی حرکتوں سے باز رکھنے کی نصیحت کرتی پھرو گی۔''

اس کے سرد لہجے میں بھیڑیے کی سی غراہٹ در آئی تھی۔ حرم کا دماغ چکرانے لگا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑتی چلی گئی۔ اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا تھا وہ کس بڑی مشکل میں پھنس چکی ہے۔ گاڑی ہموار سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اس نے غیر محسوس انداز میں اپنے اور اس کے

درمیان فاصلہ بڑھانا چاہا تو دانیال نے محض اسے اس کی بے چارگی اور بے بسی کا احساس دلانے کو اسے کچھ اور بھی اپنے نزدیک کھینچ لیا۔ اب ایک طرح سے وہ آدھی اس کی گود میں سوار تھی۔ صرف شرم اور ناگواری کا ہی احساس نہیں تھا۔ جس نے اسے روہانسا کیا تھا شدید قسم کی سبکی بھی تھی جو اس کے وجود سے لپٹ گئی تھی۔

''دس از ناٹ فیئر ...... دیکھو تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ اتنی معمولی بات کی اتنی کڑی سزا نہیں ہو سکتی۔ اگر تم ہرٹ ہوئے ہو تو میں تم سے معافی مانگ لیتی ہوں۔'' عزت کی بقا کا احساس اسے انا سے دستبرداری کا سبق دے رہا تھا۔ یہ خیال ہی روح فرسا تھا کہ وہ بپھرا ہوا وحشی مرد اس سے اپنا انتقام پورا کرنے والا ہے۔ صورتحال کی گھمبیرتا نے اسے سراسیمہ کر کے رکھ دیا تھا۔

''معافی اور مجھ سے؟ تمہارا معیار اتنا پست نہیں ہو سکتا۔'' وہ بے رحم کاٹ دار لہجے میں پھنکارا تو اس کے لہجے میں حقارت اور کسی قسم کی گنجائش نہ پا کر حرم کی آنکھیں خوف کی زیادتی سے پھیلتی چلی گئیں تھیں۔ معاً گاڑی ایک جگہ پر رُک گئی۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والا تومند شخص اُترا اور دانیال کی جانب کا دروازہ کھول دیا۔ دانیال نے خود اترتے ہوئے اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا تو وہ بے اختیار چیخی تھی۔

''چھوڑ دو مجھے، تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ جیسے اس پل بے بسی کی انتہا کو چھوتی رو پڑی تھی۔

''ابھی تو کچھ نہیں کیا ہے میں نے، عزت راس نہیں آئی تھی نا تمہیں، اور جن لوگوں کو عزت راس نہ آئے ذلت انہیں بہت اچھی طرح سے اچھائی برائی کا فرق سمجھا دیا کرتی ہے۔'' اسے بازو سے پکڑ کر عمارت کے اندر جو ڈیرا ٹائپ بھی لے جاتے ہوئے وہ قطعی بے رحم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں کچھ لوگ بیٹھے انہی کی سمت دیکھ رہے تھے مگر کسی نے اس کی چیخوں کی آواز سن کر بھی مداخلت نہیں کی تھی۔ شاید وہ دانیال کے ملازم تھے۔ وہ یہی اندازہ کر سکی تھی۔

''دیکھو میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔ پیر پکڑ لیتی ہوں تمہارے مگر مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی میں مانتی ہوں۔'' یہ وقت اتنا کڑا تھا کہ وہ اپنی اکڑ بھول گئی تھی اس نے صرف کہا نہیں تھا۔ واقعی جھک کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ یاد تھا تو داؤ پر لگی ہوئی عزت کا خیال، یہی خوف اسے سراسیمگی کی انتہاؤں تک لے گیا تھا۔

''تم کہہ سکتی ہو میں بہت کینہ پرور ہوں۔ معافی کا لفظ میری لغت میں درج نہیں ہے۔'' وہ سفاکی پر اتر آیا۔ حرم کے وجود میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ اس نے فق ہوتے چہرے کے ساتھ اسے دیکھا اور زار و قطار رو پڑی۔

''مجھے معاف کر دو دانیال، مجھے یوں بے مایا نہ کرو۔ میں قسم کھاتی ہوں آئندہ کبھی تمہیں اس طرح ڈی گریڈ نہیں کروں گی۔''

وہ ایک بار پھر گڑگڑانے لگی۔ اپنی غلطی کا احساس اب اسے کچوکے لگانے لگا تھا۔ عورت کا لفظی مطلب پردہ میں چھپی ہوئی چیز کا ہے اسے یاد آیا اس نے اپنے آپ کو غیر مردوں کے لیے کس طرح عیاں کیا تھا۔ دوپٹہ ڈھنگ سے کبھی اوڑھا تھا نہ ہی سر ڈھانپا تھا۔ اللہ کی حدوں کو پھلانگنے کی یہ تو دنیا میں بہت معمولی سزا تھی۔ ممی نے کتنا روکا تھا اسے یہاں آنے سے۔ وہ بھی پسند نہیں کرتی تھیں اس کی اتنی آزادی، مگر وہ کبھی آزادی کے منفی پہلوؤں پر سوچنا گوارا ہی نہیں

کرتی تھی۔ یہ اعمال کا کیا دھرا تھا۔ خدا کی آزمائش نہیں تھی۔ بے راہ روی اور حد سے بڑھی ہوئی دین سے دوری کے منفی پہلو ہی سامنے آیا کرتے ہیں۔

''میں بے وقوف ہوں جو تمہیں ایک کے بعد دوسرا موقع دوں؟ اب تم یہاں سے صرف انتقام پورا ہو جانے کے بعد جاؤ گی۔ میں نے محبت کی تھی تم سے، اچھی لگی تھیں تم مجھے مگر تم نے کہا کہ میں تمہارا معیار نہیں ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا کر کہہ رہا تھا۔ حرم حواس باختہ سراسیمہ سی اسے ٹکر ٹکر دیکھے گی۔

''ایک رات یہاں گزار لو گی نا تو پھر دیکھنا کہاں ہے تمہارے لیے جگہ، تمہارے اس کروڑ پتی باپ کے گھر میں نہ اس دنیا کے کسی کونے میں، بہت مان تھا نا تمہیں اپنے باپ کی اعلیٰ و بلند حیثیت کا؟''

''میں معافی مانگ رہی ہوں نا؟'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے بے بسی کی کیفیت میں کہا۔

''صرف معافی مانگنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ شادی کر سکتی ہو مجھ سے؟'' وہ پھنکارا حرم ایک دم نظریں چرا گئی۔

''کر لوں گی، لیکن یہاں سے نکالو مجھے......''

اس کے دماغ نے بہت سرعت سے خود کو انکار سے روکتے مصالحت کی راہ اختیار کی تھی۔

''دیکھو محترمہ مجھے اس وقت اپنے عزائم سے اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ تمہارا ابھی اور اسی وقت مجھ سے نکاح ہے۔ یہاں سے باعزت طریقے سے نکلنے کے صرف یہی اک صورت ہے۔ ورنہ رات ہونے میں زیادہ وقت نہیں۔ میں واپس چلا جاؤں گا۔ تمہاری گمشدگی کی خبر تو ویسے بھی حویلی میں پھیل چکی ہو گی۔ میری وہ ملازمہ راز داں ہے میری، مجھ پر کوئی شک نہیں کر سکے گا کہ تمہیں کھوجتے ڈھونڈنے والوں میں میرا بھی شمار ہو گا۔ بلکہ میں تو پولیس میں پرچہ بھی کٹواؤں گا۔'' اس کے لہجے کی خباثت اور کمینگی حد سے سوا تھی۔ حرم کو لگا تھا وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہیں رہ سکے گی۔ شاید نہیں یقیناً اس کے پاس اپنے بچاؤ کی کوئی راہ نہیں بچی تھی۔ کبھی کے تکبر و غرور میں کہے گئے سارے جملے اک اک کر کے اس کے منہ پر مارے گئے اور اس نے خود اپنی رضا مندی سے اس دیہاتی اور پینڈو شخص کے نام اپنے تمام جملہ حقوق کر دیے تھے۔ چاہے کیسے بھی حالات میں سہی مگر وہ اس شخص کی بیوی بن گئی تھی۔ جس کا محض نام اپنے نام کے ساتھ سن کر بدک اٹھتی تھی۔

☆......☆......☆

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' کاٹن کا ٹھنڈے پانی میں بھیگا کپڑا اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے انابیہ نے اُسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر بے حد محبت بھری فکرمندی سے سوال کیا تھا۔ نکاح کے پیپرز پر سائن کرنے کے بعد ہی اُسے لگا تھا جیسے اُس کی آنکھوں میں اندھیرے اترنے لگے ہوں۔ یہ اندھیرے اس کی ساری زندگی پر محیط ہو گئے تھے شاید، مایوسی ناامیدی اور غم و غصے کی شدید کیفیت نے اس کے حواس سلب کر لیے تھے۔ وہ دانیال کے ہمراہ واپس لوٹی تو حواس باختہ ہی نہیں شکست خوردہ بھی نظر آتی تھی۔ حالانکہ سارے رستے دانیال اُسے سمجھاتا آیا تھا۔

''خود کو سنبھالو میری جان! ابھی تو صرف نکاح ہوا ہے تو تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے۔ اگر میں اپنی محبت تم پر آشکار کرتا تو تمہارا کیا بنتا؟''

اُسے چھیڑ چھاڑ سوجھ رہی تھی جبکہ حرم کی صحیح معنوں

میں جان پر بن آئی تھی۔ وقتی طور پر تو یہ حل نکل آیا تھا مگر آئندہ کا خوف اس کے حواس سلب کر رہا تھا۔ واپس حویلی پہنچی تو سب اس کی خاطر فکر مند بلکہ متوحش نظر آ رہے تھے۔

''سارا قصور انابیہ کا ہے۔ جب یہ کہہ رہی تھیں مجھے گاؤں گھماؤ تو لے جانا چاہیے تھا نا۔ میں اتنا بھی خونخوار نہیں ہوں کہ میری وجہ سے جانے سے انکار کرتی رہی۔ غصے میں آ کر اکیلی نکل گئی تھیں اور راستہ بھٹک گئیں۔ صد شکر میں اسی سمت نکلا ہوا تھا تو ساتھ لے آیا۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہوتا......'' وہ پتہ نہیں کیا کچھ کہہ کر ان لوگوں کو مطمئن کر رہا تھا۔ حرم سے کچھ نہ بولا گیا نہ کسی سے نظر ملائی جا سکی۔ خاص طور پر انابیہ سے، جو اس کے گلے لگ کر بے ساختہ رو پڑی تھی۔

''تھینک گاڈ حرم! اگر تمہیں کچھ ہو جاتا خدانخواستہ تو پھر میں مر ہی جاتی۔'' حرم ساکت کھڑی رہی تھی۔ اس کی پتھریلی آنکھوں میں تب پہلی بار آنسو اترے (کیا کچھ مزید ہونے کو رہ گیا ہے؟ میری چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی اتنی کڑی سزا) اس کا دل رو اٹھا تھا۔

انابیہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹی تو اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے اس کے بعد اب وہ پھر حواسوں میں لوٹی تو زیاں کے ساتھ دکھ کا احساس اتنا جان لیوا تھا کہ انابیہ کے محض احوال دریافت کرنے پر وہ اس طرح خود پر قابو کھو گئی تھی کہ اس سے لپٹ کر بری طرح سے سسک اٹھی۔

''مجھے لگ رہا ہے انابیہ میں مر جاؤں گی کاش میں می کی بات مان لیتی اور یہاں نہ آتی۔'' وہ کچھ اور بھی کہتی مگر اسی پل دروازہ کھول کر وہ اندر آیا تھا۔ گلا کھنکار کر اپنی آمد کا اظہار کرتا ہوا۔ حرم کے وجود میں شکست و ریخت کے جیسے شعلے سے بھڑک اٹھے۔

''بے جی سے پتہ چلا تھا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں نے سوچا احوال پرسی کر لوں؟''

وہ آ کر بیڈ کے نزدیک دھری کرسی پر براجمان ہو گیا۔ حرم کے چہرے پر موجود تلخی و ناگواری کا تاثر گہرا ہونے لگا۔

''ٹمپریچر تو اب قدرے کم ہے۔'' اگلے لمحے اس نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا اور بخار چیک کرنے کے بہانے اس کی کلائی تھام لی تھی۔ حرم کے اندر سے غضب کی مزاحمت اٹھی تھی۔ نفرت کا بہت شدید احساس تھا جس نے اسے بہت تنفر بھرے انداز میں ہاتھ چھڑانے کو جھٹکا دیا تھا مگر دانیال بھی غافل نہیں تھا۔ گرفت سخت تو ہوئی مگر ہاتھ نہیں چھوٹا۔ حرم نے چونک کر مگر آنسو بھری آنکھوں سے اُسے دیکھا تھا۔ عجب بے بسی کا تاثر تھا اُن نگاہوں میں مگر دانیال کی آنکھوں میں جتلاتا ہوا استحقاق آمیز احساس تھا۔ گویا اس پر اپنی حیثیت واضح کرنا ہی مقصد ہو۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' اس کا لہجہ تند خیز تھا۔

''مچ بیٹر۔'' جواب دیتے حرم کی آنکھیں پانیوں سے بھرنے لگیں اور گلا بھرا گیا تھا۔

''جلدی اچھی ہو جاؤ کسی کو آپ کی فٹنس کی بہت ضرورت ہے۔'' اس کا لہجہ اب کے معنی خیزی لیے ہوئے تھا۔ حرم نے امڈتے طیش کو دانت بھینچ کر دبایا تھا۔ پھر وہ جتنی دیر وہاں رہا حرم خود پر جبر اور ضبط کے پہرے بٹھاتی رہی تھی اور دانیال اس کی بے بسی پر مسکراتا رہا تھا۔ یہی مسکراہٹ حرم کا خون جلانے کو کافی تھی۔

☆......☆......☆

وہ مہندی کی رات تھی۔ حرم جس کے اندر سناٹے اور پچھتاوے اتر آئے تھے۔ انابیہ کے لاکھ اصرار کے بعد اس تقریب کے لیے تیار ہوئی تھی۔ یلو فراک میں کامدانی دوپٹہ سنبھالے وہ کمرے میں آئی تو انابیہ جیسے اسی کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کر کھل سی اٹھی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو۔ چلو آؤ میں تمہاری کچھ تصویریں ہی بنالوں۔'' وہ اپنا کیمرا اٹھانے کو لپکی تو حرم نے بے زاری سے اُسے ٹوک دیا تھا۔

''پلیز انابیہ میرا موڈ نہیں ہے۔''

''موڈ کو کیا ہوگیا ہے؟ شہریار صاحب تو نہیں یاد آرہے؟'' اس کے انداز میں شرارت تھی۔ حرم کے دل سے جیسے ہوک سی اٹھی۔ سب کچھ درہم برہم ہوگیا تھا۔ پتہ نہیں کس حاسد کی نظر لگی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ رسم کے موقع پر بھی حرم ہنوز اُلجھی ہوئی اور مضطرب نظر آئی تھی۔ جبھی بے رحمی سے لے کر انابیہ کی بھابی تک سب نے اس سے خاموشی واُداسی کی وجہ پوچھی تھی وہ ہر بار محض بھرم رکھنے کو بے دلی سے مسکرائی تھی۔

تقریب کا انتظام بہت اعلیٰ پیمانے پر تھا۔ اس کے باوجود مرد وعورتوں کا الگ انتظام تھا مگر دانیال پتہ نہیں کتنے چکر بہانے بہانے یہاں کے لگا چکا تھا۔ ہر بار اس کی نظریں بے صبری سے اس کے گرد گھومتی تھیں۔ کبھی ان نظروں میں فتح کا رنگ ہوتا تو کبھی شرارت واستحقاق کا کبھی محض اس پر اپنی حیثیت جتلانا مقصود جبھی ہونٹوں پر دل جلانی مسکراہٹ سجالیا کرتا۔ وہ جھنجلا گئی تھی جبھی جیسے ہی اس سے تنہائی میں سامنا ہوا وہ پھٹ پڑی تھی۔

''تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اسی طرح چپ چاپ مجھے طلاق دے دو، سنا تم نے؟''

''ایک مگ چائے بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔ تمہاری اس بات کا جواب میں وہاں دوں گا۔'' انابیہ کے ہمراہ وہ اس وقت کچن میں تھی۔ انابیہ تو کمرے میں چلی گئی تھی۔ شاید کچھ لینے گئی تھی اور دانیال تو تھا ہی ایسے موقع کی تاک میں جبھی اس کے سر پر سوار ہوگیا تھا۔ حرم کی بات پر اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا مگر اس کی آنکھوں کی گہری ہوئی سرخی نے اس کے طیش کو پھر بھی واضح کردیا تھا۔

''تم میری بات مان لوگے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ دانیال نے کاندھے اُچکا دیے اور پلٹ کر چلا گیا۔ چائے تیار تھی ایک مگ اس کا دوسرا انابیہ کا اس نے کچھ سوچا اور کیتلی سے چائے مگ میں منتقل کی تھی۔ تقریب اپنے اختتام کو کب سے پہنچ چکی تھی۔ حویلی کی اکثر راہداریوں میں سناٹا اور تاریکی تھی۔ اگر یہ بات یہ معاملہ اسی خاموشی سے نپٹ جائے تو اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر حماقت کرنے جارہی تھی۔

دانیال کے کمرے کے دروازے پر رُکتے جو پردہ عقل پر پڑا تھا ایک دم سے سرک گیا۔ اس کا دستک کو اٹھا ہاتھ وہیں تھم گیا۔ اس نے ایک نظر ہاتھ میں موجود چائے کے مگ کو دیکھا۔

''اگر اس نے میری بات نہ مانی؟ اگر وہ اپنی من مانی پر اتر آیا تو؟'' وہ ایک دم سے لرز اٹھی۔ چائے کا مگ اس نے جھک کر وہیں چوکھٹ پر رکھا تھا اور اُلٹے قدموں بھاگی یہ اُس کی ایڑھی سے پیدا ہونے والی آہٹ تھی کہ اس کے منتظر دانیال نے اُٹھ کر تیزی سے دروازہ کھولا پہلی نگاہ راہداری کے موڑ پر غائب ہوتی حرم پر پڑی تھی

دوسری دروازے کے بیچ پڑے چائے کے مگ پر محض چند لمحے لگے تھے اسے صورتحال سمجھنے میں، اس کے بعد جیسے اُس کا دماغ الٹ سا گیا تھا۔ اس نے طیش کے عالم میں مگ ٹھوکر سے اڑا دیا۔ چائے کے چھینٹے دور تک اڑے اور مگ سامنے دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ دانیال نے سرخ چہرے کے ساتھ ایک دھماکے سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ کمرے میں اندھیرا کیے تکیے میں منہ دیے پڑی تھی۔ دانیال کے غصے اور شدید ردِعمل کے باعث ہی وہ یہاں کمرے میں محدود ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن جیسے مفلوج ہو چکا تھا۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے۔ صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ رات بھی پریشانی میں جیسے سوتے جاگتے اضطراب میں گزری۔ اسی وجہ سے طبیعت مضمحل سی تھی۔ اس نے پھر سے سونا چاہا تھا مگر نیند آنکھوں سے جیسے روٹھ گئی تھی۔ چائے کی طلب بہت شدید تھی۔ درد سے پھٹتا ہوا سر چائے کا طلب گار تھا۔ اس نے ایک نظر کچھ فاصلے پر بے خبر سوئی انابیہ پر ڈالی تھی۔ اسے ڈسٹرب کرنا بالکل مناسب بات نہیں تھی۔ کچن وہ رات دیکھ چکی تھی۔ وہاں سلینڈر کا بھی انتظام تھا کم از کم ایک کپ چائے تو خود بنا سکتی تھی وہ یہی سوچ کر وہ کچن میں آئی تھی۔

''بسم اللہ سوہنی شہرن بی بی! کچھ چاہیے تھا تو مجھے کہہ دیا ہوتا...... ناشتہ کریں گی۔'' حرم نے ملگجے اُجالے میں چونک کر سامنے دودھ بلوتی ملازمہ کو دیکھا۔ یہ وہی خرانٹ عورت تھی جو اسے دھوکے سے دانیال تک پہنچا کر آئی تھی۔ اس پل بھی اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکان تھی۔ حرم کی صرف آنکھیں نہیں سلگیں چہرہ بھی جل اٹھا تھا۔

''شٹ اپ اپنی شکل گم کرو سمجھیں، مجھے جو چاہیے ہوگا میں وہ خود لے لوں گی۔'' وہ زور سے پھنکاری تھی پھر تنفناتی ہوئی آگے بڑھ کر کچن میں گھس گئی۔ پانی رکھتے اس نے محسوس کیا تھا کوئی آس پاس ہے اور اسی کی سمت متوجہ بھی، غصے سے اس کے دماغ میں خون ٹھوکریں مارنے لگا۔

''میری جاسوسی پر مامور ہونے کی ضرورت نہیں دفع ہو جاؤ یہاں سے، تمہارے اس جاہل اجڈ شاہ کو زہر دینے کا ارادہ نہیں ہے میرا...... اپنے لیے چائے بنا رہی ہوں۔'' چونکہ واثق یقین اسی ملازمہ کا تھا جبھی پلٹ کر دیکھے بغیر ہی وہ برس پڑی تھی۔ جواب میں ہنسی کی بھاری آواز گونجی اور اگلے لمحے کوئی اس کے بے حد نزدیک آ گیا۔ حرم تڑپ کر پلٹی تو روبرو دانیال کو پا کر جیسے اس کی روح فنا ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں اب اسے دنیا میں اسے تنگ کرنے کے سوا کوئی اور کام نہیں رہ گیا تھا۔

''اونہہ بہت بری بات جانِ من! اس طرح بات نہیں کرتے اور یہ کیا تم کام کیوں کرنے لگیں؟ ابھی تو تمہارے ہاتھوں پر مہندی بھی نہیں لگی اور...... خیر اچھی لگی ہو اس طرح بھی۔'' اس کی آنکھیں لو دے رہی تھیں تو لہجے میں شرارت و شوخی کا عنصر نمایاں تھا۔ حرم بدک کر فاصلے پر ہوئی تھی اس وقت جب اس نے باقاعدہ اس کے گلے میں بازو حمائل کرنے چاہے تھے۔ اس کے پورے وجود میں جیسے سنسناہٹ دوڑنے لگی تھی۔

''کب تک رہنے ہیں یہ فاصلے؟ شادی کا فائدہ یار؟'' وہ بدمزا ہو کر بولا تھا۔ حرم اس کی بے باک نظروں کے جواب میں اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی تھی۔

''رات کیا کہہ رہی تھیں تم؟'' معاً وہ کچھ یاد آنے پر ایکدم سختی سے استفسار کرنے لگا۔
''طلاق مانگ رہی تھی۔ فارسی میں نہیں کہا تھا کہ سمجھ نہ آئے۔'' وہ بھی غصے میں آؤٹ ہوکر چیخی
دانیال نے برہم نظروں سے اُسے دیکھتے ایک دم اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا۔ حرم تو جیسے سناٹوں میں گھر گئی تھی۔ غیر یقینی و صدمے سے پھٹی آنکھوں میں اس درجہ استعجاب تھا کہ دانیال نے ہونٹ بھینچتے ہوئے نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔
''آئندہ یہ بات سوچ سمجھ کر منہ سے نکالنا۔'' اس کا لہجہ بے حد سرد تھا۔
''ورنہ کیا کرو گے تم؟ جان سے مار دو گے مجھے؟ مار دو میں خود بھی اب یہی چاہتی ہوں۔'' اسے جھنجھوڑتے ہوئے وہ شدتوں سے رو پڑی تھی۔
''ابھی تمہارا دماغ درست نہیں ہے میں پھر بات کروں گا تم سے۔''
''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یاد رکھنا اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں خودکشی کرلوں گی۔ پھر مناتے رہنا اپنی فتح کا جشن۔'' وہ یونہی روتے ہوئے چیخی تھی اور پلٹ کر باہر نکل گئی تھی اسے اندازہ نہیں ہوسکا اسے اس طرح کس کس نے دیکھا اور کیا سوچا کیا اندازہ لگایا۔
دانیال جتنا خوش باش اور مگن نظر آتا تھا۔ حرم کے اسی قدر جان پر بن گئی تھی۔ وہ پچھلے دو دنوں سے یہ سوچ سوچ کر ہلکان تھی کہ وہ اس وحشی سے کیونکر چھٹکارا حاصل کرے۔ یہ طے تھا کہ اسے عمر بھر کو یہ تعلق استوار نہیں رکھنا تھا۔ یہ پریشانی ایسی تھی کہ وہ کسی سے کچھ کہنے کی بھی پوزیشن میں نہیں تھی۔ ممی سے وہ اتنا نزدیک بھی تھی ہی نہیں۔ پھر وہ تو سنتے ہی بتھے سے اکھڑ جاتیں۔ اس پر سارا الزام رکھتیں۔ اس میں کوئی شک تھا بھی نہیں کہ یہ انہی کی نافرمانی کی سزا بھگت رہی تھی۔ اگر وہ ان کی مانتی تو یقیناً صورتحال اس قدر گھمبیر نہ ہوچکی ہوتی۔ شہریار سے کچھ کہنے کا مقصد دنگا فساد برپا کرنا تھا۔ وہ تو دانیال کو جان سے مارنے کے درپے ہوجاتا۔ وہ ایسا ہی جذباتی تھا خاص طور پر اس کے معاملے میں۔ وہ ہرگز بھی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لے دے کے ایک ڈیڈ رہ جاتے تھے وہ بھی ہارٹ پیشنٹ تھے، جانے اس کی اس حماقت کا کتنا اثر لیتے۔ امید کی کہیں کوئی کرن نہیں تھی یہی احساس اسے پاگل بنائے جا رہا تھا اس پر انابیہ کی آمد اور سوال جواب، اسے انابیہ پر خوامخواہ غصہ آنے لگا۔ اسی کی وجہ سے وہ اس منحوس آدمی سے ٹکرائی تھی جو جان کا عذاب بن کر مسلط ہوچکا تھا۔
''کیا ہوگیا ہے تمہیں حرم؟ اتنی مضمحل اور اُداس کیوں رہنے لگی ہو۔'' انابیہ کی آنکھوں میں کتنی تشویش تھی۔
''مجھے کیا ہونا ہے طبیعت ذرا خراب ہے جانتی تو ہو تم۔'' اس نے اعصابی تناؤ پر قابو پاتے ہوئے زبردستی لہجے کو نارمل بنایا۔ انابیہ اسے دیکھے گئی تھی۔
''مجھے لگتا ہے تم اپ سیٹ ہو، مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔''
''میں کیا چھپاؤں گی اور کیوں؟'' اسے تب چڑھ گئی تیکھے انداز سے بولی تو انابیہ خائف ہونے لگی۔
''دانیال سے جھگڑا ہوا ہے تمہارا؟'' ملازمائیں بتا رہی تھیں کہ کچن میں تمہاری اُس سے تلخ کلامی ہوئی ہے اور پھر تم روتی ہوئی وہاں سے گئی تھیں۔''
انابیہ کے لہجے میں ازحد تشویش تھی۔ حرم نے بےساختہ نظریں چرالیں۔ اس کے دل نے غوطہ سا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کھایا تھا۔

''کوئی پریشانی والی بات ہے تو مجھے بتاؤ حرم۔'' انابیہ کی تشویش گہری ہونے لگی تھی۔

''تم ان سے کہو وہ فوری تم سے شادی کرلے۔ آئی مین اپنے گھر والوں سے کہو تمہاری شادی کردیں۔'' پہلی بات کے جواب میں انابیہ کا منہ کھلا اور آنکھیں شاکی ہوتی محسوس کرکے اس نے خود ہی اپنے فقرے کی تصیح کی تھی۔ اس کے خیال میں دانیال کی توجہ خود سے ہٹانے کا یہ ہی بہترین حل تھا۔

''کیا ہوگیا ہے حرم! میں تم سے تمہارا مسئلہ پوچھ رہی ہوں اور تم مجھے میری شادی کا مشورہ دے رہی ہو۔'' انابیہ جھنجلا گئی تھی۔ اس کے لہجے سے ایسا تاسف چھلکا تھا جیسے حرم کی غیر دماغی کو اس پر آشکار کرنا مقصد ہو یہی چیز حرم کو غیض میں مبتلا کرگئی تھی۔

''تم سمجھتی ہو پاگل ہوں میں، تمہاری شادی ہی میری اس ٹینشن کا خاتمہ ثابت ہوسکتی ہے۔ تمہاری وہ منحوس باتیں سچ ثابت ہوچکی ہیں۔ وہ فضول آدمی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ سمجھا دو اسے اگر اس نے اپنی حرکتیں نہ بدلیں تو میں اُسے شوٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کروں گی۔'' ذہنی وقلبی انتشار اسے ہذیانی انداز میں چلانے پر مجبور کرگیا تھا۔ انابیہ ایک دم سے گھبراہٹ کا شکار ہوتی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ گئی۔

''آہستہ بولو، کوئی سن نہ لے۔'' اس کے ہر انداز سے خوف چھلک پڑا تھا۔ حرم نے وحشت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر اسی وحشت زدگی کے عالم میں اسے زور سے پیچھے کی جانب دھکا دیا تھا۔ انابیہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے گئی تھی۔ تب دانیال نے کھنکارتے ہوئے اندر قدم رکھا۔

''میں یہاں سے گزر رہا تھا تو......''

''تم یہاں سے دفع ہوجاؤ ورنہ میں ابھی اسی وقت تمہاری اصلیت کھول کر رکھ دوں گی سمجھے۔''

حرم کے چہرے پر نفرت امڈ آئی تھی اسے دیکھتے ہی۔ دانیال چند ثانیوں کو سہی مگر اپنی جگہ پر ساکن رہ گیا تھا۔

''کیا ہے میری اصلیت؟ بتاؤ انابیہ کو، میں دیکھتا ہوں یہ کیا طوفان لاتی ہے یہاں۔'' خود کو سنبھال کر وہ شدید اور تلخ انداز میں گویا ہوا تو حرم جسے اس سے کم از کم اس جواب کی توقع نہیں تھی کسی طرح بھی چہرے کو متغیر ہونے سے نہیں بچا سکی۔

''کیا ہوگیا ہے آخر؟ آپ لوگ آپس میں اس طرح کیوں جھگڑنے لگے ہو۔ کچھ تو خیال کریں گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔'' انابیہ بے حد عاجز ہوکر بولی۔ اس وقت سب سے زیادہ جان گویا اسی کی مصیبت میں پڑی ہوئی تھی۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا، آج میں تم سے دوستی کے تعلق پر اتنی شرمندہ ہوں کہ اس وقت کو کوستی ہوں جب میں نے یہ حماقت کی تھی۔''

حرم کے کڑے لہجے میں اتنی تلخی واہانت کا رنگ تھا کہ انابیہ اس درجہ ذلت کو سہہ نہیں سکی۔ اس کا پہلے رنگ پھیکا پڑا تھا پھر چہرا یکلخت سفید ہوتا چلا گیا۔

''تمہیں اندازہ ہے حرم کیا کہہ رہی ہو تم؟'' انابیہ کے جیسے دل پر چوٹ پڑی تھی جبھی آنکھیں چھلک گئیں۔ حرم نے جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا اور بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا تھا۔ انابیہ کچھ دیر تک غیر یقینی سے اس کے تاثرات کی بیگانگی اور سرد پن کو دیکھتی رہی پھر منہ پر ہاتھ رکھے پلٹ کر یوں وہاں سے بھاگ گئی۔ جیسے اس کے سامنے خود پر ضبط کھونے سے خائف ہو۔

''تمہاری یہ خواہش میں دل و جان سے پوری کردوں گا سوئٹ ہارٹ، انابیہ سے جھگڑے کی کیا ضرورت تھی، اتنی معصوم ہے وہ نازک سا دل ہے جسے تم نے کتنی بری طرح سے دکھایا ہے۔''

دانیال جو تب سے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بہت سکون سے اسے تک رہا تھا انابیہ کے باہر جاتے ہی جیسے تاسف سے بولا۔ حرم نے گردن موڑ کر نفرت زدہ نظروں سے مگر غصیلے انداز میں اُسے دیکھا تھا۔

''ہاں...... وہ معصوم بھی ہے اور نازک بھی، بری تو میں ہوں سارا قصور بھی میرا ہے۔'' وہ جیسے خود پر کنٹرول کھو کر چیخ پڑی تھی۔ جواباً مجال ہے جو دانیال کے سکون و اطمینان میں کوئی فرق آیا ہو اس پر متضاد گہری ہوتی مسکان، جس نے صحیح معنوں میں حرم کو آگ لگا دی تھی۔

''ہاں نا...... تمہارا ہی قصور ہے سو فیصد تم نے ہی تو اپنے حسن کے جال میں ایسے پھنسایا مجھے کہ میرے پاس کوئی چارہ نہ رہا تم سے شادی کے علاوہ، کیا کرتا، تم ایسے ہاتھ بھی کہاں لگتی تھیں۔'' دانیال کے انداز میں بے نیازی تھی۔ یہ بھی گویا ایک نیا الزام عائد ہوا تھا اس کی ذات پر، جبکہ وہ تو پہلے ہی اپنی ذات کی عدالت میں مجرم ٹھہری تھی۔

''تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے فی الفور چلے جاؤ دانیال ورنہ......'' بے بسی کا احساس اتنا شدید تھا کہ اس پر رقت طاری ہوگئی تھی۔ رخ پھیرتے ہوئے وہ بہتے آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔

''ورنہ کیا......؟ تم از خود رخصت ہو کر میرے کمرے میں آ جاؤ گی؟ گڈ، پھر تو ایسا ضرور ہونا چاہیے۔'' اس کے لہجے میں تاؤ دلاتی مسکراہٹ اور ہنسی کا غلبہ تھا حرم کا جیسے دماغ گھوم کر رہ گیا۔

''مزار بنے گا تمہاری حسرتوں کا، ایسا میری زندگی میں ممکن نہیں۔ سنا تم نے، اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اس نے پھنکارتے ہوئے اسے طیش سے ابلتے دماغ کے ساتھ دھکا دینا چاہا تھا مگر دانیال نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے تھے۔

''امید پر دنیا قائم ہے زوجہ، کل تک تم مجھ سے شادی کی بات پر آپے سے باہر ہوتی رہی ہو۔ اب رخصتی پر یہ ری ایکشن ہے اک وہ دن بھی آئے گا جب تم نہ صرف میرے بچوں کی ماں ہوگی بلکہ مجھ سے محبت بھی کرو گی ہمیں یقین ہے وقت بدلے گا اور......''

ہولے ہولے ہو جائے گا پیار ملیے
ہولے ہولے ہو جائے گا پیار

اسے آنکھ مارتے ہوئے وہ اتنی بے ساختگی سے بولا تھا لہجہ کا اعتماد ایسا بھرپور تھا کہ کچھ لمحوں کو ہی مگر حرم بھی اُسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی نگاہوں کے ارتکاز کو محسوس کر کے وہ شوخی سے ہنسا تھا۔ حرم نے جھلا کر ایک بار پھر رخ موڑ لیا تھا۔ دانیال کے ہونٹوں کی تراش میں بھرپور مسکراہٹ بکھرتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

ولیمے کے اگلے ہی دن وہ واپس آ گئی تھی۔ پھر باقی کے دن اس کے بہت اضطراب میں گزرے تھے۔ انہی دنوں شہریار کی آمد نے اسے مزید پریشان کر دیا کہ گھر میں اب باقاعدہ اس کی شادی کا تذکرہ چھڑنے لگا تھا۔ پھر جب ممی نے اس کی رائے جاننے کو اس سے بات کی تو اس کی ٹال مٹول پر انہیں حیرانی سے زیادہ غصے نے آن لیا تھا۔

''تم سے پوچھنا محض ایک فارمیلیٹی تھی حرم!

ورنہ ہم جانتے تھے کہ تم دونوں اس رشتے سے کتنے خوش اور مطمئن ہو۔'' ان کے اعتراضات کے جواب میں وہ سر جھکائے اُن کی سکت سست سنے گئی تھی۔

''مجھے بتاؤ حرم! کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟'' ممی عاجز ہو کر اس سے استفسار کرنے لگیں تو حرم نے بھینچا ہوا سانس کھینچا تھا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے ممی! بس مجھے کچھ تھوڑا سا وقت چاہیے۔'' اس کے جواب نے ممی کے ماتھے پر بل ڈال دیئے تھے۔ انہوں نے بے حد ناراضگی سے اُسے دیکھا تھا۔

''ابھی بھی وقت چاہیے؟ مگر کیوں؟''

''میری تعلیم تو مکمل ہونے دیں۔'' حرم جھلانے لگی تھی۔ اسے ممی سے زیادہ دانیال پر تاؤ آ رہا تھا۔

''شہریار تمہیں پڑھائی سے روکے گا نہیں۔ یہ فضول کے اعتراضات بس رہنے دو۔'' حرم نے اس وقت تو ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ وہ جانتی تھی ممی سے اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں جبھی اس نے خود شہریار سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جبھی اس کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے شیری۔'' رسمی سلام دعا کے بعد اس نے مقصد کی بات کی تھی۔ دوسری جانب غالباً شہریار مسکرایا تھا۔

''جی جناب بولیں۔'' اس کا لہجہ خوشگوار تھا۔ وہ ہمیشہ ہی حرم کو بے حد اہمیت سے نوازا کرتا تھا۔

''فون پر نہیں شہریار! یہ بات میں تمہارے سامنے کرنا چاہتی ہوں۔''

''اوکے فائن! میں ایسا کرتا ہوں تمہارے ہاں آ جاتا ہوں۔ اسی بہانے رُخِ یار کا دیدار ہو جائے گا۔'' شہریار کا آئیڈیا بھی اُسے پسند نہیں آ سکا تھا۔ جبھی پھر ٹوک دیا تھا۔

''میں ممی کے سامنے بات نہیں کر سکتی ہوں شہری، ہم کہیں باہر مل لیتے ہیں۔''

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسی کیا بات ہے کہ تم اتنی راز داری برتنا چاہ رہی ہو؟'' شہریار واقعی اُلجھ گیا تھا۔ حرم نے گہرا سانس کھینچا۔

''تھوڑا ویٹ کر لو...... میں آ رہی ہوں۔''

اس نے ملنے کی جگہ طے کر کے سلسلہ منقطع کیا اور اُٹھ کر تیار ہونے لگی۔

اسے شہریار کو اِنگیج منٹ تک شادی کے معاملے کو روکنے پر آمادہ کرنا ہرگز مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ شہریار ہمیشہ سے اس کی ہر بات کو بہت مقدم رکھتا آیا تھا۔ انہوں نے بہت خوشگوار موڈ میں کھانا کھایا تھا۔ تب شہریار اسے واپس چھوڑنے آ رہا تھا جب سگنل پر گاڑی رُکتے شہریار کی کسی بات کا جواب دیتے حرم کی نگاہ کھڑکی سے باہر اُٹھ گئی تھی۔ گرے پجارو کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دانیال انہی کی سمت متوجہ تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی سنجیدگی تھی کہ حرم کو اس کی اس سنجیدگی سے خوف محسوس ہوا تھا۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت میں اتنی سختی تھی کہ ہاتھ کی رگیں پھول گئی تھیں۔ حرم نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھ گئی مگر وہ خود کو سنبھالنے سے قاصر رہی تھی۔ حرم نے بے اختیار سکھ کا سانس بھرا کچھ بعید نہیں تھا اس خر دماغ آدمی سے کہ اُٹھ کر شہریار سے پنگا لے بیٹھتا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے تو حرم کو یہی خوف لاحق ہوا تھا۔

شہریار سے اُس کی کیفیت چھپی نہیں رہ سکی۔

''کیا بات ہے حرم! تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟'' اس کے چہرے پر لرزتے تاریک سایوں کو دیکھتا شہریار تشویش کا شکار ہو چکا تھا۔ حرم

کو خود کو بہت سرعت سے سنبھالنا پڑا تھا۔

''نہیں ایسی بالکل بھی کوئی بات نہیں ہے۔''

اس نے زبردستی کی بشاشت خود پر طاری کی۔

شہریار مطمئن ہوا تھا یا نہیں البتہ اس نے حرم کو مزید سوال کر کے پریشان نہیں کیا تھا۔

☆......☆......☆

''میں ملنا چاہتا ہوں تم سے۔'' اسی شام دانیال نے اُسے کال کر لی تھی۔ اس کا لہجہ بے حد سرد محسوس ہوا تھا حرم کو، مگر اسے پرواہ کہاں تھی۔

''مگر میں تم سے ملنا نہیں چاہتی، بی کوز مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔'' جواب میں وہ پھنکارنے لگی تھی۔

''مجھ پر اعتماد نہیں ہے لیکن اپنے شوہر پر؟ وہ کون تھا جس سے تم......''

''کوئی بکواس مت کرنا دانیال...... ورنہ میں سر بھی پھاڑ سکتی ہوں تمہارا۔'' وہ چیخ اٹھی تھی۔

''یہ کام کرنے کو تم خود آؤ گی یا میں آ جاؤں۔'' اس کا لہجہ ہنوز تھا۔ خفگی و سرد مہری چھلکاتا تند خیز،

''میں یہ حماقت نہیں کروں گی۔ تمہیں بھی کوئی ضرورت نہیں اس زحمت کی۔'' وہ جواباً تضحیک آمیز لہجے میں بولی تھی۔ دانیال کو غصہ سنبھالنا مشکل لگنے لگا۔

''کون تھا وہ......؟'' وہ بولا تو اس کا لہجہ یوں بھینچا ہوا تھا جیسے خود پر بہت ضبط کر رہا ہو۔

''مائی فیانسی۔'' حرم کا لہجہ صاف چڑانے والا تھا۔ اور وہ چڑا بھی تھا۔

''یو نو حرمت بیگم! شوہر کی موجودگی میں فیانسی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔'' وہ جیسے چیخ اٹھا تھا۔ حرم کو انوکھا سا لطف محسوس ہوا تھا اس کی بے بسی کو محسوس کر کے۔

''زبردستی کے شوہر میں گنجائش بھی نکلتی ہے اور ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو میں نے یہ بندھن ہمیشہ کے لیے نہیں باندھا تھا۔'' وہ بھی بدلحاظی پر اتر آئی تھی۔ ویسے بھی اس کے خیال میں اب اسے دانیال سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

''میں تمہیں اس بات کا بہت برا نتیجہ دوں گا حرمت! تم میری پہنچ سے باہر نہیں ہو بہر حال اور یاد رکھنا اب کی مرتبہ میں تم پر رحم نہیں کروں گا۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ تمہارے پاس تو اپنی سچائی کی گواہی کا نکاح نامہ بھی نہیں ہے نا سو بی کیئر فل نیکسٹ ٹائم۔'' اپنی بات مکمل کر کے اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ حرم کا چہرا ایک دم سرخ ہو کر رہ گیا تھا بے بسی کی انتہا پر جا کر اس نے وہ ساری گالیاں بلا لحاظ دانیال کے نام کی تھیں جو اس وقت اسے یاد تھیں۔ شاید وہ اس خبیث انسان سے کبھی جیت نہیں سکتی تھی۔ یہ خیال الگ روہانسا کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

''تمہیں پتہ ہے کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟'' چھٹیوں کے بعد اس کا انابیہ سے سامنا کالج میں ہی ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی روہانسی ہو کر بولی تھی۔

''سوری...... مجھے چونکہ الہام نہیں ہوتے جبھی جو بھی ہوا تمہیں خود بتانا پڑے گا۔'' وہ آج کل جتنی بدمزاج ہو رہی تھی اس کی وجہ دانیال کی دھونس زبردستی تھی مگر یہ غصہ دانیال کے علاوہ وہ ہر کسی پر نکل رہا تھا۔

''میری شادی ہو رہی ہے یار دانی کو پتہ نہیں کیا سوجھی ہے ایکدم سے شادی کی رٹ لگا دی ہے۔ میں نے لاکھ سر پٹخا کہ یہ فائنل ایئر مکمل ہونے دیں مگر سنتے ہی نہیں۔'' وہ کتنی بے بسی سے

کہہ رہی تھی۔ اورا بے سنتی اسے دیکھتی حرم ایک دم سے جیسے ماحول سے کٹ کر بے خیال سی ہوگئی۔

انابیہ اور بھی جانے کیا کچھ کہنے کے ساتھ اس سے بھی کچھ پوچھتی تھی مگر وہ ڈھنگ سے کسی بات کو نہ سن سکی نہ جواب دینے کے قابل خود کو پاتی تھی۔ اپنی کیفیت خود اس کی بھی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ یہ سب تو اس نے خود بھی چاہا تھا اس میں بھی شک نہیں تھا کہ وہ دانیال سے چھٹکارا چاہتی تھی۔ کچھ سمجھ نہ آنے پر اس نے جھنجلا کر دانیال کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔

''ہاں بولو حرمت......'' وہ اسے کبھی حرم نہیں کہتا تھا۔ اس کا پورا نام لیتا انداز میں کچھ ایسا انوکھا تو ضرور تھا جو ہر بار حرم کو چونکا دیا کرتا تھا۔

''تم انابیہ سے شادی کر رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں سرد پن اتر آیا۔

''ہاں! تمہیں اعتراض؟'' جواباً وہ شریر انداز میں مسکرایا اور حرم نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

اس کی نگاہ میں وقت پلٹ کر پیچھے چلا گیا تھا۔ جب اس نے اس کے سوال کے جواب میں ایسا ہی انداز اختیار کیا تھا اور وہ جواب دے کر ہمیشہ کے لیے پھنس گئی تھی۔

''مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔'' وہ تیکھے انداز میں کہہ کر کچھ کہنے ہی لگی تھی مزید کہ دانیال نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''یاد کرو میں تمہاری ہی خواہش کا احترام کر رہا ہوں۔'' اس کے انداز میں خفیف سی شرارت اُتر آئی۔ حرم کی آنکھیں جانے کیوں بھیگتی چلی گئیں۔

''میری خواہش تو یہ بھی ہے دانیال شاہ کہ تم مجھے آزاد کر دو۔''

''میں تمہاری اس خواہش پر بھی عمل پیرا ہو سکتا ہوں مگر شرط یہ کہ تمہیں میری اور انابیہ کی شادی میں شریک ہونا پڑے گا۔'' اس کے جواب نے حرم کو تپا کے رکھ دیا تھا۔ جبھی وہ بدلحاظی اور غصے سے بولتی چلی گئی تھی۔

''یہ بھول ہے تمہاری کہ اب میں تمہارے شیطانی جال میں آسانی سے پھنس جاؤں گی سمجھے تم۔'' وہ زور سے چیخی تھی۔ دوسری جانب غالباً دانیال مسکرا دیا تھا۔

''سمجھ گیا...... ویسے تم کیا سمجھتی ہو کہ یہ جال صرف گاؤں میں ہی پھینکا جا سکتا ہے تم پر؟'' وہ جیسے اسے زچ کر رہا تھا۔ حرم غصے میں پاگل ہونے لگی۔

''چوہا ہمیشہ اپنے بل پر ہی اکڑ سکتا ہے۔'' اپنے تئیں اس نے بڑی بھگو کے ماری تھی مگر سامنے دانیال تھا۔

''واضح رہے چوہا مگر شیر کی حکومت پورے جنگل پر ہوتی ہے۔ حرمت فاطمہ صاحبہ اب ہم آپ سے باضابطہ ملاقات آپ کے شہر میں کریں گے گڈ بائے۔'' اس نے خود سلسلہ منقطع کیا تھا۔ حرم توہین کے احساس سے جل اٹھی تھی۔

''یہ خبیث مجھ سے پتہ نہیں کس بات کا بدلا چکا رہا ہے۔'' اس نے فون پٹختے ہوئے سوچا تھا۔ اس کا موڈ ایک بار پھر بری طرح سے خراب ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

انابیہ کی شادی طے ہوئی تو وہ روتی دھوتی گاؤں روانہ ہوگئی تھی۔ اس سے شادی میں لازمی شریک ہونے کا وعدہ لے کر...... حرم نے اس کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا جبھی اپنے ارادے اس پر واضح نہیں کیے تھے۔ دن بہت تیزی سے گزرتے جا رہے تھے کہ اس روز اس کے سیل پر پھر دانیال کی کال آگئی تھی۔

"اب کیا تکلیف ہے تمہیں؟" وہ چھوٹتے ہی اس پر برس پڑی۔

"تم شادی پر آرہی ہو؟" وہ سوال بھی عجیب دھونس بھرے انداز میں کررہا تھا۔

"کس بات کی اکڑ ہے تمہیں، بات سنو...... اگر تم میری منت بھی کرو تو میں......"

"سنو حرمت! میں کسی کی منت نہیں کیا کرتا، جو میرا دل چاہے میں ویسا کروایا کرتا ہوں تم گواہ ہو اس بات کی۔ شادی پر آنا نہ آنا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ اک بات یاد رکھنا میں انابیہ سے شادی ضرور کررہا ہوں مگر بیوی کا درجہ پہلے تمہیں دوں گا۔ بی کوز میری پہلی منکوحہ تم ہو۔ اور میں بڑا انصاف پسند آدمی ہوں۔" حرم کو لگا تھا وہ بات کے اختتام پر مسکرایا ہے مگر حرم خود سرتاپا جھلس گئی تھی۔

"بہت زعم ہے تمہیں خود پر، مگر میں اس زعم کو خاک میں ملادوں گی۔ انابیہ کے ساتھ تم کیسے رہتے ہو یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے مگر مجھے تمہیں طلاق دینا ہوگی۔ اگر تم سیدھے سبھاؤ نہ مانے تو میں کورٹ جاؤں گی۔"

اس نے اپنے طور پر اسے دھمکایا مگر وہ خائف ہونے والوں میں سے ہی تو نہیں تھا۔

"تم اپنا ہر شوق پورا کر کے دیکھ لو...... اس بندھن سے آزادی تمہیں صرف میری موت کی صورت مل سکتی ہے۔" جواب میں اس کا انداز خار کھایا ہوا تھا۔ حرم کا مارے جھنجلاہٹ کے برا حال ہوکر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے پھر میری بددعا ہے تم کل کے مرتے آج مرجاؤ۔" وہ اتنا ہی چڑ گئی تھی کہ بلالحاظ کہہ گئی چند لحوں کو دوسری جانب سناٹا چھایا پھر وہ اس کا چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ سن کر اتنا جھنجلائی تھی کہ اس جھنجلاہٹ میں فون بند کردیا تھا۔

(سوئٹ ہارٹ تمہاری ننھی منی بددعائیں تو شاید نہ لگیں مجھے، ایسا کرو اس سے پہلے کہ میرے بچے تمہاری گود میں آئیں تم مجھے قتل کروادو، کیسا؟)

اگلے لمحے اس کا ٹیکسٹ حرم کے موبائل پر آچکا تھا۔ جسے پڑھ کر اسے جانے کیا ہوا تھا۔ وہ ہاتھوں میں چہرا ڈھانپ کر بے بسی کے عالم میں سسکتی چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

کالج سے واپسی پر وہ گیٹ سے باہر نکلی تھی اور بیگ سے گاڑی کی چابی ڈھونڈتی ہوئی پارکنگ کی سمت آرہی تھی جب کوئی گاڑی بہت غیر محسوس انداز میں اس تک آکر رک گئی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور اگلے لمحے اسے گاڑی کے اندر کھینچ لیا گیا تھا۔ وہ سنبھلے بغیر منہ کے بل سیٹ پر گری۔ ابھی حواس بحال نہیں ہوئے تھے کہ دانیال نے اسے احتیاط سے اس کی باہر لٹکتی ٹانگوں کو اندر کرنے کے بعد گاڑی کا دروازہ لاکڈ کردیا تھا۔ حرم کا تو اسے دیکھ کر ہی حلق میں سانس اٹک گیا تھا۔ وہ محض پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"خوشی سے سکتہ ہوگیا ہے یار؟" وہ اس کی پتھرائی ہوئی کیفیت کو نشانہ بناتے ہوئے مضحکہ اڑا کر ہنسا تو حرم کی آنکھوں کی سطح نم ہوتی چلی گئی تھی۔

"اس حرکت کا مقصد؟" وہ سنبھل کر سیدھی ہوئی تو انداز لڑائی کا نہیں تھا۔ واضح شکست اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

"میرے نزدیک تمہاری ہر خواہش بہت اہم ہے۔ مجھے گوارا نہیں تھا کہ تم اپنے شوہر کو بزدل سمجھ کر شرمندہ ہوتی رہو۔" کیسا لاپروا انداز تھا مگر حرم

کے اندر بے بسی گہری ہونے لگی تھی۔

''تم مجھے معاف نہیں کر سکتے ہو؟'' اس نے عاجزی وخوف کی کیفیت میں اُسے دیکھا۔

''تم نہیں آپ، شوہر کو تمیز سے مخاطب کرتے ہیں ورنہ بچوں پر غلط اثر پڑتا ہے۔'' اس پر ذرا برابر بھی جو اثر ہوا ہو۔

''کر دی خواہش پوری، اب مجھے جانے دو۔'' اس نے غصہ دبالیا تھا۔ وہ اُسے مشتعل کر کے معاملہ بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔

''تمہاری ہوئی ہے پوری، میری نہیں ہوئی۔'' اس کے جواب نے حرم کو سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ کس قدر خباثت سے مسکرایا۔

''بھول گئیں؟ میری شادی میں آج صرف دو دن ہیں۔ میں چاہتا ہوں انابیہ سے پہلے تمہیں اپنی دلہن بنالوں۔'' حرم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں خوف کا احساس بن کر اترتی تھیں۔

''دیکھو دانیال تم......!''

''اونہہ، تمیز سے، دیکھو نہیں دیکھیں، تم نہیں آپ او کے؟ اب کرو بات۔'' وہ اس کی تصحیح کر رہا تھا انداز میں اتنی لاپرواہی تھی اطمینان تھا کہ حرم کے اندر مارے غصے کے ابال اٹھنے لگے۔

''مجھے یہیں اُتار دیں......'' اسے خود پر جتنا اس وقت جبر کرنا پڑ رہا تھا ساری زندگی میں ایسا وقت ایسی لاچاری اس پر طاری نہیں ہوئی تھی۔ دکھ اس کے اندر آنسو بن کر گرنے لگا۔

''تم ہمیشہ وہ بات ہی کیوں کرتی ہو حرمت جان کہ جو مجھے پسند آئے نہ میری خواہش کے مطابق ہو۔ آخر تم مجھے کب انڈر اسٹینڈ کرو گی؟'' وہ بسور اٹھا تھا۔ اور طیش سے حرم کا برا حال ہونے لگا تھا۔

''آخر کیا چاہتے ہو تم؟'' اس نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھا۔ ضبط اور برداشت کی حدیں بار بار ٹوٹتی تھیں۔ وہ تھا ہی اتنا ڈھیٹ اور بے حس......

''پھر تم! آپ کہو اور تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہیں ابھی تک اتنی سی بات سمجھ نہیں آئی۔'' وہ خفگی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ حرم کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا تھا۔ اسی بحث وتکرار میں فراٹے بھرتی گاڑی اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ چکی تھی۔ حرم نے جھٹکے سے گاڑی رُکنے پر چونک کر سامنے دیکھا۔ پوش ایریا میں یہ دو منزلہ بے حد خوبصورت سفید بنگلہ تھا۔ جس کی بیرونی دیواروں پر سکھ چین کی بیلیں لپٹی تھیں۔ سیاہ آہنی گیٹ کو دانیال نے خود نیچے اُتر کر کھولا تھا۔

''کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟'' وہ جیسے ہی گاڑی سے اترنے لگا۔ حرم نے اک خوف کی کیفیت میں مبتلا ہو کر یہ سوال کیا تھا۔

''بتا تو چکا ہوں یار...... دوبارہ سننا چاہتی ہو تو خیر میں تمہیں......''

''دانیال...... میں شور مچا دوں گی۔ بہتری اسی میں ہے کہ مجھے جانے دو۔'' خوف اس کے اندر سرد لہریں دوڑا رہا تھا۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اترنے لگی تھی کہ دانیال کے اس کوشش کو ناکام بنا دینے پر اس نے اپنی گھبراہٹ ظاہر کیے بغیر تنک کر کہا تھا۔

''یہ شوق بھی پورا کر لو۔ شرمندگی تمہارے حصے میں آئے گی۔ نکاح نامہ اس وقت بھی میرے پاس ہے۔ میں کوئی بھی کام پورے بندوبست سے کرنے کا عادی ہوں۔''

اس کے انداز میں جو کچھ تھا وہ حرم کے وجود میں اضطراب کی لہر دوڑا گیا تھا۔ وہ ایکدم سرد

پڑ گئی تھی۔ اس کی مزاحمتی صلاحیتیں بھی جیسے بے کار ہوگئیں تھیں۔ جبھی دانیال بہت آسانی سے اندر تک لے آیا تھا۔ یہ گھر چھوٹا مگر خوبصورت انداز میں سجا ہوا شاندار لگ رہا تھا۔ دانیال اسے ہال کمرے میں لے آیا تھا۔ پھر مسکرا کر بالخصوص اُسے دیکھا۔

''ویلکم ٹو یور ہوم مسز دانیال شاہ!'' اس کے شوخ و شریر لہجے میں بے پناہ کھنک تھی۔ حرم نے خالی مگر نم ناک نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''میں تمہارا لائف اسٹائل جانتا ہوں جبھی تمہیں یہاں رکھوں گا اور اناجیہ وہیں گاؤں میں سب کے ساتھ رہے گی۔''

اس کے دونوں ہاتھ اپنی پُر جوش گرفت میں لیتے ہوئے وہ دوستانہ مسکان سمیت بڑی اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ حرم اس قابل نہیں تھی کہ کوئی ردِ عمل ظاہر کرسکتی۔ اس کے حواس سلب تھے صرف ذہن اسپارک تھا۔ اس پل وہ صرف اک بات سوچ رہی تھی وہ تھی اس سے کسی طور بھی چھٹکارا پانے کی تدبیر......

''تم چاہو تو میں یہاں تمہارے فیانسی کو بھی بلا کر اپنا تعارف تمہارے حوالے سے پیش کرسکتا ہوں، بلاؤں؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر گویا حظ لینے والے انداز میں کہہ کر اس کے تاثرات تکنے لگا۔ حرم بے اختیار ٹھٹکی تھی اور سہم کر فی الفور سر کو نفی میں جنبش دینے لگی۔

''دیکھ لو یار پھر نہ کہنا میں بزدل ہوں اور ڈرتا ہوں۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''مم...... مجھے پیاس لگ رہی ہے، پانی......''

اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کی نگاہ اس پل اوپر جاتے زینے پر تھی۔ وہ جان چکی تھی اب اسے کیا کرنا ہے۔ یہ طے تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں کھلونا نہیں بن سکتی تھی۔ اس یاد ہے وہ موت کو بہت آسانی سے ترجیح دے سکتی تھی۔

''تم بیٹھو، لے کر آتا ہوں میں......'' دانیال نے اسے کہنی سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا پھر اس کی سمت مسکراہٹ اچھالتا پلٹ کر دروازے سے نکل گیا حرم اسی انتظار میں تھی۔ اُٹھ کر زینے کی جانب بھاگی آٹھ سے دس اسٹیپ ہی وہ طے کرسکی تھی تب اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے گردن موڑی تھی۔ اسی پل دانیال نے اسے کمر سے دبوچ لیا تھا۔ حرم کا دل اچھل پڑا۔

''چھوڑو مجھے......'' وہ پوری قوت صرف کرکے اس کی گرفت سے نکلنے کو مچلی۔

''کہاں جارہی ہو؟ خودکشی کرنے ہاں؟ جانتا تھا میں، تم یہی کرو گی مگر یہ سب اتنا آسان نہیں ہے سمجھیں۔''

''وہ حلق کے بل غرایا اور اسے یونہی دبوچ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ حرم کے لیے اپنی یہ پوزیشن بے حد خفت و ہتک کے ساتھ شرمندگی کا بھی باعث تھی۔ جبھی کوئی پیش نہ چلتی دیکھ کر اپنے ناخنوں سے ہی اس کے بازو بھنبھوڑ ڈالے تھے۔ دوسری جانب وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔

''تمہاری یہ حرکتیں مجھے صرف غصہ دلا رہی ہیں۔'' اسے صوفے پر پٹخ کر وہ اپنی بازو دیکھنے لگا جن پر گہری کھرونچوں کے نشان تھے۔

''مجھے جانے دو، ورنہ میں اس سے بھی زیادہ بری حالت کروں گی تمہاری۔'' اس نے اس دھینگا مشتی میں کھل کر بکھر جانے والے بالوں کو غصے میں پیچھے جھٹکتے ہوئے اندر کی تلخی باہر نکالی۔

''تم پچھتاؤ گی حرمت...... تم نے ابھی تک بس میری محبت دیکھی ہے۔'' وہ اس پل چڑ چڑا ہو چکا تھا۔ حرمت کی نگاہ ٹیبل پر موجود فروٹ کی

نوکری کے ساتھ رکھی چھری پر پڑیں چھوٹے پھل
والی تیز دھار چھری، اس نے لپک کر وہی اٹھائی
تھی۔

"تم مجھے جانے دو گے کہ نہیں؟" اس کی
آنکھوں میں اس پل اتنی خوفناک چمک تھی کہ دانیال
تمام تر جی داری کے باوجود خائف ہو گیا تھا۔

"یہ چھری مجھے دو حرمت۔" اس نے اب کے
اسے پیار سے ڈیل کرنا چاہا۔ سا کا طیش خطرناک
ثابت ہو سکتا تھا۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں تم مجھے واپس
جانے دو گے کہ نہیں۔" حرم کی آنکھوں میں خون
اترنے لگا۔ وہ چھری اس کی آنکھوں کے آگے لہرا
کر بے خوف انداز میں چیخی۔

"نہیں، آج تم ایسے نہیں جاؤ گی، میں تمہیں
ایسے نہیں جانے دوں گا، سنا تم نے۔" دانیال نے اس
کے اس ہاتھ پر جھپٹا مارا تھا جس میں چھری تھی۔ حرم کو
اس سے یہ توقع نہیں تھی پیچھے ہٹنے کی کوشش میں وہ سر
کے بل گری اور اس سے چھری چھیننے کی کوشش کرتا
ہوا دانیال اس سے کچھ فاصلے پر مگر دانیال نے یہ
فاصلہ بہت سرعت سے سمیٹ دیا۔ اب صورت حال
یوں تھی کہ ایک چھری دونوں کے ہاتھ میں تھی۔

دستے کی جانب سے حرم کے ہاتھ میں اور
دوسری جانب سے دانیال کے، دانیال کا ہاتھ زخمی
ہو رہا تھا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا اس پل وہ
ہر صورت یہ مہلک ہتھیار حرم سے چھین لینا چاہتا تھا
جس سے وہ خود کو نقصان پہنچانے کے درپے تھی۔
دانیال اس کی آنکھوں میں جو کیفیت دیکھ چکا تھا وہ
اسے خائف کر چکی تھی۔ وہ ضدی تھی اور ضد میں
اسے نقصان کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ حرم کے ایک
زوردار جھٹکے کے نتیجے میں دانیال کے ہاتھ پر گہرا
کٹ لگا تھا کہ کراہ کی صورت اس کی گرفت جیسے
ہی ڈھیلی پڑی۔ چھری پر حرم کا قبضہ ہو گیا۔ دانیال کو
یہی گوارا نہیں تھا۔ حرم نے جتنی تیزی سے اٹھنا چاہا
دانیال نے اسی قدر بے صبری اور افراتفری کی
کیفیت میں اسے قابو کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہی
وہ غلطی تھی جس کی خطرناکی کا دونوں کو اس لمحے
اندازہ نہیں رہا تھا۔ اس کھینچا تانی میں چھری پوری
قوت سے دانیال کے پہلو میں لگی تھی۔

پھر صرف وہی ایکدم ٹھنڈا نہیں پڑا تھا حرم کا
بھی جوش و خروش جاتا رہا۔ چھری ہنوز دانیال کے
جسم میں پیوست تھی اور خون کسی فوارے کی طرح
پھوٹتا سرعت سے اس کے لباس کو رنگین کرنے کے
بعد اب گلابی کارپٹ کو بھگو رہا تھا۔ دانیال نے
ساکن نظروں سے متاثرہ جگہ کو دیکھا پھر ہونٹوں کو
سختی سے بھینچتے ہوئے چھری کو دستے سے پکڑ کر ایک
جھٹکے سے کھینچا اور سائیڈ پر پھینک دیا۔ زخم کا منہ
کھلتے ہی خون کے اخراج میں بھی مزید روانی اور
شدت آ گئی۔ دانیال کے چہرے پر شدید تکلیف
کے آثار تھے تمام تر ضبط کے باوجود، پسینہ موٹی
بوندوں کی صورت اس کے چہرے پر ابھر آیا تھا۔

"دانیال...... اٹھیں ڈاکٹرز کے پاس چلتے
ہیں۔" معاً اس پل حرم کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اسے
جیسے ہی صورتحال کی سنگینی کا احساس ہوا تھا وہ لپک
کر دانیال کے قریب آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے
اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

"تم جاؤ یہاں سے، یہی چاہتی تھیں نا تم کہ
میں تمہیں جانے دوں۔ اب راستہ صاف ہے، چلی
جاؤ۔" دانیال نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بھنچی
ہوئی مگر سرد آواز میں کہا تھا۔ وہ ہنوز اس انداز میں
نیم دراز تھا جیسے اسے یہ زخم آیا تھا۔ اس کے چہرے
پر عجیب سی کبیدگی کے آثار تھے اور انداز میں حد
درجہ بے رخی، حرم نے پہلے حیرانی سے پھر کسی قدر

خوف کے عالم میں اُسے دیکھا۔

''کیا مطلب؟ آپ ڈاکٹر کے پاس نہیں جائیں گے؟'' اس کے لہجے میں استعجاب نہیں خوف کی بھی کیفیت تھی۔ اس کا تیزی سے ضائع ہوتا ہوا خون حرم کی جان پر بنا چکا تھا۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے، تم چلی جاؤ یہاں سے۔'' دانیال کے انداز میں سرد مہری کچھ اور بڑھی تو حرم خائف ہونے لگی تھی۔

''میں قسم کھا سکتی ہوں، میں نے آپ کو نہیں خود کو نقصان......''

''میں جانتا ہوں بتانے کی ضرورت نہیں ہے......'' وہ ضبط کھو کر چیخا تو چہرے پر تکلیف کے رنگ گہرے ہو گئے تھے۔ جس طرح اس نے دانت بھینچے تھے وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ تکلیف برداشت کرنے کی کوشش میں ہلکان تھا۔ حرم اضطرابی کیفیت میں اس کے پاس آ کر گھٹنوں کے بل جھکی۔

''آپ کا زخم بہت گہرا ہے، ضد کیوں کر رہے ہیں۔''

''جتنا بھی گہرا ہے مگر مروں گا نہیں اس سے، وہ چھری اٹھاؤ اور......''

''دانیال! فار گاڈ سیک......!'' پتہ نہیں کس جذبے کے تحت اس نے دانیال کے ہونٹوں پر اپنا سبک سا ملائم ہاتھ رکھ دیا تھا۔ پھر دوڑ کر صوفے تک آئی اور اپنے بیگ سے سیل فون نکال کر کچھ نمبر پُش کیے تھے اور ڈاکٹر سے کنسلٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''حرمت یہ گاڑی کی چابی اٹھاؤ اور اب واپس چلی جاؤ۔'' جس وقت اس نے ڈاکٹر کو ایڈریس سمجھا کر فون بند کیا دانیال نے گاڑی کی چابی اس کی جانب پھینک کر کہا تھا۔ حرم نے جیسے سنا ہی نہیں۔ سیل فون واپس رکھا اور اس کے نزدیک آ گئی۔

''اٹھیں وہاں بیڈ پر چلیں۔'' حرم نے اسے سہارا دینا چاہا تھا۔ دانیال اس کا ہاتھ جھٹکتا خود اُٹھ گیا۔ زخم سے ہنوز بھل بھل خون بہہ رہا تھا بیڈ پر جانے کی بجائے وہ صوفے تک آیا تھا اور بیٹھنے سے قبل شرٹ اتاری تھی۔ حرم نے پھر اس کی مدد کی کوشش کی۔ دانیال نے پھر اسے جھٹکا تھا۔

''یہ پولیس کیس بن چکا ہے۔ احمق لڑکی میں کہہ رہا ہوں نا دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' وہ اس کریٹیکل چویشن میں بھی غصے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ حرم نے ایک نظر اسے دیکھا ضرور تھا البتہ برا ماننے کی شاید ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''زخم خطرناک تو نہیں ہے ڈاکٹر؟'' ڈاکٹر جس وقت اسے ٹریٹمنٹ دے چکا۔ حرم نے کسی قدر پریشانی کے عالم میں سوال کیا تھا۔

''خطرناک تو ہے چونکہ گہرا ہے تو ظاہر ہے احتیاط کی بھی ضرورت ہے۔ اندر اسٹیچنگ ہوئی ہے، آپ ان کی......؟'' ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں جواب دیتے اچانک سوال کر لیا تھا۔

''وائف ہوں اُن کی، احتیاط کس قسم کی؟ کیا چلنا پھرنا بھی نہیں چاہیے انہیں۔'' وہ پوری توجہ سے ڈاکٹر سے بات چیت میں مصروف تھی۔ اس نے بلا جھجک کہہ دیا تھا کہ ان کے جھگڑے میں یہ زخم دانیال کو آیا تھا۔ دانیال بس گنگ سا اُسے تکتا چلا گیا تھا۔ آج اس کی ہر ادا ہر حرکت نے اسے متحیر نہیں کیا تھا۔ بہت گم صم بھی کر ڈالا تھا۔

☆......☆......☆

''کیوں کر رہی ہو یہ سب کچھ تم؟'' اگلے دن جب وہ پھر اس کے پاس پہنچ گئی اور اسے اپنے ہمراہ لایا ناشتہ کرنے پر اصرار کر رہی تھی۔ دانیال

نے اسے دیکھتے ہوئے اہم سوال کر دیا تھا۔ وہ کل کی طرح کنفیوژ نہیں ہوئی اور فوری گھڑا گھڑایا سا جواب دے دیا۔

"انسانی ہمدردی کے تحت۔" دانیال کی نظروں میں البتہ ضرور کل سے زیادہ تلخی اور برہمی جھلک پڑی تھی۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں جاسکتی ہو تم اس ہمدردی کے ساتھ۔" اس کا بڑھایا جوس کا گلاس ہاتھ مار کر گراتے ہوئے وہ بھپر سا گیا تھا۔ کل وہ اسے اس حالت میں چھوڑ کر جانے میں بھی پس و پیش سے کام لے رہی تھی۔ حالانکہ دانیال اسے بھیجنے پر مصر تھا۔ یہ کایا پلٹ بھی عجیب تھی۔ اگر اس پر غور کیا جاتا تو......

"اس وقت آپ کو اکیلا چھوڑنا خطرناک ہے۔ میں ممی سے کہہ دیتی ہوں کہ فرینڈ کی طرف ہوں۔" حرم نے بہت آرام سے کہہ کر تائیدی نظروں سے اُسے دیکھا تو جواب میں اس کی خفگی سہنی پڑی تھی۔

"میرے لیے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں، سمجھیں تم؟"

"مجبوری ہے، آپ کو اس طرح بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔" اس نے جواباً کاندھے اُچکا کر بے نیازی کا تاثر دینا چاہا تھا مگر دانیال کی نظروں میں کتنے سوال اُمڈ آئے تھے۔

"ایسا کیوں کر رہی ہو تم؟ کس جذبے نے مجبور کیا ہے تمہیں؟" اور حرم ایک دم کنفیوژ ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ تو شاید اُسے خود بھی نہیں پتہ تھا۔

"دیکھیں دانیال آپ میری وجہ سے زخمی ہوئے ہیں۔ میں گلٹی فیل کر رہی ہوں اور انسانی ہمدردی کا یہ تقاضا ہے۔"

☆......☆......☆

"مجھے تمہاری اس ہمدردی کی ضرورت نہیں تم جاسکتی ہو۔" اور حرم اسے قائل کرنے کی اپنی سی کوشش کر کے ہاری تو ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"بہت ضدی ہیں آپ۔" اس نے بہت چڑ کر کہا تھا۔

"شکر ہے جوس تھا، تیزاب نہیں۔ ویسے اگر آپ کو یہ غصہ میرے جواب پر آیا ہے تو آپ کی حالت کے پیش نظر میں ہمدردی میں ہی غلط بیانی کرنے پر بھی تیار ہوں مثلاً یہ کہ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے؟" اس کے انداز میں شرارت کا رنگ نمایاں تھا اور آنکھیں بھرپور شوخی سے چمکتی تھیں۔ دانیال کی جھنجلاہٹ اسی لحاظ سے بڑھی تھی۔

"اب اگر تم نے کوئی فضول بکواس کی تو میں یہ بوتل تمہارے سر پردے ماروں گا۔" اس نے ناشتے کی ٹرے سے جام کی بوتل اُٹھا کر غصیلے اور چڑچڑے انداز میں کہا تھا۔ حرم نے ڈرنے کی اداکاری کی تھی۔ دانیال نے ہونٹ بھینچے پھر دیا اسے دیکھتا رہا پھر وہیں لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔ حرم نے ٹشو کی مدد سے جوس کو بیڈ کی چادر سے صاف کرتے اسے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ صرف جینز اور بنیان میں ملبوس تھا۔ ہلکی بڑھی شیو میں اپنے اونچے پورے ڈیل ڈول کے ساتھ وہ اچھا خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔ یہ بات تو متعدد بار حرم نے بھی محسوس کی تھی کہ حرم سے ملنے کے بعد اس سے دھیرے دھیرے دیہاتی پن کی چھاپ اترتی چلی گئی تھی۔ لباس سے لے کر گفتگو کے انداز تک وہ ہر لحاظ سے نئے رنگ میں ڈھلا تھا۔ تو کیا اس کی خاطر......؟" اس کا دل پہلی بار انوکھے انداز میں دھڑکا۔

"اتنا برا بھی نہیں ہے، اگر گنجائش نکالی جائے تو۔" اس نے ایک بار پھر اسے جانچتی نظروں سے دیکھا اور گہرا سانس بھرا۔

"اگر آپ میرا جائزہ مکمل کر چکی ہوں تو وہ تکیہ اُٹھا کر سر کے نیچے رکھ دیں۔ آئی تھنک آپ یہاں میری تیمارداری کو تشریف لائی ہیں۔" اس کی طنزیہ آواز پر وہ صرف اپنی جگہ پر اچھلی نہیں تھی۔ خفت زدہ بھی رہ گئی۔ وہ اتنا بے خبر بھی نہیں تھا جتنا وہ سمجھ کر یہ حماقت کر رہی تھی۔

"خوش فہمی اچھی چیز ہے۔ بسا اوقات انسان کو جلدی صحتمند بھی کر دیتی ہے۔" اس نے تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھتے ہوئے صرف اپنی خفت نہیں مٹائی ایک طرح سے اپنی پوزیشن بھی کلیئر کی تھی۔ مگر وہ تکیہ رکھ کر فاصلہ پھر سے نہیں بڑھا سکی۔ اس کی کلائی دانیال کے مضبوط ہاتھ کی سخت گرفت میں جا چکی تھی۔

"اس ساری جاں کا ہی کا مطلب..... تمہیں میری صحت سے کیا لینا دینا۔" اس کے لہجے سے ہی نہیں نظروں سے بھی آنچ آنے لگی۔ حرم کو اپنا آپ اس پل عجیب آزمائش سے دوچار لگا۔

"آپ شاید بھول چکے ہیں۔ کل آپ کی شادی کی تقریبات اسٹارٹ ہو رہی ہیں۔ انابیہ بہت اہم ہے میرے لیے۔" اسے بروقت جواب سوجھ گیا تھا جو اس کے خیال میں بہت مناسب بھی تھا۔

"صرف انابیہ؟" وہ اسے بغور تک رہا تھا۔ جیسے پتہ نہیں کیا خاص سننے کا خواہش مند ہو۔

"ہاں تو اور کیا؟" معاً وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کے ہنسی تھی۔

"آپ کا خیال تھا میں آپ کو کہوں گی؟" دانیال کی آنکھوں میں جلن اترنے لگی۔

"تم جانتی ہو میں نے یہ نکاح کیوں کیا تم سے؟"

"انتقام پورا کرنے کو اور کس لیے، عورت کو ہمیشہ دبانے والے اور اپنی غلامی میں دیکھنے والے مغرور انسان کو میرا اعتماد اور بے نیازی یا دوسرے لفظوں میں آپ کی ذات میں دلچسپی نہ لینے کے انداز نے توہین کے احساس سے دوچار کر دیا تھا۔"

اپنے احساسات بیان کرتے اس کا گلا بھرانے لگا تھا۔ دانیال نے ایک دم سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ چاہے تم جو مرضی کر لو۔" کچھ تاخیر سے وہ بولا تو سابقہ کیفیت سے نکل کر پھر روڈ ہو چکا تھا۔

"اور میں بھی تمہیں ایکسپیٹ نہیں کروں گی۔ چاہے تم ساری زندگی مجھے آزاد نہ کرو۔" کچھ دیر اس کی سمت غصیلی نظروں سے تکتے رہنے کے بعد وہ طیش کے عالم میں کہتے ایک جھٹکے سے اٹھنے لگی تھی کہ دانیال نے ایکدم سے اپنا بازو اس کے اوپر رکھ دیا وہ توازن کھو کر ایک طرح سے اس کے اوپر گری تھی اور حواس باختہ سی ہو کر اُسے تکنے لگی۔

"ابھی انتقام پورا ہوا ہے نہ ہی تمہیں برباد کر دینے کی خواہش، مقصد تمہارا غرور توڑنا تھا تو پھر تمہیں اتنی آسانی سے کیسے چھوڑ دوں گا۔ تمہیں ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ خوشی سے رہو یا ناخوشی سے تمہاری مرضی۔" اس کے لہجے میں سرو غراہ در آئی تھی۔ بات کے اختتام پر اس نے اتنی درشتی سے اسے جھٹک کر خود سے دور ہٹایا تھا کہ وہ جو منجمد حواسوں کے ساتھ ایک طرح سے سناٹے میں گھری ہوئی تھی اس درجہ توہین آمیز سلوک پر جیسے بجلی سے جل اٹھی تھی۔ اس کے اندر غضب کا ابال اور نفرت امڈی تھی مگر گلے میں اترے آنسوؤں کے گولے نے کچھ بولنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

"میں چاہوں تو تمہیں انابیہ سے شادی سے پہلے اپنے ساتھ زبردستی لے جاؤں مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ اپنی شادی کے بعد تمہیں حاصل کر کے میں تمہارے رہے سہے غرور کو بھی خاک میں ملاؤں

گا۔ تم پہلی نہیں دوسری بیوی کہلاؤ گی۔'' وہ اسی شدت پسندی اور نخوت سے کہہ رہا تھا۔ حرم سے وہاں مزید ٹھہرا نہیں گیا جبھی وہ وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ مگر کسی جگہ کو چھوڑ دینے سے حالات سے نظریں چرا لینے سے حقیقت نہیں بدلا کرتی قسمت نہیں بدلا کرتی۔

زندگی پر جیسے کوئی جمود چھا گیا تھا۔ وہ ہر چیز سے بے زار رہنے لگی تھی۔ ممی اس کے بدلے مزاج پر حیران ہوا کرتیں۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ ایسا کیا کرے کہ اس ساری مصیبت سے جان چھڑا لے۔ اس دوران وہ جتنی بار بھی شہریار سے ملی اندر زیاں کا احساس گہرا ہو کر اسے روہانسا کرتا چلا گیا۔ دانیال نے خود کو اتنا اسٹبلش بنالیا تھا اتنا مین ٹین ہو کر بھی وہ شہریار کے پاسنگ نہیں لگتا تھا۔ شہریار تو گویا کوئی شہزادہ نظر آتا تھا۔ شاندار باوقار اور بے حد خوبرو، اس کے ہر انداز میں متانت اور دلکشی تھی۔ جبکہ دانیال کی بدمزاجی اکھڑ اور جہالت اس کے کسی نہ کسی انداز سے عیاں ہو ہی جایا کرتی تھی۔ اس کا دل اتنا جلا ہوا تھا کہ خود تو دانیال سے کیا رابطہ کرنا تھا اس کے فون کرنے پر بھی کال پک نہیں کرتی تھی مگر اس دن وہ ڈھیٹ بن گیا تھا تو حرم نے سیل آف کرنے کے بجائے فون پک کر لیا تھا۔

''دماغ کیوں خراب ہو گیا ہے تمہارا؟'' وہ چھوٹتے ہی برسا تھا۔

''میں بات بھی نہیں کرنا چاہتی تم سے، طلاق دو مجھے ورنہ میں آج شہریار سے بات کر رہی ہوں۔'' اس نے غصے میں آؤٹ ہوتے کہا تھا۔

دوسری جانب یکلخت سناٹا چھا گیا تھا۔

''مجھے تمہیں طلاق دینے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر پہلے میں انابیہ کو طلاق دوں گا۔'' اس کے الفاظ نے حرم کو جیسے بھڑکتے الاؤ میں ڈال دیا تھا۔ غم و غصے کی کیفیت نے اسے نیم پاگل سا کر دیا۔ وہ جان سکتی تھی دانیال نے اتنی کمینگی کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ انابیہ کا اس سے ٹیلی فون پر رابطہ تھا۔ وہ نہ صرف ہر قسم کے حالات سے بے خبر تھی جبھی ہمیشہ کی طرح اپنا دکھ اب ابھی اسی سے شیئر کرتی تھی۔ دانیال کی بے رخی نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ابھی کل رات ہی وہ فون پر روتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

''شادی کے محض ایک ماہ بعد ہی ہر کوئی مجھ سے بچے کے متعلق سوال کرنا شروع ہو گیا ہے حرم! مجھے سمجھ نہیں آتی کیا جواب دوں۔ دانی کا مجھ سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے نہیں سمجھ آتی اگر وہ مجھے اتنا ناپسند کرتے تھے تو پھر مجھ سے شادی کیوں کی تھی۔'' کتنی تڑپ اور لاچاری کا احساس تھا اس کی آواز میں، حرم کو لگا تھا کسی نے اسے کند چھری سے ذبح کرنا شروع کر دیا ہو۔ دانیال اس حد تک گھٹیا ہو گا اسے ہرگز بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس نے بے ماہرانہ انداز میں یہ چال چلی تھی اور اسے ہر لحاظ سے چت کرنا چاہا تھا۔ جبھی وہ دانیال سے بات کرنے پر مجبور ہوئی تھی کہ اس کے خیال میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس سے انابیہ کا کرب سہا نہیں جا رہا تھا۔

''تم انابیہ کو طلاق نہیں دو گے وہ محبت کرتی ہے تم سے......'' وہ چیخ پڑی تھی دوسری جانب اس نے ہنسی بھی نہیں چھپائی تھی پھر بڑی بے نیازی سے بولا تھا۔

''یہ سزا اسے میں نہیں تم دے رہی ہو۔''

''میں دے رہی ہوں؟'' وہ حق دق رہ گئی۔

''تم طلاق لو گی تو پہلے اسے ملے گی اگر تم مجھے اپنی ذات سے خوشی نہیں دے سکتی تو میں اسے نہیں دے سکتا۔ محبت میں محرومی میرے حصے میں کیوں آئے۔'' وہ رکھائی سے بولا تو حرم اس کی بات کی

گھرائی کو سمجھے بغیر اس پر الٹ پڑی تھی۔

''تم ہو ہی گھٹیا اور کمینے......'' وہ چیخنے لگی تھی۔

''تم تو ہو نا اعلیٰ ظرف اور بلند حوصلہ دے دو انابیہ کے لیے قربانی۔ بہت محبت کرتی ہو نا اس سے۔'' جواباً اس کا ضبط چھلک گیا تھا اور وہ اسے بے دریغ برا بھلا کہنے لگی تھی۔ دانیال خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ پھر جب وہ بولا تو لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ جس نے حرم کو روہانسا کر ڈالا تھا۔

''ایک بات ہمیشہ کے لیے سن لو حرمت بیگم انابیہ کو اس کے حقوق صرف اس صورت میں ملیں گے اگر تم رخصت ہو کر میرے پاس آؤ گی دوسری صورت میں وہ عمر بھر یونہی رہے گی۔ میں اک اور شادی کر لوں گا۔ بانجھ وہ مشہور ہو گی۔ میرا کچھ نہیں جائے گا بچے نہ ہونے کی صورت میں میرے پاس شادی کرنے کا جواز ہو گا۔'' اس کے سفاک الفاظ نے حرم کو گنگ کر ڈالا تھا۔ دانیال نے مزید کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر ڈالا۔ حرم عجیب سی وحشت میں گھر گئی تھی۔ اسے اپنا آپ اتنا عزیز تھا کہ وہ انابیہ کی خاطر بھی اپنی زندگی اس جہنم میں نہیں جھونک سکتی تھی۔ یہ طے تھا وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی سرکنے کو تیار نہیں تھی۔

☆......☆......☆

''تم۔''

انابیہ کو غیر متوقع طور پر سامنے پا کر وہ ششدر رہ گئی تھی۔ اس نے بینک جانا تھا جبھی تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر آئی تو انابیہ کو ملازمہ کے ہمراہ اسی سمت آتے دیکھ کر اس نے اچھنبے میں گھر کر سوال کیا تھا۔

''میں نے سوچا تمہیں تو میرا خیال نہیں آئے گا میں خود تمہیں اپنی یاد دلا آؤں۔'' انابیہ اس کے ہمراہ کمرے میں آ کر مسکراتے ہوئے بولی مگر اس کی مسکراہٹ میں واضح پھیکا پن تھا۔

''تمہارے شوہر نے تمہیں آنے دیا؟'' حرم اس دوران خود کو سنبھال چکی تھی جبھی رسان سے مگر طنز آمیز لہجے میں سوال کیا۔ حالانکہ اس کے اندر خدشات جنم لینا شروع کر چکے تھے۔ انابیہ کا وہاں آنا بھی دانیال کی کوئی سازش ہو سکتی تھی۔

''سچ پوچھو تو میرے شوہر نے ہی مجھے بھیجا ہے۔'' انابیہ کے تھکے ہوئے انداز میں دیئے جواب نے حرم کو یکدم سے الرٹ کر دیا تھا۔ انابیہ کی نگاہوں میں کچھ ایسا تھا جو غیر معمولی تھا۔ وہ کھٹک سی گئی بلکہ خوفزدہ نظر آنے لگی۔

''کیا مطلب......؟'' اس کے سوال کے جواب میں انابیہ کی خاموش نظروں میں ہزار شکایتیں اتر آئیں۔

''حرم تم سمجھتی ہو کہ یہاں مطلب پوچھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بتاؤ اگر میں تم سے کچھ مانگوں تو دو گی۔'' وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ حرم کا دل دھک سے رہ گیا۔

''تمہیں یاد ہے حرم ایک بار تمہیں میرا سونے کا بریسلیٹ پسند آ گیا تھا۔ وہ میں نے تمہیں دے دیا تھا۔ تمہیں میرا پرس اچھا لگا تھا تو میں نے خوشی خوشی وہ بھی تمہیں سونپ دیا۔ یہ بہت معمولی چیزیں تھیں حرم جنہیں تمہیں دیتے مجھے گمان تک نہ تھا کہ ان کے بدلے میں تم سے تمہاری سب سے پیاری چیز یعنی تمہاری ذات کو تم سے مانگنے آؤں گی۔ مجھے معاف کر دینا حرم میں بہت کم ظرف ثابت ہوئی ہوں۔'' اپنی بات مکمل کیے بغیر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی چلی گئی تھی۔ حرم کا چہرا فق تھا وہ جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔

''میری عزت، میری گرہستی میری ساری زندگی کی خوشیاں تمہاری اک ہاں کی منتظر ہیں۔ مجھے اعتراض ہے اپنی اس غلطی کا، میں اس مذاق پر

نادم ہوں حرم جو تمہارے لیے مہک ثابت ہو چکا ہے۔ تمہیں میری وہ خواہش بددعا بن کر لگ چکی ہے۔ دانیال میرے منگیتر میرے شوہر ہوتے ہوئے بھی میرے نہیں ہیں وہ تمہارے خواہش مند ہیں۔ ہر صورت، ہر حال میں ورنہ وہ اس ضد میں سب کچھ برباد کر ڈالیں گے اور اس بربادی میں سب سے زیادہ نقصان میرا ہوگا۔''

وہ یونہی زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور حرم کو لگا تھا جیسے فضا میں ایکدم آکسیجن کی کمی ہوگئی ہو۔ ہر سمت حبس تھا اور تاریکی اس وقت وہ بادشاہ تھی اور انابیہ شاہ سوالی..... وہ اس سوالی کو خالی نہیں لوٹا سکی اس کا دامن بھر کے اس نے خود کو خالی کر لیا تھا۔ وہ جس نے ہمیشہ اپنی ذات کو اہمیت دی تھی اسے زندگی کے اس اہم مقام پر آکر اپنی ذات کو نظر انداز کرنا پڑا تھا۔ اپنی خوشی کی بجائے کسی کی خوشی کو اہمیت دینا پڑی تھی۔ تو اندر جیسے زندگی مرسی گئی تھی۔

☆......☆......☆

پھر ہمیشہ کی طرح اسی کی مانی گئی ممی کی مخالفت خفگی اور ناراضی ایک طرف مگر اس نے دانیال سے شادی پر انہیں اتنا مجبور کر دیا کہ ممی نے خفگی سے ہی سہی مگر اسے دانیال کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔ خوش تو وہ خود بھی نہیں تھی مگر اسے اتنا یقین ضرور تھا کہ ممی کو وہ بعد میں راضی کر لے گی مگر یہ اس کا خام خیال ثابت ہوا تھا۔ ممی کی ناراضگی شدید غصے میں ڈھل چکی تھی۔ وہ اس سے ملنے سے بھی گریزاں رہنے لگی تھیں۔ دوسری جانب دانیال تھا اپنی فتح پر شاداں و فرحاں، حالانکہ گاؤں میں سب کے تاثرات بہت عجیب اور حیران کن تھے۔ انابیہ اور دانیال کے اچھے سلوک کے باوجود وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اندر سے مرجھاتی جا رہی تھی۔ جس کی سب سے زیادہ فکر دانیال کو ہی تھی۔ وہ اسے جتنا خوش رکھنے کی کوشش کرتا وہ اسی قدر اس سے بے زار ہوا کرتی۔

''میری خوشیاں تم نے چھین لیں ساری کی ساری سمجھے تم، بھول جاؤ اب میری مسکراہٹوں کو اور میرے حال پر چھوڑ دو، ویسے بھی انتقام پورا کرنے کو جنہیں بیڈ روم میں سجایا جائے ان کے دل نہیں بہلائے جاتے۔'' اس روز بھی دانیال کی ایسی باتوں کے جواب میں وہ پھٹ پڑی تھی۔ اور دانیال اسے بے بسی سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

''یہ کھیل انتقام سے ضرور شروع ہوا تھا حرمت مگر مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ میں تمہیں خوش دیکھنے کا متمنی ہوں۔'' دانیال کے جواب پر حرمت کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی، اور محبت کا جھانسا کسی اور کو دینا سمجھے۔'' اس کے جواب نے دانیال کے چہرے پر تاریکیاں بکھیر دی تھیں۔ کتنی بے بسی تھی اس پل اس کی آنکھوں میں اس کے بعد وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

انابیہ کی پریگنینسی کی رپورٹ پوزیٹو آئی تو حرم اسے مبارکباد دینے کے خیال سے اس کے کمرے کی جانب آگئی تھی۔ مگر اندر سے آتی آوازوں نے اس کے قدموں کو وہیں روک دیا تھا۔

''میں جانتی ہوں دانی آپ خوش نہیں ہیں۔'' انابیہ کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''مجھے معاف کر دینا انابیہ، میں مجرم ہوں تمہارا، مگر میں کیا کرتا، محبت کی شدید بے بسی نے مجھے کچھ اور دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔ تم ہر وقت اس کا ذکر کرتی تھیں۔ بے جی سے، آپا سے بھابی سے، اور وہ سب مجھ سے، مجھے اس ان دیکھی حرمت سے چڑ ہونے لگی تھی۔

میں اکثر غصے میں سوچتا آخر یہ حرم ہے کیا چیز جس نے سب کو دیوانہ بنالیا ہے۔ پھر میں نے اسے دیکھا۔ وہ واقعی اس قابل تھی کہ اس سے محبت کی جاتی۔ میں خود کو اس کی شخصیت کے سحر سے بچا نہیں سکا۔ مگر اس کی شائننگ پرسنالٹی کے سامنے مجھے اپنا آپ کمتر لگتا تھا۔ احساسِ کمتری کا یہ احساس اتنا غالب تھا مجھ پر کہ جس نے نارسائی کا یقین سونپ کر مجھے تلخ اور بدمزاج بنا دیا۔ میں ان فاصلوں اور دوریوں کو پاٹنے کی کوشش میں کچھ ایسی دیوانگی کا شکار ہوا کہ وہ ذہنی و قلبی طور پر مجھ سے کتنے فاصلے پر چلی گئی میں اندازہ ہی نہ کر سکا۔ کسی کو جسمانی طور پر حاصل کر لینا محبت کی فتح تو نہیں ہوتی ہے انابیہ! میں نے اس بات کو اب جانا ہے۔ اب جبکہ اس کا دل میرا نہیں ہو پایا۔ یہی تو سب سے بڑی ہار ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ ہار میرے نصیب میں اس لیے بھی درج ہوئی کہ میں تم سے زیادہ و ناانصافی کا مرتکب ہوا تھا۔

اس کا لہجہ کس درجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کس قدر رنجور ہوسکتا تھا حرم اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا دل یکدم عجیب سے احساسات کا شکار ہو گیا۔ جنہیں وہ کوئی نام دینے سے قاصر رہی تھی۔

دل گرم اور حبس زدہ تھے۔ طویل اور لامتناہی ایسے میں رمضان المبارک کی آمد نے اس کے اندر تھوڑا سا جوش پیدا کیا تھا۔ اس سے قبل تک وہ اتنی گرمی کے روزے کبھی نہیں رکھتی تھی مگر اس مرتبہ جہاں اور بہت ساری تبدیلیاں آئیں وہ باقاعدگی سے روزے بھی رکھ رہی تھی۔ ظہر کی نماز پڑھ کے اس کا ارادہ کچھ دیر آرام کرنے کا تھا۔ ابھی لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے بے زاری سے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس وقت عموماً انابیہ اس سے افطاری کے لیے مینو ڈسکس کیا کرتی تھی۔ اس کی پسند کو بطورِ خاص اہمیت دیا کرتی۔ مگر چوکھٹ میں ممی کو دیکھ کر اسے اپنی بصارتوں پر یقین نہیں آسکا تھا۔

''گلے نہیں ملو گی حرم! خفا تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔'' اسے ساکن پڑے دیکھ کر وہ آگے بڑھیں اور آہستگی سے شکوہ کیا تھا۔ ان کے چہرے پر اُداسی کا رنگ گہرا تھا۔

''آپ کو کیسے یاد آ گئی میری..... مجھے تو شاید مرا ہوا تصور کر لیا تھا آپ نے؟'' ان کے ساتھ لگتے ہوئے وہ نا چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر گئی تھی ممی نے مصنوعی خفگی سے اُسے دیکھا پھر خود اس کی آنکھوں کی نمی پونچھی تھی۔

''والدین اولاد سے ہمیشہ خفا نہیں رہ سکتے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن بیٹے دوستی دین ایمان تو نہیں ہوتی کہ اس کی خاطر تم نے سب کچھ فراموش کر دیا۔'' اس جوابی شکوے نے حرم کو اعصابی طور پر بہت شدید جھٹکا لگایا تھا۔

''مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' وہ خائف نظر آنے لگی۔

''مجھے دانیال بیٹے نے ساری بات بتادی ہے اپنی ساری غلطی کے اعتراف سمیت، وہ شرمندہ ہے کہ اس کی اس حرکت کی وجہ سے تم سے سب کچھ چھوٹ گیا۔'' ممی کی بات نے اسے کچھ اور متحیر کر کے رکھ دیا۔ معاً اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکان آن ٹھہری۔ ممی اس کی عیدی لے کر آئی تھیں۔ ان کی خفگی ختم ہو گئی تھی۔ یہ خیال ہی اس کی آدھی پریشانی کو ختم کرنے کا باعث بنا تھا۔

☆......☆......☆

''آپ نے یہ سب کیوں کیا؟'' اس رات جب دانیال کمرے میں آیا وہ اس پر چڑھ دوڑی تھی۔ جواب میں دانیال کچھ دیر اسے یونہی تکتا رہا تھا

پھر گہرا سانس بھر کے کاندھے اُچکا دیے تھے۔
''انسانی ہمدردی کے ناطے، مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میری وجہ سے تمہارا بہت نقصان ہو چکا۔'' حرم جو اس کے منہ سے اعتراف سننے کی خواہش مند تھی اگلے کئی ثانیوں کو گم صم سی ہو گئی تو معاً وہ اس کیفیت سے نکلی تو سخت مشتعل ہونے لگی تھی۔
''انسانی ہمدردی کے ناطے.....؟ محض انسانی ہمدردی کے ناطے؟'' اس نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ دانیال کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ دانیال نے پھر اسی بے نیازی سے کاندھے جھٹکے تو حرم بے اختیار روہانسی ہو گئی تھی۔
''اگر یہ انتقام تھا تو پورا ہو جانا چاہیے تھا۔ آپ نے میرا غرور بھی توڑ دیا اور مان بھی۔'' وہ واقعی ہی رو پڑی تھی۔ سسک سسک کر انتہائی لاچاری کے ساتھ دانیال مضطرب سا ہو کر اسے تکنے گیا۔
''اگر انتقام لے رہے ہیں مجھ سے تو پھر ہمدردی نہ جتلائیں۔ سا جذبے میں ہمدردی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔''
''میں نے کہا تھا یہ صرف انتقام نہیں تھا۔'' دانیال کا لہجہ مدھم اور شکستہ ہونے لگا۔
''پھر کیا ہے؟'' حرم نے آنسو بھری نظریں اٹھائیں۔
''اگر میں کہوں محبت تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔'' وہ بے بس نظر آنے لگا۔
''جب میری بجائے آپ باقی سب کو یہ یقین دلانے کو ان کے آگے اظہار کر دیں گے تو مجھے یقین آ بھی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے الہام نہیں اترتے مجھ پر۔'' حرم کے کلس کر کہنے پر دانیال ٹھٹک سا گیا تھا۔
''کیا مطلب؟'' جواب میں حرم دل شکستگی سے مسکرا دی۔
''اگر آپ ممی اور انابیہ کے آگے محبت کا اعتراف کر سکتے تھے تو مجھ سے کیوں نہیں؟''
''تم یقین.....'' حرم کے ہاتھ اُٹھا کر ٹوک دینے پر وہ گہرا سانس کھینچ کر اُسے تکنے لگا۔
''میں انسان تھی دانیال پتھر تو نہیں..... انابیہ نے مجھ سے سکری فائز کا کہا تھا۔ میں نے محبت کے جواب میں قربانی دے دی۔ آپ مجھ سے محبت کرتے اور اس کا اظہار بھی تو میں اتنی بے حس نہیں تھی کہ جواب میں اسے ٹھوکر مار دیتی۔ وہ بھی اس صورت جبکہ آپ نے میرے آگے کوئی راستہ کھلا چھوڑا ہی نہیں تھا۔ یاد ہے آپ نے مجھے وہ اشعار سنائے تھے۔
میری آنکھوں کے جادو سے شاید تم ناواقف ہو
جس پر مجھ کو پیار آ جائے اس کو پاگل کر دیتا ہوں
چھوڑ کے مجھ کو جانے والا لوٹ کے واپس آئے گا
دائیں بائیں آگ لگا کر آگے جنگل کر دیتا ہوں
میرے اطراف میں آگ تھی، آگے جنگل......
میں پاگل ہوئی تھی جبھی آپ جیسے اجڈ، گنوار اور پینڈو کے لیے دل میں کوئی جذبہ محسوس کرنے لگی تھی۔ مگر آپ..... آپ صرف بے حس نہیں بزدل بھی نکلے۔ مجھ سے محبت کے اظہار کو میل ایگو کے خلاف سمجھا اور.....''
''ہائیں ہائیں اتنا غصہ، اتنی ناراضگی..... یار حد ہے یعنی بدگمانی کی بھی.....اور یہ پینڈو جاہل اور گنوار کس کو کہا۔'' وہ تحیر کا اظہار کرتے کرتے آخر میں آستینیں چڑھاتا ہوا آنکھیں بھی نکالنے لگا۔ مگر وہ خائف نہیں ہوئی اور زور سے ہنس پڑی۔
''اس کو جس سے مجھے تھوڑی تھوڑی محبت ہونے لگی ہے۔ اور صاحب یہ بدگمانی نہیں حقیقت ہے اور آپ کی شخصیت کی بالکل درست عکاسی۔'' اس نے منہ پھلا کر کہا تو دانیال نے اُسے گھورا تھا۔
''اچھا اگر میں خاموش تھا تو تم اظہار کر سکتی

تھیں۔'' دانیال کے چہرے پر اس اعتراف کے بعد آسودگی در آئی تھی۔ آنکھوں میں کتنی چمک تھی اس پل۔

''میں کیوں کرتی؟ یہ کام ویسے بھی لڑکیوں کا نہیں ہوتا۔'' حرمت کے نخوت سے کہنے پر وہ سرشار سا ہنس پڑا تھا۔

''میں باخوشی یہ کام عمر بھر کرنے کو تیار ہوں۔'' اس کی آنکھیں لو دینے لگیں۔

بس ایک معافی ہماری توبہ جو اب کبھی ہم ستائیں تم کو

لو ہاتھ جوڑے لو کان پکڑے اب اور کیسے منائیں تم کو

وہ یونہی کھلکھلاتے ہوئے گنگنایا تھا اور انابیہ جو سارے کاموں سے فراغت کے بعد اسی پل ممی کی وی عیدی دیکھنے آئی تھی۔ دونوں کو اک ساتھ مسکراتے پا کر خوشگوار حیرت میں گھر گئی کہ ایسا منظر دیکھنے کو تو اس کی آنکھیں ترس گئی تھیں۔ حرم نے اشارے سے اسے قریب بلایا تو انابیہ بے تکلفانہ انداز میں آ کر ان دونوں کے ساتھ بیڈ پر براجمان ہو گئی۔

''یہ کایا پلٹ کیسے؟'' اس کی سرگوشی کے جواب میں حرم کے چہرے پر حیا آمیز تبسم آ گیا۔

''اس لیے کہ مجھے پتہ چل گیا کہ مجھے اپنے ساتھ رکھنے اور نظروں سے بھی دور نہ کرنے کی خواہش صرف تمہاری نہیں تھی۔ اس خواہش میں کوئی اور بھی مبتلا تھا۔ جس کا محبت و اہمیت پانے کا انداز ذرا مختلف تھا مگر اب مجھے برا نہیں لگتا۔''

اس کے لہجے میں سکون تھا اطمینان تھا۔ انابیہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھے گئی جبکہ حرم کی بات جاری تھی۔

''انابیہ ہمارا یہ ملاپ اینگل محبت کی فتح کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ آؤ ہم دعا کریں یہ ہمیشہ یونہی قائم و دائم رہے۔''

وہ نرمی سے کہہ رہی تھی اور انابیہ نے آسودہ انداز میں سر ہلا دیا تھا۔ اس پل حرم نے اپنے دل میں نہیں جھانکا جہاں ابھی بھی تھوڑی سی خلش تھی۔ وہ جانتی تھی یہ خلش بھی گزرتے وقت کے ساتھ ختم ہو جانی ہے۔ وہ محبت کرنے والی ہستیوں کی محبت پا کر بچا کر وہ ہرگز بھی گھاٹے میں نہیں رہی تھی۔ یہ اُسے یقین تھا پھر دو دن بعد جب وہ چاند دیکھنے انابیہ اور دانیال کے ساتھ چھت پر آئی تو دانیال نے چپکے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ حرم نے دیکھا اس کی نگاہ اس سنہری زنجیر والے بریسلیٹ پر تھی جو حرم کی سفید کلائی میں بہار دکھا رہا تھا۔ نازک زنجیر میں معمولی سا جوڑ تھا۔ جو محسوس تو ہوتا تھا مگر برا نہیں لگتا تھا شاید اس لیے کہ یہ اس بات کی علامت تھا کہ ٹوٹنے کے بعد چیز کا جوڑا جانا اہمیت اور ضرورت کو ہی نہیں واضح کرتا محبت کو بھی آشکار کرتا ہے۔

''تھینکس فار دس آفر۔'' دانیال نے اس پر جھک کر سرگوشی کی تھی اور وہ ڈھیر ساری چوڑیاں اس کی کلائی میں پہنا دیں جو کچھ دیر قبل شاپنگ کے دوران اس نے خریدی تھیں۔ اس نے مسکرا کر انابیہ کو دیکھا وہ انہی کی سمت متوجہ تھی۔ مسکراتے ہونٹ تبسم آمیز نگاہیں کہیں کوئی کمی نہیں تھی۔ اس نے دانیال اور انابیہ کی مسکراہٹ میں اپنی مسکراہٹ کو بھی شامل کیا تو جیسے ہلالِ احمر کی تابنا کی ایکدم سے بڑھ گئی تھی۔ یہ سچ ہے دوسروں کی خوشی میں خوش ہو جانا آسان نہیں وہ بھی اپنا آپ مار کر مگر یہ اتنا مشکل کام بھی نہیں اگر کرنا چاہیں اور کچھ نہ سہی...... اطمینانِ قلب ضرور نصیب بنتا ہے اور اللہ کی خوشنودی کا بیش قیمت انعام الگ...... وہ بھی مطمئن تھی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

رضوانہ پرنس

عزیزہ خالہ

''افوہ! اریبہ تم بھی کمال کرتی ہو۔ ارے آپ سب کے سامنے رونا دھونا شروع کر بیٹھیں کیا وہ...... خیر اب دوسری وجہ بتاؤ۔'' سمعیہ نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ ''مجھے لڑکے کے بھائی کا سُڑ سُڑ کر کے چائے پینا بہت......

''کچھ لوگ اپنی خوشی سے زیادہ دوسروں کے دکھ کی طلب میں رہتے ہیں ایسا ہی کچھ معاملہ عزیزہ خالہ کے ساتھ بھی تھا۔ پتہ نہیں کیوں انہیں دوسروں کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر ایک خوشی سی محسوس ہوتی تھی۔ کسی کی خوشی میں شریک ہوں یا نہ ہوں لیکن اُن کے غم میں شریک ہونے دوڑ کر پہنچ جانا اُن کا اولین فرض تھا۔

اریبہ کو اُن سے کچھ زیادہ ہی چڑ تھی۔ جب کبھی بھی وہ ان کے گھر آتیں تو اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلی جائے۔ امی کی سگی خالہ تھیں سو بس کلس کر رہ جاتی۔ اُن ہی دنوں اُس کے لیے ایک رشتہ آیا۔ لڑکا کسی مشہور فرم میں کافی اچھی پوسٹ پر تھا۔ شکل وصورت بھی ٹھیک ٹھاک تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ پاپا کے جاننے والے لوگ تھے یعنی پاپا کے گہرے دوست رضی احمد کے بڑے بھائی کا بیٹا ہونے کے باعث زیادہ چھان بین کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ سب ہی گھر والے خوش تھے لیکن اریبہ کا دل جیسے بجھ کر رہ گیا تھا۔

''کیا ہوا اریبہ جب سے گھر میں تمہارے رشتے کی بات چل رہی ہے تم کچھ اُلجھی اُلجھی سی لگنے لگی ہو۔ کیا تمہیں عاشر پسند نہیں آیا ہے۔'' اُس دن سمعیہ باجی نے اُس کی بیزاری محسوس کر کے اُس سے پوچھ ہی لیا۔ آج کل وہ کچھ دنوں کے لیے میکے رہنے آئی ہوئی تھیں۔

''ہاں سمعیہ باجی میں اس رشتے سے کچھ خوش نہیں ہوں۔'' اُس کی اس صاف گوئی پر سمعیہ نے بہت حیران ہو کر اُس کی جانب دیکھا۔

''لیکن کیوں کوئی وجہ تو پتہ چلے۔'' سمعیہ کی سوالیہ نظروں اُس کے چہرے پر جم گئی۔

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے لڑکے کی ماں بالکل اچھی نہیں لگیں۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں وہ مجھے بالکل عزیزہ خالہ کی کاربن کاپی لگیں اور آپ جانتی ہیں مجھے عزیزہ خالہ تھوڑی دیر کے لیے بھی برداشت نہیں ہوتیں۔'' اریبہ کے جواب پر سمعیہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

"پاگل لڑکی تمہارے تو اعصاب پر عزیزہ خالہ سوار رہتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی وجہ ہوئی رشتہ پسند نہ آنے کی۔ ارے مجھے تو خاصی سیدھی سادھی سی خاتون لگ رہی تھیں وہ۔" سمیعہ کی بات پر اریبہ نے خفگی سے انہیں گھورا۔

"آپ نے نوٹ نہیں کیا اپنے خاندان میں ہونے والی ہر ٹریجڈی کتنے ذوق وشوق اور خوشی سے بتا رہی تھیں وہ۔ اللہ معاف کرے اپنے چچا زاد بھائی کی موت کا ذکر کرتے ہوئے، میں تو بس اُن کی آنکھوں میں چمکتی خوشی کو دیکھ رہی تھی۔"

"افوہ! اریبہ تم بھی کمال کرتی ہو۔ ارے آپ سب کے سامنے رونا دھونا شروع کر دیتیں کیا وہ...... خیر اب دوسری وجہ بتاؤ۔" سمیعہ نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"مجھے لڑکے کے بھائی کا سڑ سڑ کر کے چائے پینا بہت Irritate کر رہا تھا۔ سچ سمیعہ باجی میں نے کسی کو اتنی آواز کے ساتھ چائے پیتے کبھی نہیں دیکھا۔" اُس کی دوسری وجہ سن کر سمیعہ نے سر پکڑ لیا۔

"سمیعہ خدا کی قسم بہت ہی فضول قسم کی وجوہات بتا رہی ہو تم...... ارے وہ عاشر کا تیرہ چودہ سال کا بھائی ہے۔ بچہ ہے ابھی، اور رشتہ اُس کا نہیں عاشر کا آیا ہے۔ اور ہاں یہ کیا تم لڑکے کی ماں لڑکے کا بھائی کہہ کر بات کر رہی ہو۔ سیدھا سادھا عاشر کیوں نہیں کہتیں۔"

"سیدھا سادھا عاشر...... کہاں سے سیدھا سادھا لگ رہا ہے وہ۔" استہزائیہ ہنسی کے ساتھ اُس نے سمیعہ کو دیکھا۔

"ارے میرا مطلب ہے کہ تم اُس کا نام لے کر کیوں نہیں بات کرتیں۔" سمیعہ نے زچ ہو کر اُسے دیکھا۔

''اچھا تو عاشر کے بارے میں بھی میری رائے سن لیں۔ بہت ہی پینڈو ٹائپ کا شخص لگا ہے وہ مجھے...... ایمان سے ڈریسنگ کا Sense تو ذرا بھی نہیں ہے اُس میں۔ آپ نے دیکھا تھا نہ کہ وہ......'' لیکن سمعیہ نے اِس بار غصے سے اُس کی بات ہی کاٹ دی۔

''چپ ہو جاؤ اریبہ اگر پاپا نے تمہاری یہ فضول بکواس سن لی نہ تو تمہاری ایسی کلاس لیں گے کہ طبیعت صاف ہو جائے گی۔ اچھے خاصے اسمارٹ اور ویل ڈریس شخص کے بارے میں تمہاری رائے سے کوئی بیوقوف ہی اتفاق کر سکتا ہے۔'' وہ کچھ خفگی سے کہتی ہوئی اُٹھ گئیں، اریبہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ تبھی اچانک ہی اُسے امی کے ساتھ عزیزہ خالہ اپنے کمرے میں داخل ہوتی نظر آئیں تو وہ مزید بور ہو گئی۔ عزیزہ خالہ نے آتے ہی اُسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

''ارے مبارک ہو میری بچی...... اللہ نے آخر تمہارے سہرے کے پھول کھلانے کا بھی انتظام کر ہی لیا۔'' انہوں نے پیار سے اُس کے ماتھے کو چوم کر مبارکباد دی۔

''ابھی کہاں عزیزہ خالہ ابھی تو صرف رشتہ آیا ہے۔'' وہ کچھ ناگواری سے بولی۔ تو امی نے آنکھوں آنکھوں میں اُسے جیسے تنبیہ کی۔

''ارے تو شروعات ایسے ہی ہوتی ہے۔ ویسے بھی نجمہ بتا رہی ہے کہ جلدی ہی وہ لوگ شگون کے ساتھ بات پکّی کرنے آ رہے ہیں۔ ہے نہ نجمہ۔'' انہوں نے اُس کی امی سے تائید چاہی تو نجمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اریبہ نے بہت تپ کر انہیں دیکھا۔

''اور اگر بات پکّی نہ ہو سکی تو......؟''

اریبہ کی بات پر حسب توقع اُن کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرا گئی۔

''اے ہے ایسی بدشگونی کی بات مت کرو بیٹا۔'' اُن کے الفاظ اُن کی آنکھوں کا ساتھ دینے سے قاصر نظر آ رہے تھے۔ جسے اریبہ نے تو اچھی طرح محسوس کر لیا لیکن نجمہ حسب معمول بے نیاز رہیں۔ البتہ اپنی بیٹی کی بے تکی بات پر خاصے غصے سے اُسے گھور کر دیکھا تھا۔

اُس رات اریبہ نے تکیے میں منہ چھپا کر ڈھیر سارے آنسو بہا ڈالے۔ پہلی بار اُس کے دل نے تمنا کی کہ کاش عزیزہ خالہ خوشی خوشی اُس کا رشتہ نہ ہونے کا افسوس کرنے آئیں لیکن مشکل یہ تھی کہ عاشر کا رشتہ سب کو کچھ زیادہ ہی پرفیکٹ لگ رہا تھا اور اُس کی بتائی ہوئی خامیوں کی کسی کی بھی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ کوئی اُس کے دل کی بات سمجھ ہی نہیں رہا تھا اور وہ کتنی بے بس تھی اپنا حالِ دل کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ اور کہتی بھی کس برتے پر کہ جس کی چاہت اُس کی روح کے اندر تک اُتر چکی تھی وہ خود اُس کی محبت کی شدت اور اُس کے جنون سے ناآشنا تھا۔ آزر ابھی حال ہی میں اپنی ماں اور بہن کے ساتھ اُن کے سامنے والے گھر میں شفٹ ہوا تھا۔ آزر کی امی مسز جمشید کافی ڈیسنٹ اور سوبر سی خاتون تھیں۔ یہ متوسط طبقے کا محلّہ تھا جہاں سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹ کر مل جل کر رہتے تھے۔ آپس میں کبھی کھٹ پٹ بھی ہو جاتی لیکن پھر محلے والے درمیان میں پڑ کر صلح صفائی کرا دیتے۔ مسز جمشید سے بھی محلے کی عورتوں نے ملنا جلنا شروع کرنا چاہا لیکن اُن کے لیے دیے انداز کی وجہ سے انہیں مغرور ہونے کا خطاب دے کر پیچھے ہٹ گئیں۔ جبکہ اریبہ کو اُن کا یہ ہی انداز بھا گیا تھا اور نہ صرف

اُسے یہ آنٹی پسند آئیں تھیں بلکہ اُن کی بیٹی گل بھی اُسے بہت اچھی لگی تھی جو ایک مشہور انگلش میڈیم کالج کی طالبہ تھی۔ کالج تو اریبہ کا بھی اچھا تھا لیکن بہرحال گل کے کالج سے اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اریبہ نے بہت چاہا کہ گل سے اُس کی اچھی دوستی ہو جائے لیکن گل بھی اپنی ماں کا پرتو تھی۔ اُس کے ریزرو رویے نے اریبہ کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ بس ایک واجبی سا ملنا جلنا رکھا تھا اُس نے اریبہ کے ساتھ، اُس کے اِس رویے سے اریبہ کو مایوس ضرور ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ اکثر کسی نہ کسی بہانے سے اُن کے گھر چلی جاتی، آنٹی اور گل کے دل میں جگہ بنانے کی تمنا اُس کے دل سے جا ہی نہیں رہی تھی۔ جس زندگی کے اُس نے خواب دیکھے تھے۔ اُس کی تعبیر اُسے اسی گھر میں نظر آ رہی تھی۔ ایک بہت گریس فل سی ساس، ماڈرن خوبصورت سی نند اور ہینڈسم سا شوہر...... آزر کو جب پہلی بار اُس نے دیکھا تھا تو اُسی لمحے جیسے آنکھوں نے اُس کی تصویر کھینچ کر دل میں چھپا ڈالی تھی۔ سیاہ پینٹ اور آسمانی شرٹ میں بلا کا اسمارٹ اور ڈیشنگ لگ رہا تھا وہ۔ ڈارک گلاسز لگائے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اُس کی نگاہ سامنے گیٹ کے پاس سفید یونیفارم میں ملبوس اُس لڑکی پر پڑی تھی جو مبہوت سے اُسے تکے جا رہی تھی۔ آزر کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی تو وہ کچھ شرم آمیز گھبراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ یہ اُن کی پہلی خاموش ملاقات تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے پاپا کے ساتھ موٹر سائیکل پر کالج جایا کرتی تھی۔ آج اتفاق سے وہ آفس نہیں جا رہے تھے تبھی یہ حسین سی ملاقات اُسے مقدر سے مل گئی تھی۔ کالج جا کر بھی کتابوں کی سطر سطر میں اُسے بس وہی نظر آتا رہا۔

دوسرے دن وہ وقت سے پہلے ہی تیار ہو گئی جبکہ پاپا ابھی ناشتہ کر رہے تھے۔

''ارے واہ آج تو ہماری بیٹی کچھ زیادہ ہی جلدی ریڈی ہو گئی ہے۔'' انہوں نے کافی حیرت سے اُسے دیکھا کیونکہ ہمیشہ وہ اور نجمہ اُسے لیٹ ہونے پر سرزنش کیا کرتے تھے کہ شاہد صاحب کو وقت پر آفس جو پہنچنا ہوتا تھا۔

''پاپا میں نے سوچ لیا ہے کہ اب میں ہمیشہ وقت پر تیار ہو جایا کروں گی۔ میری وجہ سے آپ کو آفس سے دیر ہو جاتی ہے۔'' وہ بیگ سنبھالتی ہوئی جلدی سے گیٹ کی جانب بڑھی کہ کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز جو اُسے آ گئی تھی۔ گیٹ کھولتے ہی اُسے سامنے وہ دشمن جاں نظر آ گیا۔ بلیک شرٹ میں ڈارک گلاس کے ساتھ آج وہ مزید اچھا لگ رہا تھا۔ اِس بار اُس کی نظر اریبہ پر نہیں پڑی بس وہ زن سے کار چلاتا ہوا چلا گیا۔ وہ مایوس سی کھڑی رہ گئی۔ اور پھر دوسری صبح کے انتظار میں اُس کا پل پل کاٹنا مشکل ہو گیا۔ اور اِس بار جب وہ پاپا کی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ رہی تھی تو وہ گیٹ کھول کر باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ اریبہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ آزر کی نظریں بھی ان لوگوں کی جانب اٹھی تھیں۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر شاہد صاحب کو سلام کیا تو وہ موٹر سائیکل سے اُتر کر اُس کے پاس چلے گئے۔ دونوں میں تعارف ہوتے دیکھ کر اریبہ کو دل میں جیسے پھول چٹکتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

''اے اللہ یہ تعارف دائمی تعلق میں بدل دے۔'' اُس نے صدقِ دل سے دعا مانگی کچھ ہی لمحوں میں شاہد صاحب نے واپس آ کر اپنی موٹر سائیکل سنبھالی تو وہ جلدی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی آزر اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ موٹر بائیک

جب پاس سے گزری تو ایک لمحے کو دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اریبہ کے جسم کا سارا خون جیسے اُس کے رخساروں پر آ کر ٹھہر گیا۔ آزر نے بہت دل کش مسکراہٹ کے ساتھ یہ منظر دیکھا اور وہ گنگ سی ہو کر سامنے دیکھنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

تبھی اذان کی آواز پر وہ یادوں کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی واپس حال میں آ گئی۔ وضو کر کے نماز پڑھتے ہوئے ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اللہ میاں جی مجھے عاشر اور اُس کے گھر والے بالکل پسند نہیں آئے۔ وہ میرے اسٹینڈرڈز کے ہیں ہی نہیں۔ پلیز آپ آزر کی امی کے دل میں میرا خیال ڈال کر انہیں ہمارے گھر آزر کے رشتے کے لیے بھیج دیں میں پانچ غریبوں کو کھانا کھلاؤں گی۔'' دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بس اُس نے اپنے اللہ سے یہی مانگا تھا۔

آج تقریباً دو ماہ ہونے والے تھے آزر سے نگاہوں کی یہ خوبصورت آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اُس کا بہت دل چاہتا بلکہ وہ دعا بھی کرتی کہ کسی دن پاپا کی موٹر بائیک خراب ہو جائے اور آزر اُن لوگوں کو اپنی کار میں لفٹ دے۔ تھوڑی دیر کو ہی اُسے آزر کا خوبصورت ساتھ تو مل جائے۔ لیکن کم بخت یہ موٹر سائیکل بھی اتنی ڈھیٹ تھی کہ کبھی خراب ہو کر ہی نہیں دی تھی۔ کبھی امی گھر میں حلیم یا نہاری ٹائپ کی کوئی ڈش بناتیں تو وہ ضد کر کے مسز جمشید کے گھر بھی لے کر جاتی۔ نجمہ خفا بھی ہوتی کہ وہ لوگ تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں اور یہ ہے کہ اُن کی محبت میں مری جاتی ہے۔

''ارے نہیں امی میرا تو آنٹی اور گل دونوں ہی بہت خیال کرتی ہیں۔ گل سے تو میری بہت اچھی دوستی بھی ہو گئی ہے۔ میں جب بھی جاتی ہوں خاطروں کی حد کر دیتی ہے وہ۔'' جھوٹ بولتے ہوئے اُس کی نظروں میں آنٹی اور گل کا روکھا پھیکا رویہ گھوم رہا ہوتا۔ لیکن وہ کیا کرتی دل کے ہاتھوں مجبور جو تھی۔ آج کل اُس کا ذہن خوبصورت اور حسین آرزوؤں کی طلب میں سونے جاگنے لگا تھا۔ اکثر صبح کالج جاتے ہوئے آزر کی ایک نگاہ اسے سارا دن ایک خوبصورت سے احساس سے دوچار کیے رکھتی۔ محبت جسے اپنا آپ بخش دے پھر اُسے کسی اور چیز کی تمنا ہی کب رہتی ہے۔ یہی حال اریبہ کا تھا۔ کتنی چپ چاپ سی محبت تھی اُس کی۔

اُسے کہو کہ بہت نامراد ٹھہرے ہے جنوں
اُسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اُس کا

لیکن اب اچانک ہی عاشر کے آئے ہوئے رشتے نے جیسے اُسے کسی حسین خواب سے جگا دیا تھا۔ یا اللہ وہ کیا کرے کیسے آزر کو بتائے کہ وہ درد اور اذیت کی کس منزل سے گزر رہی ہے محبت تو اپنی شدتیں خود بیان کر دیتی ہے۔ اس کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی پھر بھلا وہ اس کے خاموش لبوں کے اظہار کو کیوں نہیں سمجھ رہا۔ اُس کے جذبوں کی سچائی آخر آزر کے دل تک کیوں نہیں پہنچ رہی۔ ساری رات اُس کی کبھی روتے کبھی سوچتے ہوئے گزری تھی لیکن اب نماز کے بعد اللہ سے دعا مانگ کر جیسے اس کے دل کو کچھ قرار سا آ گیا تھا۔ ناشتے کی میز پر اس کی متورم آنکھوں کو دیکھ کر سب ہی پریشان ہو گئے۔ سمعیہ باجی نے پیار سے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے سمجھایا۔

''ارے پاگل ایک رات میں تم نے اپنا یہ کیا حال بنا لیا ہے۔ ابھی پاپا اور امی نے اِس رشتے کے لیے ہاں تھوڑی کی ہے۔ جیسی تمہاری مرضی ہم سب

ضرور دیکھیں گے۔'' پاپا نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا لیکن امی نے خفگی سے اُسے دیکھا تھا۔
''ارے تم لوگ اِس کا دماغ مت خراب کرو۔ بھلا ایک رشتے کے آنے پر کوئی ایسے ماتم کرتا ہے جیسے خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو گیا ہو اور کیا آج تمہارا کالج سے چھٹی کرنے کا ارادہ ہے۔'' ڈانٹ کے دوران اُسے گھریلو کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر انہوں نے سوال بھی کر ڈالا۔
''آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں کالج نہیں جاؤں گی۔'' اُس نے بھی روکھے لہجے میں جواب دیا اور پاپا کو خدا حافظ کہنے کے بہانے گیٹ تک چلی آئی۔ دل میں بے اختیار یہ تمنا جاگی تھی کہ کاش آزر اُس کے اِس اُداس روپ کو دیکھ کر پریشان ہو جائے اور یہ ہی وجہ اُس کا اریبہ کی جانب پہلا قدم اُٹھنے کا سبب بن جائے لیکن اُس کا دل بجھ کر رہ گیا آج شاید آزر وقت سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ کیونکہ سامنے اُس کی کار کھڑی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ بھاری دل کے ساتھ اندر چلی آئی۔ رات کو وہ چائے پیتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ باہر اچانک ہی اُسے کچھ شور کی آوازیں سنائی دیں۔ نجمہ کچن میں تھیں۔ پاپا اپنے کسی دوست کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ وہ اور سمیعہ باجی بھاگ کر گیٹ کے پاس آئیں اور ہلکا سا گیٹ کھول کر باہر جھانکا تو اریبہ ایک لمحے کو جیسے منجمد ہو گئی۔ آنکھوں کے آگے ایسا اندھیرا چھایا کہ اُس نے گھبرا کر سمیعہ باجی کا بازو تھام لیا جو بہت دلچسپی سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ جہاں گل اور مسز جمشید ڈیپ ریڈ لہنگے سوٹ میں ملبوس ایک پیاری سی دلہن کو آزر کی سجی ہوئی کار سے اُتار رہی تھیں جبکہ گلے میں ہار پہنے سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس آزر کھڑا بہت وارفتگی سے اپنی دلہن کو دیکھ رہا تھا۔ آس پاس اُن لوگوں کے کچھ رشتے دار بھی کھڑے تھے۔ ہنسی مذاق اور قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی۔ تبھی نجمہ بھی شاید یہ آوازیں سن کر گیٹ پر آ گئیں تھیں۔
''حد ہوتی ہے بھئی بے مروتی کی...... کوئی اتنی خاموشی سے شادی کرتا ہے بھلا اپنے اکلوتے بیٹے کی۔'' آہستہ آواز میں اُن کی بڑبڑاہٹ اریبہ کے کانوں تک پہنچی ضرور لیکن وہ خالی الذہن بس سکتے کے سے عالم میں آزر اور اس کی دلہن کو یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔
آس پڑوس کی خواتین بھی اپنے اپنے دروازوں پر آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ سب ہی حیران تھیں کہ مسز جمشید نے محلے میں کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی اور بہو بیاہ لائیں۔ دلہن کو لے کر وہ لوگ اندر جا چکے تھے۔ جبکہ عورتوں کے ہاتھ ایک موضوع آ گیا اُن کی خفگی بجا بھی تھی۔ چلو شادی میں نہ بلاتیں کم از کم ذکر تو کر دیتیں بھلا اتنی راز داری برتنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں کون اِس شادی میں روڑے اٹکانے کو بیٹھا تھا۔ سب ہی اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں بس ایک وہ تھی جس کے آنسو کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے بھلا دل پر گرنے والے آنسو کس نے دیکھے ہیں۔ ایک شدید شاک کی سی کیفیت میں وہ لرزتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس کی معصوم خاموش محبت کی کہانی بس اتنی ہی مختصر تھی جس کے انجام نے اِس کی روح تک کو چھلنی کر دیا تھا۔
سمیعہ باجی اور امی باہر خواتین کے ساتھ اس قصے پر بڑی شدومد سے گفتگو کر رہی تھیں۔ اُسے موقع مل گیا وہ خوب دل بھر کر روئی جی بھر کر اپنی ادھوری محبت کا ماتم کیا اور پھر اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی کرچیاں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے نہ جانے کب اُسے نیند آ گئی صبح وہ سو کر اٹھی تو سر درد

سے بوجھل ہو رہا تھا۔ آج سنڈے تھا۔ گھر میں ابھی سب سو رہے تھے۔ وہ بھاری قدموں سے کچن میں چلی آئی۔ اپنے لیے چائے بنا کر ابھی وہ لاؤنج میں آئی ہی تھی کہ گیٹ پر ہوئی دستک پر وہ چونک سی گئی۔ پیالی میز پر رکھ کر وہ جلدی سے گیٹ پر آئی تو سامنے اُسے مسز جمشید کی ماسی کھڑی ہوئی نظر آئی۔

''بیگم صاحبہ نے آزر صاحب کی شادی کی مٹھائی بھیجی ہے۔'' ٹرے میں رکھی پلیٹوں میں سے ایک پلیٹ اُسے تھماتے ہوئے وہ خوشی سے بولی تو اُس نے بے دلی سے پلیٹ تھام لی تبھی اچانک ہی اُس کی نگاہ سامنے گھر سے نکلتے ہوئے آزر اور اُس کی دلہن پر پڑی جو گلابی سوٹ میں خود بھی ایک کھلا ہوا گلاب لگ رہی تھی۔ دونوں کتنے خوش نظر آ رہے تھے۔

''یہ اتنی صبح صبح کہاں جا رہے ہیں؟'' اُس نے بے ساختہ ہی ماسی سے پوچھا تھا۔

''آج دلہن کے بھائی واپس امریکہ جا رہے ہیں نہ تو یہ لوگ ایئرپورٹ انہیں خدا حافظ کہنے جا رہے ہیں۔'' ماسی جواب دیتے ہوئے ساتھ والے گھر کی طرف بڑھ گئی اور وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ اندر آ گئی۔ پلیٹ میں رکھی ہوئی مٹھائی اُسے سانپ بچھو سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

''اونہہ ایک دن کی دلہن...... نہ شرم نہ حیا...... مزے سے ایئرپورٹ چلی گئی۔'' بلاوجہ ہی اُس نے پلیٹ میز پر پٹخ کر بڑبڑاتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔

اُسی دوپہر جب وہ سمیعہ باجی کے بے حد اصرار پر اُن کے ساتھ اتوار بازار جانے کے لیے نکل رہی تھی تو اُس نے پریشانی کے عالم میں مسز جمشید کو آزر کے ساتھ کار میں جاتے ہوئے دیکھا۔

''سمیعہ باجی مجھے آنٹی کافی پریشان اور روئی ہوئی لگ رہی تھیں میں زرگل سے خیریت معلوم کر کے آتی ہوں۔'' وہ اُن کا جواب سنے بغیر ہی آزر کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ اندر گل بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔

''کیا ہوا گل سب خیریت تو ہے نہ؟'' وہ گھبرا کر اُس کے نزدیک آ گئی۔

''نہیں خیریت نہیں ہے صبح ایئرپورٹ سے واپس آتے ہوئے آزر بھائی کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ آزر بھائی کو تو معمولی چوٹیں آئیں لیکن زنیرہ کافی زخمی ہوئی ہے۔ ونڈ اسکرین کے شیشے ٹوٹ کر اُس کے چہرے کو کافی مسخ کر گئے ہیں۔ آزر بھائی بتا رہے تھے چہرہ پہچانا نہیں جا رہا۔'' گل بھرائی ہوئی آواز میں تفصیل بتا رہی تھی اور اریبہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے جلتے ہوئے دل پر ٹھنڈا پھایہ رکھ رہا ہو۔ گل کی اِس پریشانی پر کتنی کمینی سی خوشی کی چمک لہرا رہی تھی اُس کی آنکھوں میں، تبھی اچانک اُسے محسوس ہوا کہ وہ بھی عزیزہ خالہ بن گئی ہے۔ وہ جس وجہ سے اُن سے چڑتی تھی آج اپنا آپ اُسے بالکل انہی کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''اچھا گل میں چلتی ہوں۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔''

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔ ماسی ہے میرے پاس، گھر میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں اس لیے مما مجھے ساتھ نہیں لے گئیں۔'' اُس کے لہجے میں ہنوز آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ اریبہ بوجھل قدموں سے باہر آئی تو کچھ فاصلے پر رُکے رکشے سے عزیزہ خالہ کو اترتا دیکھ کر وہ اُن سے نظریں چراتی تیزی سے اندر آ گئی۔ آج اُس نے جانا تھا کہ صرف اُس کے ہی دل میں نہیں شاید اس معاشرے کے نوے فیصد لوگوں کے اندر ایک عزیزہ خالہ چھپی ہوئی ہیں جو وقت آنے پر باہر آ جاتی ہیں۔

سپنے سہانے

''توبہ...... توبہ کیسے بے رحم ماں باپ ہیں پھول سی بچی کو پیسہ کمانے کی مشین بنا رکھا ہے۔ خیر باپ تو ہے ہی سدا کا نشہ باز اور شوقین مزاج جو بڑھاپے میں نیا بیاہ رچا کر بیٹھ گیا ہے۔ کم از کم ماں ہی کو کچھ سوچنا چاہیے تھا۔'' پھوپو... نے بھی تبصرہ کرنا ضروری سمجھا۔ اور پھر ساری خواتین کافی دیر تک......

معاشرے کے اُتار چڑھاوٴ سے جڑا ایک بہت خاص ناول چھٹا حصہ

شہاب نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا تھا جب لاہور پہنچ کر اگلے روز عالی تحائف سے لدا پھندا اپنے والدین کے گھر گیا تو ڈیڑھ سال سے اُس کی یاد میں تڑپنے والے والدین یوں اُس سے ملے جیسے وہ کبھی اُس سے ناراض ہی نا ہوئے تھے۔ عالی بھی اُن سے لپٹ کر رو دیا۔ صباحت کو بھی اُس نے خوب پیار کیا۔ اور پھر شہاب کے خریدے ہوئے تحفے یہ کہہ کر اُن کی خدمت میں پیش کیے کہ یہ شہاب نے اُن کے لیے بھیجے ہیں اور اپنی طرف سے کراچی سے خریدے گئے تحفے اور ایک بڑی رقم کا چیک بھی دیا اور یوں عرصے سے بچھڑے والدین بہن اور بھائی کے درمیان پیدا ہونے والی ساری غلط فہمیاں دور ہوگئیں۔

☆......☆......☆

''حارث یہ سب کتنا عرصہ چلے گا۔ ہم تک تک یوں چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے۔ مجھے...... مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو میں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ پلیز کچھ کیجیے میرے اور اپنے اس بے نام رشتے کو کوئی نام دیجیے تاکہ ہم معاشرے میں سر اٹھا کر جی سکیں۔ میں اس گناہ آلود زندگی کو مزید گزارنے کی سکت نہیں رکھتی۔'' حارث ایلڈ کو اس کے گھر چھوڑنے جارہا تھا جب اُس نے روہانسی سی ہوکر حارث سے التجائیہ انداز میں کہا۔

''کون سا گناہ کیسا گناہ؟ جب میں نے پہلی مرتبہ تم سے تعلقات قائم کیے تھے تو تبھی خدا کو حاضر اور ناظر جان کر تمہیں اپنی بیوی مان لیا تھا۔ تم نے بھی مجھے اپنا شوہر مانا تھا تبھی اتنی آسانی سے مان گئی تھیں اس لیے تم پریشان نا ہوا کرو کچھ نہیں ہوگا۔'' حارث نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

''زبردستی کے تعلق کو آپ میری رضامندی نہیں کہہ سکتے اور ایسے کسی بھی تعلق اور رشتے کی کوئی حیثیت نہیں ہے جسے ہمارا مذہب اور معاشرہ تسلیم نا کرے ورنہ آپ یوں مجھ سے چھپ چھپ کر کیوں ملتے ہیں۔ ساری دنیا کے سامنے مجھے بیوی تسلیم کرکے اپنے گھر میں لے جاتے...... مگر آپ خود بھی جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط ناجائز اور گناہ ہے۔ اور صرف مجھے جھوٹی تسلی دینے کے لیے یہ تاویل گھڑی ہے کہ آپ نے مجھے بیوی مان کر ہی مجھ سے تعلقات قائم کیے تھے۔ ورنہ میری حیثیت آپ کے نزدیک ایک کال گرل سے زیادہ نہیں۔'' ایلڈ نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''میں اب تمہیں سے تنگ آچکا ہوں کہ تم آخر مجھ سے

چاہتی کیا ہو میں تمہارے وہ سارے حقوق پورے کر رہا ہوں جو ایک بیوی کا حق ہوتا ہے۔ تمہیں ایک معتبر ادارے میں جاب دلوائی ہے تمہیں آفس خود چھوڑنے جاتا ہوں واپسی کا بھی بندوبست کر رکھا ہے۔ پھر تمہارے گھر بھی اکثر جاتا رہا ہوں تمہارے والد اور دیگر کے لیے تحفے تحائف بھی لے جاتا ہوں۔ تمہارے سارے بھائیوں بہنوں کو تعلیم دلوا رہا ہوں۔ تمہاری والدہ کو بھی گھر کے اخراجات کے لیے ہر ماہ ایک معقول رقم دیتا ہوں۔ تمہیں کپڑوں جوتوں کے لیے پیسے دیتا رہتا ہوں اور کیا کروں؟'' حارث نے گاڑی کی اسپیڈ تیز کرتے ہوئے غصے سے کہا۔

''کاش آپ یہ سب کچھ نا کرتے بس مجھ سے نکاح کے دو بول پڑھوا کر باعزت طریقے سے مجھے رخصت کروا کر اپنے گھر لے جاتے۔ مجھے روکھی سوکھی دیتے تو میں تب بھی خوش رہتی کہ ایک جائز رشتے کی ڈوری میں بندھی ہوئی ہوں۔ مگر آپ نے تو مجھے میری نظروں ہی سے گرا دیا ہے۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ضرور ہے۔ مگر ہم شریف اور غیرت مند لوگ ہیں۔'' انیلہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

''ہوں...... شریف اور غیرت مند ایسے ہی تو ہوتے ہیں باپ نشہ کرتا ہو، اپنی بیٹی کی عمر کی ایک نیم دیوانی لڑکی سے شادی رچا کر اُس کے ناجائز بچے کو پالتا ہو۔ بیٹی میٹرک کے بعد چھوٹی چھوٹی نوکریوں کے لیے دھکے کھاتی پھرتی ہو بیٹے آوارہ گرد ہوں، باقی بیٹیاں گھر میں تعلیم کے بغیر فاقوں پر مجبور ہوں یہ ہے تمہاری اصلیت اور بنتی ہو بڑی شریف زادی۔'' حارث نے نفرت سے کہا اور پھر ایک طرف گاڑی روک کر کہا۔

''اترو گاڑی سے اور آئندہ مجھ سے کوئی تعلق نا رکھنا۔ جس تعلق کو گناہ کہتی ہو اُسی کی بدولت تمہارا سارا خاندان عیش کرتا پھرتا ہے گناہ ہے تو گناہ ہی سہی۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ایسا کون سا حاتم ملتا ہے جو تمہاری بے لگام خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے بے دردی سے پیسہ لٹاتا رہے اور بدلے میں تم سے کچھ نا چاہے میں نے بہت دیکھی ہیں تم جیسی نیک پروینیں۔'' اور اُس سے پہلے کہ انیلہ کچھ کہے حارث نے اپنی سیٹ سے اُٹھ کر اُس کی طرف آ کر دروازہ کھولا۔ اُسے زبردستی گاڑی سے باہر نکالا۔ زور سے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی تیزی سے موڑ کر غائب ہو گیا۔ انیلہ کچھ دیر خاموش کھڑی روتی رہی۔ پھر اُس نے پاس سے گزرنے والے ایک رکشے کو روکا۔ اور اُس میں بیٹھ کر آفس چلی گئی۔

آفس آ کر اپنے کیبن میں بیٹھ کر اُس نے سب سے پہلے حارث کا نمبر ڈائل کیا۔ مگر اُس نے اپنا نمبر آف کر رکھا تھا جتنی دیر انیلہ آفس میں رہی اُس کا نمبر آف ہی ملتا رہا۔ رات کو گھر آ کر بھی جب تک نیند نہیں آ گئی۔ موبائل پر اُس کا نمبر ٹرائی کرتی رہی۔ مگر ہر بار اُسے مایوسی ہی ہوئی۔ اگلا پورا ہفتہ نا حارث نے اُسے خود فون کیا نا اُس کا فون اٹینڈ کیا۔ اور نا ہی اُسے پک کرنے کے لیے آیا وہ پارلر سے نکل کر بس اسٹاپ پر آتی اور دیر تک کھڑی اُس کا انتظار کرتی رہتی کوئی بھی سیاہ یا نیلے رنگ کی ٹیوٹا کرولا یا کلٹس اُس کے قریب سے آہستہ ہو کر گزرتی تو وہ بے قرار ہو کر اُس کی جانب لپکتی مگر گاڑی آگے بڑھ جاتی۔ بالآخر مایوس ہو کر رکشا لے کر آفس چلی جاتی۔ آفس میں بھی اُس کا دل نا لگتا۔ اور وہ بار بار حارث سے رابطہ کرنے کی سعی کرتی۔

اب اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ حارث کی کس قدر عادی ہو گئی تھی۔ اُس کی تمام تر زیادتیوں کے باوجود جانے کب وہ اُس کے دل میں بس گیا تھا۔ یا پھر بار بار ملنے کی وجہ سے وہ اُس کی عادی ہو گئی تھی پھر اُس کی دولت کی کشش بھی تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب حارث کے علاوہ وہ کسی اور کے قابل بھی نہیں رہ گئی ہے۔

اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی بھی حارث سے شادی کے موضوع پر بات نہیں کرے گی۔ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے گی۔ اور حارث جب مرضی ہو گی اُسے اپنا لے گا فی الحال تو جتنا ہو سکے اُس سے فائدہ حاصل کر لے۔ بہنوں کی اچھے گھرانوں میں شادیاں ہو جائیں بھائی دونوں کوئی ہنر سیکھ کر باہر چلے جائیں۔ کسی اچھے علاقے میں اپنا صاف ستھرا سا گھر بن جائے۔ ایک اُس کی ذات کی قربانی سے اگر اُس کے گھرانے کی تکلیفیں دور ہو جائیں اور اُن کے حالات

بدل جائیں تو یہ مہنگا سودا نہیں ہے۔ پھر بے شک حارث اُسے ٹھکرا دے یا اُس سے شادی کرے یہ سب سوچ کر ہی اُس نے حارث سے رابطہ کرنے کی مسلسل کوشش جاری رکھی۔

بالآخر دو ہفتے کے بعد حارث نے اُس کا فون ریسیو کیا تو انیلہ کے لیے گویا سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ جیسے اُسے دو جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ اُس نے رو رو کر حارث سے معافی مانگی اور اُسے ہر ممکن یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اُس کی چاہت کی آگ میں گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی ہے اور اُس کے بغیر مزید ایک پل بھی گزارنا اُس کے لیے ناممکن ہے اُس نے اُسے دھمکی دی کہ اگر وہ اُس سے راضی نا ہوا تو وہ خودکشی کر لے گی۔

"ٹھیک ہے یہ آخری مرتبہ ہے اب اگر آئندہ تم نے مجھ سے کوئی ایسا ویسا مطالبہ کیا تو پھر میں کبھی تم سے نہیں ملوں گا۔" دوٹوک لہجے میں کہہ کر حارث نے فون بند کر دیا۔ تو انیلہ جیسے دوبارہ جی اٹھی۔

اگلے روز پارلر کے قریبی اسٹاپ پر وہ حارث کی منتظر تھی جوں جوں وقت گزر رہا تھا اُس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد جب اُس کے قریب سیاہ رنگ کی ٹیوٹا آ کر رکی اور حارث نے اپنے مخصوص انداز میں ہارن دیا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے تپتے ہوئے صحرا میں آبلہ پا چلتے چلتے جیسے اچانک ہی گھنے سرسبز درختوں کے فرحت بخش ٹھنڈے سائے میں پہنچ گئی ہو۔ اپنے بے تحاشا دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"کیسی ہو؟" حارث نے سامنے ونڈ اسکرین پر اپنی نگاہیں جما کر لب بھینچ کر پوچھا۔

"جی رہی ہوں۔"

"آ...... چھا...... واقعی تم تو کہہ رہی تھیں کہ میرے بنا تمہارے لیے جینا محال ہو رہا ہے۔" حارث نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اگر سانسوں کی آمد و رفت کا نام ہی زندگی ہے تو شاید میں زندہ ہوں ورنہ تو......"

"اچھا چھوڑو ایسی باتیں چلو آج ویلج میں ہائی ٹی پر چلتے ہیں اُن کی بعض ڈشز بہت زبردست ہیں۔" حارث نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد حارث نے ویلج ہوٹل کے پارکنگ میں گاڑی روک دی۔ اور انیلہ کے ہمراہ ہوٹل کے گلاس ڈور کو کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر کے ٹھنڈے پُرسکون ماحول میں عجیب سی تراوٹ کا احساس ہو رہا تھا۔

انیلہ زندگی میں پہلی مرتبہ ایک پوش علاقے کے اتنے بڑے ہوٹل میں آئی تھی تو اُسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا انہوں نے ایک کونے والی میز منتخب کی۔ اور پھر حارث جا کر دو پلیٹوں میں مختلف قسم کی کھانے کی چیزیں لے آیا اور کولڈ ڈرنکس بھی منگوائیں اس طرح تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ ریستوران کے پُرسکون ماحول میں بیٹھے دنیا جہاں کی باتیں بھی کرتے رہے اور ساتھ ساتھ مزے مزے کے اسنیکس سلاد اور دوسری مزیدار چیزوں سے انصاف کرتے رہے۔ آخر میں حارث گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے اور ساتھ گرما گرم پکوڑے لے آیا گرم چائے، کے ساتھ اے سی کے ٹھنڈے ماحول میں مزیدار پکوڑے خوب لطف دے گئے۔ باہر اس قدر گرمی ہے اور ہم یہاں گرم چائے اور پکوڑے کھا رہے ہیں۔ انیلہ نے کھڑکی سے باہر چمکتی ہوئی مئی کی دھوپ کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں اور اندر گرمی کا احساس ہی نہیں ہو رہا۔ ان ہوٹل والوں کو لوڈ شیڈنگ محسوس ہی نہیں ہوتی ہے کیونکہ جیسے ہی لائٹ جاتی ہے اُن کے جنریٹر آن ہو جاتے ہیں ۔ ظاہر ہے ان کا اس قدر بزنس چلتا ہے انہیں کیا فرق پڑتا ہے جتنے مرضی جنریٹر چلائیں۔ دیکھو نا کیسے پورا ہال تقریباً بھرا ہوا ہے۔ یہ سارے لوگ مختلف دفاتر میں کام کرتے ہیں کچھ کاروباری لوگ ہیں جو دوپہر کو کھانے کے وقفے میں یہاں مل بیٹھ کر کھاتے پیتے بھی ہیں اور سارے دن کی تھکان بھی اُتار لیتے ہیں۔ حارث نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"یہ سب پیسے کا کھیل ہے آپ کے پاس کھلا پیسہ ہو تو آپ دنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہیں ورنہ تو ایک ایک چیز کے لیے ترستے ہی رہو۔" انیلہ نے حسرت بھرے انداز میں کہا۔

"فکر نا کرو میری شہزادی میں تمہاری ہر خواہش

پوری کردوں گا اللہ کا دیا بہت کچھ ہے میرے پاس۔'' حارث نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ کا ساتھ میرا نصیب ہے۔اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔میری سب سے بڑی دولت آپ کی پُرخلوص چاہت ہے۔'' انیلہ نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

''اوکے میم..... میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے پانچ بجنے میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں آج مجھے تمہارے باس سے بھی ملنا ہے۔'' حارث نے قریب سے گزرنے والے بیرے کو اشارے سے بل لانے کو کہا۔

''انہوں نے اپنے ہوٹل کا نام دیکھ رکھ کر ویسا ہی ماحول بنانے کی کوشش کی ہے باہر اسی طرح کا پینٹ کیا گیا ہے۔جیسے مٹی کی لپائی کی گئی ہو۔اندر مدھانیوں، چنگیروں اور چھابوں سے سجاوٹ کی گئی ہے۔'' انیلہ نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ سب کاروباری ہتھکنڈے ہیں۔اپنے دیسی کلچر کو پروموٹ کرنے کا تو محض بہانہ ہے۔'' حارث نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

انیلہ کی پھوپو کی بیٹی کی اگلے ہفتے شادی تھی۔ہفتہ پہلے ہی ڈھولک رکھ دی گئی تھی گھر کی چھت پر دریاں بچھا کر اور لائٹ جلا کر گھر کی اور محلے کی ساری لڑکیاں بیٹھ کر رات گئے تک ڈھولک بجا کر شادی بیاہ کے گیت گاتی رہتیں پھر لڈی اور ڈانس کی پریکٹس ہوتی۔بجیلہ اور راحیلہ ڈھولکی بجانے کے ساتھ ڈانس اور لڈی کی پریکٹس کرنے میں بھی پیش پیش تھیں۔

لڑکیوں کی مائیں پاس بیٹھ کر انہیں تنقیدی نظروں سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ مشورے دینے میں مصروف رہتیں۔

''اے بجیلہ انیلہ نظر نہیں آرہی۔وہ تو شام کو چھ سات بجے تک آجایا کرتی ہے،سو رہی ہے کیا؟'' تائی اماں نے لڑکیوں کے درمیان انیلہ کو نا پا کر بجیلہ سے پوچھا۔

''وہ تائی اماں دراصل آپی اب شام والے آفس میں کام کرتی ہیں اور وہ شام کے پانچ بجے سے دس بجے تک رات کے ساڑھے دس بجے آفس کی گاڑی انہیں چھوڑ کر جاتی ہے۔'' بجیلہ نے ڈھولکی بجاتے بجاتے رُک کر جواب دیا۔

''ہائے..... ہائے کتنا ظلم ہے بچی کے ساتھ پہلے سارا دن کام کرتی تھی اور اب رات کو بھی.....'' منجھلی چچی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''اگر وہ شام کے آفس میں کام کرتی ہے تو پھر سارا دن کہاں ہوتی ہے۔دن کو بھی کبھی نظر نہیں آئی۔'' چھوٹی چچی نے کہا۔

''دن کے وقت آپی سعدیہ آنٹی کے پارلر میں کام کرتی ہیں۔اور وہیں سے اپنے آفس چلی جاتی ہیں۔'' کمر کے گرد دوپٹہ باندھے لڈی کے اسٹیپ لیتی ہوئی راحیلہ نے رُک کر کہا۔

''توبہ..... توبہ کیسے بے رحم ماں باپ ہیں پھول سی بچی کو پیسہ کمانے کی مشین بنا رکھا ہے۔خیر باپ تو ہے ہی سدا کا نشہ باز اور شوقین مزاج جو بڑھاپے میں نیا بیاہ رچا کر بیٹھ گیا ہے۔کم از کم ماں ہی کو کچھ سوچنا چاہیے تھا۔'' پھوپو نے بھی تبصرہ کرنا ضروری سمجھا۔اور پھر ساری خواتین کافی دیر تک انیلہ کو لے کر اُسی کے بارے میں باتیں کرتی رہیں اس اثناء میں نیچے گلی میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

''انیلہ آپی آگئیں۔'' چھوٹی نبیلہ نے منڈیر سے گلی میں جھانک کر چلاتے ہوئے کہا۔

تو سبھی خواتین نے ایک دوسری کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔اور دوبارہ کھسر پھسر کرنے لگیں۔رات کو دیر تک یہ محفل جمی رہی اور پھر جب لڑکیاں گا گا کر اور ناچ ناچ کر تھک گئیں تو وہیں دریوں ہی پر پڑ کر سو رہیں کیونکہ نیچے تو گرمی اور گھٹن کے مارے برا حال تھا۔

انیلہ اور صغریٰ بیگم نیچے اپنے کمرے ہی میں رات بسر کرتی تھیں۔جب لائٹ چلی جاتی تو وہ ہاتھ والا پنکھا جھلتی رہتیں اگرچہ حارث نے انیلہ کو چارج ایبل فین لے دیا تھا۔جو لائٹ جانے پر خودبخود آن ہوجاتا تھا۔مگر صدیق نے دیکھا تو وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں لے گیا کہ بچے کو مچھر کاٹتے ہیں گرمی کی وجہ سے اُسے رات بھر نیند نہیں آتی۔اور انیلہ کُڑھ کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

''ارے بھئی حرا کہاں ہو۔ تمہارے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔ مگر پہلے تمہیں وہ کام کرنے ہوں گے۔'' عدیل نے حرا کے گھر میں لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ تو حرا جو ریموٹ ہاتھ میں پکڑے ٹی وی پر چینلز سرچ کر رہی تھی۔ عدیل کو خلافِ توقع بغیر فون کیے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر چونک پڑی۔

''یہ آپ کہاں سے اچانک ٹپک پڑے کم از کم فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع تو دے دیتے۔'' حرا نے ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔

''بس آج میرا دل چاہا کہ تمہیں سرپرائز دیا جائے۔'' عدیل نے مسکرا کر کہا۔

''کیا بات ہے بڑے خوش نظر آ رہے ہیں آج؟'' حرا نے عدیل کے خوشی سے گلنار چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

''میں ہمیشہ ہی خوش رہتا ہوں۔ تم نے مجھے کب روتے دیکھا ہے۔'' عدیل نے صوفے پر لیٹنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

''یہ آج گھر میں سناٹا کیوں ہے باقی قوم کدھر ہے؟''

کون سی قوم اور کیسی قوم؟ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ ایاز بھائی اور صوفیہ بھابی ویک اینڈ پر لانگ ڈرائیو کے لیے نکل جاتے ہیں۔ کھانا بھی باہر سے کھا کر رات گئے گھر آتے ہیں پاپا کی آج بزنس میٹنگ ہے۔ جبکہ ماما کی فرینڈز کی گیٹ ٹو گیدر ہے۔ سو اس وقت گھر میں یہ بندی ہی موجود ہے۔'' حرا نے تفصیل سے گھر کے باقی افراد کی سرگرمیوں کے بارے میں عدیل کو انفارم کیا اور پھر کہنے لگی۔

''ویسے عدیل آپ کو بغیر بتائے آنے کی سزا ملے گی کہ آج چائے پر آپ کی پسندیدہ چیزوں میں سے کوئی بھی نہیں مل سکیں گی۔'' البتہ بیکری کے آئٹم حاضر ہیں۔''

''چلو کوئی بات نہیں یہی ٹھیک ہے۔ ہاں اگر ہو سکے تو رات کے کھانے میں مٹن قورمہ اور چکن بریانی بنوالو اور ساتھ کچے قیمے کے کباب۔ اور فروٹ ٹرائفل بھی۔'' عدیل نے ایک ہی سانس میں اپنے پسندیدہ کھانوں کا آرڈر دے دیا۔

''توبہ ہے عدیل آپ کتنے چٹورے ہیں۔ یہ تو سوچیے کہ اس وقت شام کے سات بج رہے ہیں۔ اتنے کم وقت میں اتنا کچھ کیسے تیار ہوگا۔ جبکہ گھر کے باقی افراد میں سے کسی کا بھی گھر میں آج کھانا کھانے کا پروگرام نہیں ہے۔ دوپہر کریلے گوشت اور کوفتے بنے تھے۔ ساتھ میں کھیر بھی ہے۔ آپ کہیں تو چاول بھی بنوا لیتے ہیں۔'' حرا نے وضاحت سے کہا۔

''او کے میڈیم جو دال دلیہ میسر ہے وہی باقی آئندہ۔'' عدیل نے اطمینان سے ٹی وی آن کرتے ہوئے کہا۔

''مگر آپ نے بتایا نہیں کہ وہ گڈ نیوز کیا ہے جس کا نعرہ آپ نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی لگایا تھا۔'' حرا نے پوچھا۔

''ارے ہاں...... پہلے یہ بتاؤ کہ وہ جو تم نے اپنی دوست سامیہ کے کہنے پر نئی ملازمہ رکھی تھی۔ وہ ہے ابھی کہ چلی گئی۔''

''وہ تو کب کی ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔'' حرا نے حیرت سے کہا اور پھر پوچھنے لگی۔

''لیکن آپ کو آج اتنے عرصے بعد اُس ملازمہ کا کیسے خیال آگیا ہے۔''

''چلو اچھا ہوا وہ دفعان ہوگئی۔ وہ تو اُس نے ہونا ہی تھا۔ جس مقصد کے لیے اُس کو رکھوایا گیا تھا وہ جو پورا ہوگیا۔'' عدیل نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' حرا حیران تھی۔

''بھئی تمہارے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ مجھے تمہاری دوست سامیہ کا پتہ چل گیا ہے۔ اور اُس کو طلاق دلوانے میں اہم کردار اسی تمہاری نئی ملازمہ نے ہی ادا کیا تھا۔ دراصل سامیہ کے سابق شوہر نے اسے یہاں سامیہ کی جاسوسی کرنے کی غرض سے رکھوایا تھا۔'' عدیل نے کسی ماہر سراغ رساں کے انداز میں کہا۔

''آپ کو سامیہ کا پتہ چل گیا۔ کیا واقعی...... اس وقت کہاں ہے...... وہ کیسے ملی آپ کو...... ؟ پلیز جلدی بتائیں۔'' حرا نے خوشی سے بے قابو ہو کر ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''ارے بابا بتاتا ہوں...... ذرا سانس تو لینے دو......

نا چاہئے پانی پوچھا اور آتے ہی باتوں میں لگالیا۔ بول بول کر میرا منہ خشک ہو رہا ہے۔ پہلے ٹھنڈا ٹھار جوس پلواؤ..... پھر تگڑی سی چائے بنواؤ..... تب تک میں ذرا فریش ہوآؤں۔'' یہ کہہ کر عدیل گیسٹ روم کی جانب بڑھ گیا اور حرا چائے اور دیگر لوازمات تیار کروانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

چائے پینے کے بعد عدیل نے حرا سے کہا۔

''چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ تیار کیا ہونا ہے ٹھیک ہی ہو۔ کیونکہ تیاری میں تم گھنٹہ لگادو گی۔ اور تب تک کافی دیر ہو جائے گی۔''

''مگر جانا کہاں ہے؟'' حرا نے اُلجھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بھئی سامیہ کو لینے جانا۔''

''ارے واقعی...... تو یہ آپ نے آتے ہی کیوں نہیں بتایا۔''

''پھر تم فوراً ہی جانے کی ضد کرتیں اور میں چائے پی کر ہی جانا چاہتا تھا۔''

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں سامیہ کے ہاسٹل کی طرف رواں دواں تھے۔ راستے میں عدیل نے حرا کو سامیہ سے اچانک ملاقات کے بارے میں بتایا۔ اور اُس کو طلاق ہونے کی وجہ بھی بتائی۔

حرا غصے سے کھول اٹھی۔

''اُف توبہ کس قدر گھٹیا ذہنیت کا شخص ہے سامیہ کا شوہر۔''

''شوہر نہیں سابق شوہر۔'' عدیل نے تصیح کی۔

جب وہ لوگ سامیہ کے ہاسٹل پہنچے تو وہ اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ لوگ کچھ دیر سامیہ کے پاس رُک کے پھر اُسے لے کر واپس آ گئے۔ راستے میں ایک آئس کریم پارلر پر رُک کر آئس کریم کھائی اور پھر گھر آ گئے۔

عدیل نے جب سامیہ کو بتایا کہ وہ دو سال کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جا رہا ہے تو بے ساختگی سے سامیہ بولی۔

''کاش میں بھی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ جا سکتی یہاں تو ویسے بھی میرا اب دل نہیں لگ رہا۔ پاپا نے [illegible] میں میرا داخلہ ممنوع کر دیا ہے

امی اور بہنیں بھائی بھی نہیں ملتے۔ بس کبھی کبھار ان سے فون پر بات ہو جاتی ہے۔ میری زندگی تو بس کالج اور ہاسٹل تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ دو تین ماہ بعد ایگزام ہو جائیں گے پھر میری پڑھائی کا ایک سال اور ایک سال ہاؤس جاب ہو گا۔ تب تک تو میں ہاسٹل میں رہ سکتی ہوں اس کے بعد سمجھ نہیں آتی کہ کہاں جاؤں گی۔

عدیل دل ہی دل میں اس باہمت لڑکی کو سراہ رہا تھا۔ جو اس قدر نامساعد حالات میں بھی اس قدر لگن سے اپنی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اور پھر اُس نے اُسی لمحے ایک فیصلہ کر لیا۔

''سنو سامیہ تمہاری ساری زندگی اب تمہارے سامنے پڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ تم ایک معصوم سی سیدھی سادھی لڑکی ہو۔ اس طرح کب تک بغیر کسی سہارے کے تم رہ سکتی ہو اس صورت میں کہ تمہارے اوپر والدین کے گھر کے دروازے بھی بند ہو چکے ہیں تو اگر میں تم سے ایک درخواست کروں تو مان لو گی۔'' عدیل ایک دم ہی آپ سے تم پر آ گیا۔

''ہاں..... ہاں کیسے وعدہ نہیں کرتی۔ اگر ماننے والی بات ہوئی تو ضرور مانوں گی۔'' سامیہ نے کچھ سوچ کر محتاط لہجے میں کہا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کی بے دھیانی میں اپنے حالات کے بارے میں بتائی گئی باتوں سے متاثر ہو کر عدیل شاید اظہار ہمدردی کے طور پر اُسے مالی مدد کی پیش کش کرنے والا ہے۔ جو کہ ظاہر ہے وہ کسی صورت بھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے اس طرح جواب دیا تھا۔

''میں ایک بات صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں تم پر کوئی جبر یا زبردستی نہیں۔ کیونکہ تم پہلے ہی والدین کے زبردستی کے فیصلے کا خمیازہ بھگت رہی ہو۔ تم میری پیش کش پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور اگر تمہیں مناسب لگے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ کوئی مجبوری نہیں ہے۔ تم جتنا چاہو وقت لے سکتی ہو مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔''

''آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں جو بات ہے صاف صاف کہیے یوں پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں۔'' سامیہ نے اُلجھ کر [illegible] کی پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں نمودار

ہوگئی تھیں۔ جو اس کی الجھن اور ذہنی خلفشار کو آشکار کر رہی تھیں۔

''ایک منٹ ابھی آیا۔'' یہ کہہ کر عدیل اپنے لیے مخصوص بیڈ روم میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد سامیہ کو اپنے موبائل پر ایک ایس ایم ایس موصول ہوا۔ جس پر تحریر تھا۔

''مجھ سے شادی کرو گی؟''

یہ تحریر پڑھ کر سامیہ کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے جوابی ایس ایم ایس تحریر کیا۔

''ہمدردی کر رہے ہیں کیا؟''

''ہرگز نہیں...... یہ میری زندگی کی اولین تمنا ہے کہ تم میری جیون ساتھی بنو۔ میں تو پہلی نظر ہی میں تمہیں دیکھ کر چاہنے لگا تھا۔''

سامیہ اپنے اتھل پتھل ہوتے دل کو سنبھالنے کی سعی کرتے ہوئے خاموشی سے اس کے میسج پر غور کرنے لگی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے اس قدر والہانہ انداز میں اظہارِ محبت کیا تھا۔ قدرت نے اُس کے دکھوں اور محرومیوں کا مداوا اس قدر خوبصورت صورت میں کیا تھا کہ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اپنی خوش قسمتی پر کس طرح ناز کرے۔ کس طرح خدا تعالیٰ کی عنایت کا شکریہ ادا کرے۔ عدیل نے سامیہ کو فون کیا۔

''آپ کو میری باتیں بری لگیں کیا؟ اگر ایسا ہے تو پلیز معاف کردو مجھے...... میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگیا تھا۔'' عدیل نے سامیہ کی خاموشی کو محسوس کر کے دوسری طرف سے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

بالآخر سامیہ نے ہمت کی اور لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''آپ...... آپ واقعی ڈاکٹر ہیں یا شاعر؟''

''ہاں یار مذاق ازالو میرا لوگ سچے چاہنے والوں کی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی باتوں کو شاعری کہہ کر نظر انداز کر کے بے چارے کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ محبت کرنے کی سزا تو بہر حال بھگتنی ہی پڑتی ہے۔'' عدیل نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

''اچھا تو! ڈاکٹر صاحب سنیے مجھے آپ کے فیصلے سے انحراف تو نہیں ہے۔ البتہ ایک شرط ہے میری۔'' سامیہ نے خوشی سے بھرپور آواز میں کہا۔

''ہاں...... ہاں بولو...... تمہاری ہر شرط سر آنکھوں پر۔'' عدیل نے جلدی سے کہا۔

''آپ کو میرے رشتے کے لیے میرے والدین سے بات کرنی ہوگی۔'' سامیہ نے کہا۔

''وہ تو میں کرلوں گا۔ مگر میں ایاز اور اُس کے گھر والوں ہی کو لے کر جاؤں گا۔ کیونکہ اپنے خان بابا سے بات کرنے کی فی الحال مجھ میں جرأت ہے نا ہی ایسا ممکن ہے۔ بڑے دبنگ قسم کے پٹھان ہیں۔ وہ بھی قبائلی علاقے کے...... جو بندے سے بات بعد میں پوچھتے ہیں بندوق پہلے نکال لیتے ہیں۔'' عدیل نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''بہر حال اب گیند آپ کے کورٹ میں ہے آپ نے میرے والدین کو رضامند کرنا ہے کیونکہ اُن کی مرضی کے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی اور ہاں انہیں یہ بھی علم نہیں ہونا چاہیے کہ میں آپ کو پہلے سے جانتی ہوں۔ اس طرح وہ سمجھ جائیں گے کہ وہاب کا مجھ پر شک صحیح ہے۔''

''بات تو واقعی ٹھیک ہے اس سلسلے میں میں اس بندے کی ذہانت کی داد دیتا ہوں عقل مند تھا جو خود ہی راستے سے ہٹ گیا۔ ڈر گیا ہوگا کہ مد مقابل پٹھان ہے۔'' عدیل نے چونچال لہجے میں کہا۔

''پلیز...... عدیل......''

''او کے میم......''

''اور ہاں اب فون بند کر کے باہر تشریف لے آیئے۔ حرا کسی بھی وقت آسکتی ہے وہ کیا سوچے گی کہ یہ ہم کیا ڈرامہ کر رہے ہیں۔''

''دیکھو لڑکی تم میرے اظہار محبت کو ڈرامہ کہہ کر میرے جذبات کی توہین مت کرو۔ ورنہ......''

''ورنہ...... کیا؟''

''ک...... کچھ نہیں۔'' عدیل نے مصنوعی گھبراہٹ سے کہا اور پھر فون بند کر کے کمرے سے باہر آگیا۔

اُس کی والہانہ نظریں بار بار سامیہ کے حسین چہرے

کا طواف کر رہی تھیں۔ اور اُس کی کانوں کی لویں سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔ فون پر جس طرح بے باکی سے اُس سے بات کی تھی۔ اب اُس کا سامنا کرنے کی اُس میں ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ بے طرح شرمائے جا رہی تھی۔

اُس کو عدیل کے سامنے اس قدر گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی کہ وہ کہہ کر کچن کی طرف بھاگ گئی کہ ''میں دیکھوں تو سہی یہ حرا کہاں رہ گئی۔''

وہ کچن میں داخل ہوئی تو وہ منظور چچا کے ساتھ ساتھ خود بھی جلدی جلدی کھانا بنا رہی تھی۔

''ارے بھئی مجھے یہاں لاکر خود محترمہ کچن میں گم ہو گئیں اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ جو روٹین میں بنتا ہے وہی کافی تھا۔ میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں۔''

''لیکن بیٹا آپ آج کتنے عرصے بعد آئی ہو ہم تو آپ کی صورت دیکھنے کو ترس گئے تھے۔'' منظور چچا نے بڑے شفیق لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ بھی منظور چچا بہت یاد آتے تھے مگر بس تھی کوئی مجبوری۔'' سامیہ نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔

''سامی تم کیوں یہاں گرمی میں آ گئیں۔ میں بس آ ہی رہی تھی۔ وہ دراصل رضیہ ماسی گاؤں چلی گئی ہے اس لیے میں نے سوچا کہ منظور چچا کی کچھ مدد ہی کر دوں۔''

''مجھے بھی کوئی کام بتا دو۔ میں وہاں بیٹھی بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ کچھ ہیلپ ہی کر دوں۔'' سامیہ نے پیش کش کی۔

''ارے نہیں سب کچھ تیار ہے بس کھانا میز پر لگانا ہے وہ منظور چچا لگا دیں گے۔ آؤ تم میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر حرا سامیہ کا ہاتھ پکڑ کر کچن سے باہر آ گئی۔

عدیل لاؤنج میں بیٹھا کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ انہیں آتا دیکھ کر بولا۔

''آج پہلی مرتبہ میں ایاز کی غیر موجودگی میں آیا ہوں۔ اور تم خواتین نے مجھے حد سے زیادہ بور کر دیا ہے۔ اور یہ ایاز بھی شادی کے بعد سے بیگم ہی کو پیارا ہو کر رہ گیا ہے۔ مل کر ہی نہیں دیتا۔''

''دراصل آپ بھی اچانک ہی آ گئے نا۔ آنے سے پہلے فون کر دیتے۔ تو وہ آپ کا انتظار کر لیتے۔ چونکہ صوفیہ کو کچھ شاپنگ بھی کرنی تھی۔ اس لیے وہ جلدی گھر سے نکل گئے۔ وہ تو مجھے ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے مگر میں نے یہ سوچ کر گھر ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا کہ کوئی مہمان ہی نہ آ جائے۔'' حرا نے کہا۔

''دیکھو ایک کی بجائے دو دو مہمان آ گئے۔ واقعی ٹھیک کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔'' عدیل نے سامیہ کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ تو وہ بری طرح شرما گئی شکر ہے کہ حرا کا دھیان ٹیبل پر برتن لگاتے ہوئے منظور چچا کی طرف تھا ورنہ اُس کی تیز نظروں سے عدیل کا والہانہ انداز اور سامیہ کا شرم سے گلنار چہرہ پوشیدہ نا رہتا۔ اس لیے سامیہ نے حرا کی نظر بچا کر عدیل کو تنبیہی انداز میں گھورا۔ تو اُس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی۔ تو بے اختیار سامیہ مسکرا دی۔

تینوں نے مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ ساتھ ساتھ حرا کی کوکنگ کو بھی سراہا گیا۔ کھانے کے بعد وہ باہر لان میں آ گئے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے قدرے تاریکی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ جس سے گرمی کی شدت خاصی کم ہو گئی تھی۔ وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے لان کی ہری ہری گھاس پر چہل قدمی کرنے لگے۔ اسی دوران پہلے حرا کی ماما آ گئیں۔ وہ ان لوگوں کو دیکھ کر سیدھی ادھر ہی چلی آئیں۔

''ماما دیکھیے تو کون آیا ہے؟'' حرا نے خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

''بھول تو نہیں گئیں۔ ارے ماما۔ یہ آپ کی دوسری لاڈلی بیٹی ہے۔'' حرا نے سامیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی میں اپنی بیٹی کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ کیسی ہو سامی بیٹا..... کہاں رہ گئی تھیں۔'' ماما نے سامیہ کو گلے لگا کر اُس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

''آئی ایم سوری آنٹی بس میں اپنی الجھنوں میں ایسی کھوئی کہ آپ سب محبت کرنے والی ہستیوں سے کچھ عرصے کے لیے دور ضرور ہوئی مگر میرا دل آپ لوگوں سے ملنے کے لیے ہر لمحہ بیقرار رہتا تھا۔ سامیہ نے ماما کے گلے میں اپنی مرمریں بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ساتھ جو سانحہ ہوا ہے اُس کا افسوس تو مجھے بہت ہے۔ مگر شاید تمہاری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ عموماً بے جوڑ رشتوں کا انجام ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ انشاء اللہ تمہارے لیے مستقبل میں بہتر ہی ہوگا۔'' ماما نے خلوص سے کہا۔ اور پھر عدیل سے بولیں۔

''تم کیسے ہو...... عدیل بیٹا۔''

''شکر ہے ماما آپ کی نظر اس ناچیز پر بھی پڑ گئی ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ اپنی لاڈلی دوسری بیٹی کو دوبارہ پا کر شاید آپ مجھے بھول ہی گئی ہیں۔ حالانکہ ان محترمہ کو دوبارہ ڈھونڈنے کا کارنامہ بدولت ہی نے سرانجام دیا ہے۔'' عدیل نے اپنی بولتی ہوئی نگاہیں سامیہ کے چہرے پر مرکوز کر کے ماما سے شوخ لہجے میں کہا۔ ماما نے ہنس کر عدیل کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

''اچھا بچو تم لوگ موسم کو انجوائے کرو میں ذرا چینج کر لوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گھر کی طرف چلی گئیں۔ اور یہ تینوں پھر سے اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے باتیں کرتے کرتے عدیل کوئی نا کوئی معنی خیز شوخ سا جملہ اچھال دیتا۔ جس سے سامیہ بے چاری پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔

صوفیہ اور ایاز کے آنے پر عدیل اُن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تو حرا نے آہستہ سے سامیہ سے کہا۔

''یہ آج عدیل کو کیا ہو گیا ہے۔ اتنے شوخ کیوں ہو رہے ہیں۔'' یہ سن کر سامیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ بری طرح نروس ہو گئی کہ کہیں حرا کو اصل بات کا علم تو نہیں ہو گیا۔ مگر پھر صوفیہ کے قریب آنے پر حرا نے اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں کی۔ اور سامیہ نے بھی سکون کی گہری سانس لی۔ حرا نے صوفیہ سے سامیہ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''صوفی اس سے ملو یہ میری بے حد پیاری بچپن کی دوست اور بہن سامیہ ہے۔ بہن اس لیے کہ ماما پاپا نے اسے اپنی دوسری بیٹی بنایا ہوا ہے۔''

''ارے واہ مجھے علم ہی نا تھا کہ میری ایک اور پیاری سی نند بھی ہے۔'' صوفیہ نے سامیہ سے گلے ملتے ہوئے اپنی مخصوص سافٹ لہجے میں کہا۔

''ویسے صوفی بھابی آپ دنیا کی واحد بھاوج ہیں جو نندوں کی تعداد میں اضافے پر خوش ہو رہی ہیں ورنہ تو ہر عورت کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ دیور خواہ ایک درجن ہوں۔ مگر نند کوئی نا ہو۔'' عدیل نے شریر لہجے میں کہا۔

''میں ایسی عورتوں میں سے نہیں ہوں۔'' صوفیہ نے کہا۔

''ہاں ابھی نئی نئی بات ہے نا کچھ عرصے بعد پوچھوں گا آپ سے۔''

''اتنی نئی بات بھی نہیں ماشاء اللہ نو دس ماہ ہو گئے ہیں میری شادی کو۔ مگر حرا کے ساتھ میرے تعلقات آج بھی پہلے دن کی طرح ہی ہیں۔ جو دوستی محبت اور خلوص پر استوار ہیں۔ پوچھ لیجیے حرا سے۔'' صوفیہ نے پیار سے حرا کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''ارے تم بھی کس کی باتوں میں آ گئیں۔ یہ شریر تو جملے بازی کا عادی ہے۔'' ایاز نے مسکرا کر صوفیہ سے کہا۔

''اور سامی تم سے تو میں سخت ناراض ہوں عین شادی کے قریب تم ایسی غائب ہوئیں کہ آج اپنی شکل دکھائی ہے۔ کیا بہنیں ایسی ہوتی ہیں۔'' ایاز نے سامیہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر گلہ کیا۔

''بھائی آپ تو جانتے ہی ہیں نا کہ آپ کی بہن پر کیا قیامت گزر گئی تھی شکر کیجیے کہ میں نے اپنی ہمت سے خود کو دوبارہ زندگی کے معاملات میں شریک ہونے کے لیے تیار کر لیا ہے۔ ورنہ میری حالت تو بہت دگرگوں تھی۔''

''چلو بھئی جو وقت گزر گیا وہ تو اب واپس نہیں آ سکتا۔ بس اب تو آپ سب ان کے مستقبل کے لیے دعا کریں کہ آئندہ انہیں اللہ تعالیٰ بھرپور خوشیاں عطا فرمائے۔'' عدیل نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔ تو حرا چونک کر اُس کی جانب دیکھنے لگی تو اُس نے نگاہیں چرا لیں۔

☆......☆......☆

''یہ کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے اس قدر اہتمام سے۔'' پنکی نے عالی کو آئینے کے سامنے کھڑے ٹائی کی ناٹ لگاتے دیکھ کر پوچھا۔

''ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں کافی عرصے سے اُس سے ملاقات نہیں ہوئی وہ اکیڈمی میں میرا ردم

سیٹ تھا۔ اُس نے آج شام کی چائے پر اپنے گھر میں انوائٹ کر لیا۔ میں دانیال کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اور رات کو دیر سے آؤں گا۔ کیونکہ وہاں سے میں امی ابو کی طرف جاؤں گا۔'' عالی نے باڈی اسپرے کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے چلے جاؤ.....مگر دانیال کو کیا ضرورت ہے لے جانے کی۔ وہ اتنی دیر تک باہر رہے گا تو تھک جائے گا۔'' پنکی نے کہا۔

''بھئی کیوں تھکے گا۔ فہد کے گھر میں اُس کے بچوں کے ساتھ کھیلے گا۔ اور پھر امی ابو اور صباحت سے مل کر خوش ہو جائے گا۔ اپنوں سے بھی تو بچوں کو ملنا چاہیے نا۔'' عالی نے خوشگوار موڈ سے کہا۔ اور پھر جمیلہ بواء کو آواز دی۔

''بواء دانیال تیار ہو گیا کیا؟''

''جی صاحب جی۔'' جمیلہ بواء نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اُن کے ساتھ دو سالہ دانیال بھی تھا۔ اُس نے نیلے رنگ کی نیکر اور اُس کی ہم رنگ دھاریوں والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا کہ وہ پاپا کے ساتھ باہر جا رہا ہے۔

''اچھا پنکی اللہ حافظ تم کھانا کھا کر جلدی سو جانا۔'' عالی نے دانیال کو اُٹھا کر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ تو پنکی نے جواب دینے کی بجائے منہ بنا لیا۔

دوست کے گھر سے تقریباً آٹھ بجے فارغ ہو کر عالی نے گاڑی کو والدین کے گھر کی طرف موڑ لیا۔ دانیال جو فہد کے تینوں بچوں کے ساتھ کافی دیر تک کھیلتا رہا تھا اب کچھ تھکا تھکا سا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کشنز کے ساتھ ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا۔

''دانیال بیٹے سو گئے کیا؟'' عالی نے رخ موڑ کر اپنے لاڈلے بیٹے کو پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو......'' باپ کی آواز سن کر دانیال سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''گڈ میرا بیٹا بڑا بہادر ہے تھکتا بھی نہیں، ہے نا۔'' عالی نے نگاہیں سامنے ونڈ اسکرین پر مرکوز کر کے پوچھا۔

''نا نہیں۔'' دانیال نے مسکرا کر کہا۔

''میرا بیٹا اس وقت کہاں جا رہا ہے پاپا کے ساتھ۔'' عالی نے پوچھا۔

''دادو......دادا اور......اور......'' یہ کہہ کر وہ رکا۔

''میرا بیٹا دادو سے کیا کہے گا؟''

''میں......میں......'' اور دانیال رُک گیا۔ اُسے یاد نہیں رہا تھا کہ کیا بولنا ہے۔

''دانی بیٹا کہے گا۔ دادو آئی لو یو۔'' عالی نے کہا۔

''لیس...... دادو...... آئی...... ل...... لو......یو۔'' دانیال نے رُک رُک کر اپنی بات مکمل کی۔ دو سال کی عمر میں بھرپور ذہانت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ جو بات اُسے کہی جاتی بالکل اُسی انداز میں ریپیٹ کرتا۔ ذہانت اور شکل و صورت کے لحاظ سے بالکل عالی پر گیا تھا۔ اگرچہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اُس کا رنگ زیادہ صاف نہیں تھا۔ چہرے کے نقوش بھی اتنے نمایاں نہیں تھے مگر جوں جوں بڑا ہو رہا تھا عالی کی شباہت اس میں واضح ہوتی جا رہی تھی۔

راستے میں ایک بیکری کے پاس رُک کر عالی نے کیک اور آئس کریم اور کولڈ ڈرنک لیں۔ دانیال کے لیے اُس کے پسندیدہ چاکلیٹس لیے اور یوں لدا پھندا جب وہ گھر میں داخل ہوا۔

عفیرہ بیگم بیٹے اور پوتے کو دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ مبارک احمد اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے اُن کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ مگر عالی کے آنے کا سن کر وہ بھی کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گئے۔ حالانکہ عالی نے بہت کہا۔

''ابا آپ اپنے بیڈ پر ہی لیٹے رہیں۔ ہم لوگ خود ہی آپ کے کمرے میں آ جاتے۔''

''نہیں نہیں بیٹے اتنے دنوں بعد تم آئے ہو اور میرا پیارا سا چھوٹا عالی تو پہلی مرتبہ آیا ہے۔'' انہوں نے صوفے پر بیٹھ کر دانیال کو اپنے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے کہا۔

''میرا بیٹا کیسا ہے؟'' انہوں دانیال سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' دانیال نے چاکلیٹ سے ریپر اتارتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی صباحت میرے ننھے شہزاد کے لیے

دودھ گرم کر کے لاؤ۔ اسے بھوک لگی ہوگی۔'' مبارک احمد نے صباحت کو پکارا جو اپنے کمرے میں نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھی۔ اُس نے جائے نماز طے کر کے ٹیبل پر رکھی اور جلدی سے کمرے سے باہر آ گئی۔

''ارے عالی بھائی آ گئے ہیں کیسے ہیں آپ؟'' صباحت نے عالی کو دیکھ کر خوش ہو کر کہا۔ عالی نے کھڑے ہو کر صباحت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک بڑا سا پیکٹ اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے میری گڑیا بہنا کیسی ہے؟''

''میں بھی بالکل فٹ فاٹ ہوں اور یہ کیا لے آئے آپ؟'' صباحت نے پیکٹ پکڑتے ہوئے حیران ہو کر کہا۔

''ارے بھئی میری بہنا نے اتنے اچھے مارکس کے ساتھ بی اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ یہ تو بس معمولی سا گفٹ ہے۔'' عالی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ معمولی ہے؟ اتنے قیمتی سوٹ اور پھر ساتھ شوز بھی؟ آپ کو میرے جوتوں کا سائز یاد تھا کیا؟'' صباحت نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ارے ساری زندگی تو گزر گئی اپنی ایک ہی ایک بہن کے لیے کپڑے اور جوتے لاتے ہوئے تو کیا مجھے تمہارا سائز بھی یاد نا ہوگا۔'' عالی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''سوری بھائی ...... دراصل آپ مصروف بہت رہتے ہیں نا اس لیے میں نے سوچا کہ'' صباحت نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''بچوں ان باتوں کو چھوڑو کچھ کھانے وغیرہ کا بندوبست کرو۔ نو بج رہے ہیں عالی بیٹے کو بھوک لگی ہوگی۔'' مبارک احمد نے کہا۔

''نہیں ابا وہ دراصل میں اپنے دوست کے ہاں سے ہو کر آ رہا ہوں۔ اُس نے مجھے چائے پر انوائٹ کیا تھا، چائے پر کافی اہتمام تھا اس لیے بالکل بھی بھوک محسوس نہیں ہو رہی فی الحال ...... بس آپ لوگ میرے پاس بیٹھ کر باتیں کریں۔ اور صباحت تم یہ آئس کریم کیک اور چاکلیٹ وغیرہ نکال کر دو نا سب کو۔ باقی فریج میں رکھ دو'' عالی نے سامنے میز پر پڑے شاپرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عفیرہ بیگم نے دانیال کو گود میں بٹھا کر کپ سے دودھ پلانا شروع کر دیا۔

''واہ کتنا اچھا ہے ہمارا دانیال کپ میں دودھ پیتا ہے ورنہ اتنے بچے تو فیڈر کے بغیر دودھ کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔'' صباحت نے دانیال کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

''دودھ پیتے پیتے ہی دانیال عفیرہ بیگم کی گود میں سو گیا۔ تو صباحت اُسے اُٹھا کر کمرے میں لے گئی اور اُسے بیڈ پر لٹا دیا۔

سب نے مل کر پہلے آئس کریم کھائی پھر چائے کے ساتھ کیک کھایا۔

''میرا خیال ہے اب کھانے کی تو گنجائش ہی نہیں رہی۔'' مبارک احمد نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''واقعی ابا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بچپن میں بھی جب آپ رات کو سموسے جلیبیاں اور نمک پارے لاتے تھے۔ تو ہم سب کھانا کھانے سے انکار کر دیتے تھے اور امی چیختی رہ جاتی تھیں کہ انہوں نے جو ڈھیروں ڈھیر روٹیاں بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھی ہیں وہ کون کھائے گا۔'' عالی نے ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا۔

''کتنا اچھا دور تھا وہ میرے سارے بچے میری آنکھوں کے سامنے تھے اب شہاب پردیس میں بیٹھا ہے۔ عالی بیٹا کراچی میں اور یہاں ہم تینوں ...... پورا خاندان ہی تتر بتر ہو گیا ہے۔'' عفیرہ بیگم نے نم آنکھوں سے کہا۔

''امی آپ فکر نہ کریں۔ میری ٹرانسفر اگلے ماہ لاہور ہی میں ہو رہی ہے۔ شہاب بھی کہہ رہا تھا کہ چند سالوں بعد جب گھر بنانے کے لیے پیسے ہو جائیں گے تو وہ ملک میں واپس آ کر کوئی کاروبار کرے گا۔ پھر اُس کی اور صباحت کی شادی ہو جائے گی۔ میں بھی آپ لوگوں کے قریب ہی گھر لے لوں گا۔ اور پھر سب پاس پاس ہی رہیں گے۔ صباحت کا سسرال بھی قریب ہی ہے وہ بھی آتی جاتی رہے گی۔'' عالی نے مستقبل کی تصویر کشی کی۔

''وہ تو ٹھیک ہے میرے بچے مگر پنکی تمہیں کبھی بھی ہمارے قریب گھر نہیں بنانے دے گی۔ وہ تو یہی چاہے گی کہ تم اُس کے والدین کے آس پاس کے علاقے میں

گھر لو۔ تاکہ وہ اُس کے گھر میں اور یہ اُن کے گھر میں جب چاہے آجا سکے۔ ہمیں تو وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں ہے۔'' عفیرہ بیگم نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''نہیں سمجھتی تو نا سمجھے...... آپ کون سا اُس کی محتاج ہیں آپ کا بیٹا تو آپ کو چاہتا ہے نا رہی بات کہ وہ مجھے آپ لوگوں کے قریب نہیں رہنے دے گی تو وہ کون ہوتی ہے مجھے منع کرنے والی۔ میرا پیسہ ہے میرا گھر ہے۔ میری مرضی جہاں چاہوں رہوں اور گھر بناؤں۔ اگر اُسے میرے ساتھ رہنا پسند نہیں تو جائے رہے اپنے ماں باپ کے گھر میں مجھے کون سا اُن سے عشق ہے۔ میں تو اپنی بیوقوفی اور حماقت پر پچھتا رہا ہوں۔ جو وقتی اور جھوٹی شوشا کے چکر میں آ کر ایک غلط قسم کی عورت سے شادی کر بیٹھا۔ اب تو وہ چھچھوندر کی مانند میرے گلے میں اٹک گئی ہے۔ نا نگلی جاتی ہے نا اُگلی جاتی ہے۔'' عالی نے تاسف سے کہا۔

''نہیں بیٹے ایسا مت کہو...... وہ تو بیوی ہے تمہارے بچوں کی ماں ہے۔ جو بھی ہے جیسی بھی ہے اب تمہیں اُس کے ساتھ ہی نبھاہ کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ عمر بڑھنے سے اُس میں ذہنی پختگی آجائے اور رشتوں کا احترام کرنے کا شعور اُس کی ذات میں اجاگر ہو جائے۔ ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہے لاڈ پیار کی وجہ سے اُس کی تربیت میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ مگر سمجھ جائے گی ایک دن۔'' مبارک احمد نے رسان سے کہا۔

''ابا آپ کی سوچ بہت مثبت ہے۔ کاش ہر کوئی آپ کی طرح سوچنے لگے تو یہ معاشرہ مثالی بن جائے۔'' عالی نے عقیدت سے باپ کی پیشانی پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''بھائی آج آپ یہیں رہ جائیں نا۔ عرصہ ہی ہو گیا ہے کبھی آپ کو یہاں رات گزارتے ہوئے۔'' صباحت نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''انشاء اللہ اب تو ایک دو ماہ تک یہاں ہی آ رہا ہوں۔ پھر جب پنکی اپنے میکے رہنے کے لیے جایا کرے گی تو میں آپ لوگوں کے پاس آجایا کروں گا۔ اب تو میں چلتا ہوں۔ تقریباً گیارہ بج رہے ہیں۔ صبح دس بجے کی فلائٹ سے مجھے کراچی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ دانیال اُٹھ گیا کیا یا ابھی تک سویا ہوا ہے۔ دیکھنا صباحت جا کر ذرا۔'' عالی نے کہا اور پھر جیب سے پرس نکال کر بہت سے نوٹ مبارک احمد کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ابا آپ اپنے علاج کے سلسلے میں بہت لاپرواہی برتتے ہیں آج بھی آپ کی طبیعت بہتر نہیں تھی۔ پلیز ابا آپ اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا کیجیے۔ پیسے کی فکر نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دونوں بیٹوں کو بہت دیا ہے۔ اور یہ سب آپ لوگوں کے لیے ہی ہے۔ جن والدین نے دکھ جھیل کر اپنی اولاد کی پرورش کی ہو۔ انہیں پڑھایا لکھایا ہو اُن کا حق سب سے پہلے ہوتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو عالی بیٹا...... تمہارے ابا اس سلسلے میں بہت تنگ کرتے ہیں ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے نہیں جاتے کہ وہ ہزار پندرہ سو فیس لے لے گا۔ ہزاروں روپے کی دوائیاں لکھ دے گا۔ مہنگے مہنگے ٹیسٹ کروائے گا۔ انہیں پہلے بھی ہارٹ اٹیک ان کی اسی لاپرواہی اور پیسہ بچانے کی عادت کی وجہ سے ہوا تھا۔ پیسہ خرچ کرنے کے لیے ہوتا ہے جان ہے تو جہان ہے مگر یہ مانتے ہی نہیں میری بات ہر وقت کہتی رہتی ہوں اُدھر شہاب بھی ہر بار فون کر کے یہی کہتا ہے کہ ابا آپ باقاعدگی سے ڈاکٹر کے پاس جایا کریں۔ اور دوائی کا ناغہ نا کریں۔'' عفیرہ بیگم نے شوہر کے خلاف شکایات کی پٹاری کھول کر رکھ دی۔

''ارے بھئی تم ماں بیٹا تو میرے خلاف محاذ ہی کھول کر بیٹھ گئے ہو۔ آج تو یونہی ذرا ہلکا سا بخار ہو گیا تھا۔ ورنہ خدا کا شکر ہے کہ اور مجھے کوئی بھی تکلیف نہیں ہے۔ پہلے ملکے سے ہارٹ اٹیک کے بعد سے مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ شوگر اور بلڈ پریشر بھی نارمل ہیں مگر تمہاری ماں کو تو شوق ہے۔ ڈاکٹروں کے جیبیں بھرنے کا جب ضرورت ہوتی ہے چلا جاتا ہوں۔

صبح شام واک کے لیے نکل جاتا ہوں۔ پانچوں وقت کی نماز اللہ کا شکر ہے کہ مسجد میں جا کر ادا کرتا ہوں اس سلسلے میں ضمیر بھائی صباحت کے ہونے والے سسر

بھی میرا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ گھر کا سارا سودا سلف بھی میں ہی خرید کر لاتا ہوں۔ اس قدر بھرپور اور سرگرم زندگی تو آج کل کے جوان نہیں گزارتے۔ جس طرح میں اس بڑھاپے میں گزار رہا ہوں۔'' مبارک احمد نے بڑے جوش و جذبے سے اپنی روزمرہ کی مصروفیات کے بارے میں تفصیلی تقریر کی۔

''مگر ابا آپ بوڑھے کہاں سے ہو گئے۔ ابھی تو آپ کی عمر ساٹھ سال بھی نہیں ہوئی۔'' عالی نے کہا۔

''یہی تو میں کہتی ہوں کہ ابھی کون سی اُن کی اتنی زیادہ عمر ہو گئی ہے کہ ایسی خوفناک بیماریوں کو پالنے لگے ہوئے ہیں۔ اور خود کو بوڑھا سمجھنے لگ گئے ہیں ابھی تو اپنے پوتوں پوتیوں کے بچے بھی انہوں نے کھلانے ہیں۔'' عفیرہ بیگم نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''انشاء اللہ......'' مبارک احمد نے کہا۔

''لیجیے عالی بھائی آپ کے شہزادے صاحب جاگ گئے ہیں۔ دو گھنٹے تک سو کر خوب فریش ہو گئے ہیں۔'' صباحت دانیال کو گود میں اُٹھا کر کمرے سے باہر آ کر بولی۔

''دانی بیٹا چلیں گھر اب؟'' عالی نے دانیال سے پوچھا۔

''ہاں پاپا...... ماما'' دانیال نے سوئی سوئی آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

''بڑا چالاک ہے اب ماما کی یاد آئی ہے۔'' عالی نے ہنس کر کہا۔

''اچھا بیٹا فی امان اللہ۔''

''یہ لو دانیال بیٹا۔'' عفیرہ بیگم نے دو ہزار روپے کے دو نوٹ دانیال کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ امی آپ کیا کر رہی ہیں۔ میرے اور آپ کے پیسے کوئی الگ الگ ہیں۔''

''نہیں بیٹا...... بچہ پہلی مرتبہ اپنے دادا کے گھر آیا ہے۔ خالی ہاتھ تو نا جائے نا۔ انشاء اللہ اب میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ اس کے سائز کا اندازہ ہو گیا ہے۔ دوبارہ آئے گا تو اس کے لیے کپڑے اور کھلونے وغیرہ بھی پہلے ہی لا کر رکھ لوں گی۔'' عفیرہ بیگم نے دانیال کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا امی خدا حافظ۔ ابا اب آپ آرام کریں اور اپنا خیال رکھا کیجیے۔ ابھی ہمیں آپ کی بہت بہت ضرورت ہے۔'' عالی نے مبارک احمد سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

''خوش رہو بیٹا...... آج تم نے یہاں آ کر اور میرے بچے کو مجھ سے ملوا کر مجھے بہت بڑی خوشی بخشی ہے۔ اللہ تمہارا اور تمہارے بچے کا حامی و ناصر ہو۔'' مبارک احمد نے خوشی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

عالی اُن لوگوں سے رخصت ہو کر نیچے گیراج میں پارک کی گئی اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ صباحت اور عفیرہ بیگم بھی ساتھ ہی نیچے آ گئیں۔ صباحت نے گیٹ کھول کر گاڑی باہر نکلوائی۔ جبکہ عفیرہ بیگم نے دانیال کو اٹھا رکھا تھا۔ گاڑی باہر نکال کر عالی نے دانیال کو پچھلی سیٹ پر کشن لگا کر لٹا دیا۔ اور پچھلے دونوں دروازوں کو بے بی لاک لگا دیا۔ اور پھر ماں اور بہن کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ جب تک گاڑی گلی کا موڑ نہیں مڑ گئی۔ عفیرہ بیگم نیچے ہی کھڑی رہیں جبکہ مبارک احمد اوپر ٹیرس پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے رہے۔

☆......☆......☆

''یہ وقت ہے گھر آنے کا؟'' عالی دانیال کو جمیلہ بوا کے حوالے کر کے کمرے میں داخل ہوا تو پنکی جو بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھی کسی فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی نے کہا۔

''کیوں کیا ہوا وقت کو...... ابھی ساڑھے گیارہ ہی بجے ہیں۔'' عالی نے وال کلاک کو دیکھ کر کہا۔

''تمہارے لیے تو ساڑھے گیارہ چھوڑ ایک بھی بج جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنے بچے کے خیال سے کہہ رہی ہوں۔ ننھے سے بچے کو تھکا دیا بھی ہے اور اس کی نیند بھی خراب کی ہے۔'' پنکی نے غصے سے کہا۔

''محترمہ پنکی صاحبہ! وہ بچہ میرا بھی کچھ لگتا ہے۔ میں اُس کا دشمن نہیں ہوں۔ اُس کے آرام کا مجھے بھی خیال ہے۔ وہ کہیں سڑکوں پر مٹر گشت نہیں کر رہا تھا۔ آرام سے اپنے دادا کے گھر میں تھا اور وہ دو تین گھنٹے خوب سویا ہے وہاں۔'' عالی نے بھی تیز آواز میں غصے سے کہا۔

"آہستہ بولو...... چیخو مت...... میری جو کنڈیشن ہے اس میں تم جان بوجھ کر مجھے ٹینشن دیتے ہو۔ کیا ضرورت تھی میرے معصوم بچے کو اس گندے علاقے میں لے کر جانے کی۔ وہاں کی جراثیم آلود فضا اُس معصوم کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ پتہ نہیں اُس نے کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں۔"

"سنو پنکی بیگم وہ علاقہ گندہ نہیں ٹھیک ٹھاک پوش ایریا ہے اچھے خاصے لوگ رہتے ہیں وہاں۔ پھر بھی اگر تمہارے نزدیک انسانوں کے اچھا یا برا ہونے کا معیار علاقہ ہی ہے تو میں تو انتہائی پسماندہ اور گندے علاقے میں پیدا ہوا اور پلا بڑا ہوں۔ پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی۔" عالی نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"یہی تو میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔" پنکی نے چلا کر کہا۔

"اگر تم اپنی اس غلطی پر پچھتا رہی ہو تو ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تم چاہو تو مجھ سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنے جیسے اونچے اور اعلیٰ ارفع شخص سے ناطہ جوڑ سکتی ہو۔ میری طرف سے تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔" عالی نے غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں تم تو یہی چاہتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں تا کہ نئی نویلی بیوی لے آؤ۔ مجھ سے دل بھر گیا ہے نا۔ جس مقصد کے لیے مجھ سے شادی کی تھی وہ تو پورا ہو گیا پاپا کے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے پروموشن کروا کر دوبارہ لاہور ٹرانسفر بھی ہو گئی۔ جہیز کے نام پر پاپا سے ڈھیروں روپیہ اور پراپرٹی لے لی۔ اور جبکہ ایک بچہ دو سال کا ہو گیا ہے دوسرے کی پیدائش دو ماہ تک متوقع ہے۔ اور تم مجھے چھوڑنے کی دھمکیاں دے رہے ہو۔"

"تم جیسے نچلے طبقے کے لوگ ایسے ہی خود غرض اور لالچی اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔" پنکی نے چیخ کر کہا اور پھر اونچی آواز میں رونے لگی۔ اور عالی نے حسب عادت الماری سے اپنا شب خوابی کا لباس نکالا۔ باتھ روم میں جا کر کپڑے چینج کیے اور تکیہ اٹھا کر ڈرائنگ روم میں جا کر سو گیا اور پنکی دیر تک روتی رہی بڑبڑاتی رہی اور پھر نڈھال ہو کر نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صبح جب وہ بیدار ہوئی تو عالی کراچی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

انیلہ کافی دیر سے بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ مگر حارث کی گاڑی کا نام و نشان بھی نا تھا۔ ورنہ تو وہ جیسے ہی پارلر سے نکل کر اسٹاپ تک پہنچتی تھی حارث کو اپنا منتظر پاتی تھی۔ مگر آج نا ہی وہ خود آیا تھا۔ نا ہی اُس نے فون کیا تھا۔ اور انیلہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اُس نے کئی بار حارث کا نمبر ملایا مگر وہ بھی آف جا رہا تھا۔

آفس کا ٹائم پانچ بجے کا تھا۔ وہ رکشا لے کر آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتی تھی مگر اتنی جلدی آفس جانا بھی عجیب لگتا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ پارلر واپس چلی جائے۔ مگر اُسے یہ بھی مناسب محسوس نہیں ہوا۔ اچانک اُسے اپنی ایک پرانی دوست کا خیال آیا۔ جس سے اُس کی ملاقات چند دن پہلے ہی اسی بس اسٹاپ پر ہوئی تھی۔ وہ ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ جو اُس کے آفس سے قریب تھا۔

انیلہ نے اُسے فون کیا وہ اپنے آفس ہی میں تھی۔ چنانچہ انیلہ نے قریب سے گزرنے والے ایک رکشے کو روکا اور روحانہ کے آفس میں پہنچ گئی۔ چونکہ روحانہ نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ دونوں نے اخبار کے آفس میں واقع کینٹین سے کھانا منگوایا۔ کھانے کے بعد چائے پی اور پھر کافی دیر بیٹھی باتیں کرتی رہیں اور پھر پانچ بجنے میں دس منٹ پہلے دونوں باہر نکل آئیں۔ روحانہ نے بس اسٹاپ پر جانا تھا۔ جبکہ انیلہ کا دفتر اُس کے راستے ہی میں پڑتا تھا۔ یوں دونوں باتیں کرتی ہوئی چلنے لگیں۔

"انیلہ بڑا اچھا لگا مجھے تم سے ملاقات کر کے۔"

روحانہ اُسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی اور انیلہ آفس کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

پورا ہفتہ حارث انیلہ کو پک کرنے نا آیا۔ اور وہ کسی نا کسی طرح اِدھر اُدھر وقت گزار کر مقررہ وقت پر بس کے ذریعے آفس چلی جاتی۔ اور پھر اسی دوران اُس کی کزن وینا کی شادی کی تقریبات شروع ہو گئیں۔ اور اُس نے آفس سے دو دن کی چھٹی لے لی۔ اس دوران اُس نے حارث سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ کیونکہ گزشتہ چار دن سے تو اُس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ پھر شادی کے ہنگاموں میں

کھو کر وہ وقتی طور پر سب کچھ بھول بھال گئی۔

جمعہ کو دینا کی مہندی تھی۔ گھر کی چھت پر مہندی کا انتظام کیا گیا تھا۔ چونکہ لڑکے والے گاؤں میں رہتے تھے وہ وہاں سے مہندی لے کر نہیں آسکتے تھے اس لیے ان لوگوں نے خود ہی مہندی کی تقریب کا انتظام کرلیا تھا۔ لڑکیوں نے سرخ سبز کپڑے پہن رکھے تھے۔ ڈھولک پر شادی بیاہ کے گیت گائے جارہے تھے۔ دینا پیلے سوٹ اور سرخ کام والے دوپٹے میں سجی ہوئی سنہری کرسی پر شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔ ساری کزنز اور محلے کی لڑکیاں اور دینا کی سہیلیاں اور گھر کی چھوٹی چھوٹی بچیاں مہندی کی ٹوکریاں جن میں موم بتیاں جل رہی تھیں گلی سے گھر میں داخل ہوئیں ساتھ ساتھ ویڈیو بھی بن رہی تھی اور تصاویر بھی کھینچی جارہی تھیں۔ انیلہ نے سرخ اور سبز کے کمبینیشن والا خوبصورت جارجٹ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ دونوں کلائیوں میں سرخ اور سبز چوڑیاں اور پھولوں کے گجرے پہنے ہوئے تھے۔ بالوں میں بھی گجرے سجائے ہوئے تھے۔ ساری لڑکیاں ہی خوبصورت رنگ برنگے کپڑوں اور میک اپ میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

ہر وقت سادہ رہنے والی جمیلہ اور راحیلہ بھی بہت بنی سنوری تھیں۔ انیلہ نے اُن کے لیے بہت خوبصورت کپڑے بنوائے تھے۔ تاکہ انہیں کسی قسم کا احساسِ کمتری نا محسوس ہو۔ رات گئے تک مہندی کی تقریب جاری رہی۔

شادی کی تقریبات سے فراغت کے بعد پیر کو جب انیلہ بس اسٹاپ پر پہنچی تو حارث کی سیاہ گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ وہ جلدی سے جاکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ حارث کا منہ بنا ہوا تھا۔ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ اور وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کررہا تھا اُس نے انیلہ کے سلام کا جواب نہیں دیا۔

''کیا بات ہے آج آپ کا موڈ کیوں خراب ہے؟'' اُس کی طویل خاموشی سے گھبرا کر انیلہ نے استفسار کیا۔

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ موڈ کیوں خراب ہے۔ تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ گزشتہ تین دن سے میں تمہیں کالز کررہا ہوں۔ مگر تمہارا موبائل ہی آف تھا۔ جبکہ میں نے تمہیں سختی سے ہدایت کررکھی ہے کہ کسی بھی حال میں موبائل آف نا کیا کرو۔ کیونکہ میں کسی بھی وقت تم سے رابطہ کرسکتا ہوں۔''

''آپ نے تو خود چار پانچ دن تک اپنا موبائل آف رکھا تھا۔ نا ہی مجھے پک کرنے کے لیے آرہے تھے اور اُلٹا مجھے الزام دے رہے ہیں۔'' انیلہ نے بھی اُسی کی طرح تیز لہجے میں کہا۔

''وہ تو مجھے ضروری کام سے پانچ دن کے لیے دبئی جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں میں اس قدر مصروف رہا کہ مجھے فون کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ یوں بھی وہاں یہ سم تو ایکٹو نہیں تھی۔ اور چار پانچ دن کے لیے میں نئی سم تو لینے سے رہا۔ مگر ہفتے کی شام کو واپس آکر میں نے موبائل آن کرلیا تھا۔ اور تمہاری کوئی بھی کال مجھے موصول نہیں ہوئی۔ پھر میں خود بھی تمہارا نمبر ٹرائی کرتا رہا۔ مگر ہر بار نمبر آف ہی ملا۔'' حارث نے دبے دبے غصے سے اپنی بات مکمل کی۔

''وہ دراصل میری کزن کی شادی تھی شادی کے ہنگاموں میں میرا چارجر گم ہوگیا اور موبائل بھی میں نے اپنے پرس میں رکھ کر الماری میں بند کردیا تھا۔ کیونکہ اتنے تو گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ ڈر تھا کہ کہیں موبائل چوری ہی نا ہوجائے۔ یوں بھی آپ ویک اینڈ پر تو بہت کم فون کرتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو گھر آجاتے ہیں۔ مگر آپ گھر بھی نہیں آئے۔'' نا ہی پورے ہفتے آپ سے رابطہ رہا کہ آپ کو شادی پر انوائٹ کرلیتی۔'' انیلہ نے وضاحت کی۔

''چلو خیر جو ہوا چھوڑو اسے...... آج میں تمہیں ایک گڈ نیوز سنانا چاہتا ہوں۔'' حارث نے اپنے موڈ کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

''کیا ہم شادی کررہے ہیں؟'' انیلہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ایک تو تمہیں ہر وقت شادی کی پڑی رہتی ہے۔ بھئی ہو جائے گی شادی بھی جب اُس کا وقت آئے گا۔'' حارث نے چڑ کر کہا۔

''تو پھر گڈ نیوز کیا ہے؟'' انیلہ نے بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

''دراصل میری بیوی بچوں کی چھٹیوں کی وجہ سے ایک ہفتے کے لیے اپنے میکے گئی ہے۔ اور اب ایک ہفتے کے لیے عیش ہے۔ ہمیں ملنے کے ادھر اُدھر نہیں جانا پڑے گا۔'' حارث نے قدرے خوشگوار سے لہجے میں کہا اور پھر اُس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر بولا۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی کیا؟ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''مجھے ایسے ملنے سے خوشی کی بجائے شرمندگی اور احساسِ گناہ ستاتا ہے۔ ایسے گناہ آلود تعلقات جس کی مذہب اور معاشرہ اجازت نا دے، وہ انہی لوگوں کے لیے خوشی کا باعث ہوسکتا ہیں جن کا ضمیر مر چکا ہو اور جن کا ایمان کمزور ہو۔'' انیلہ نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

''مجھ سے ملتے ہوئے ہمیشہ تم گناہ ثواب کے چکر میں پڑ جاتی ہو مگر اُس لونڈے سے ملتے ہوئے تو تمہیں کبھی اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس نا ہوا۔'' حارث نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ کو تو بس موقع چاہیے میرے ماضی کا ایک معمولی سا واقعہ اچھالنے کا۔ حالانکہ میں آپ سے ہزاروں بار کہہ چکی ہوں کہ میرے سکندر کے ساتھ اس طرح کے تعلقات نہیں تھے۔ جن پر مجھے کسی قسم کی ندامت محسوس ہو۔ ہاں چند بار میں اُس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ضرور اُس کے گھر اُس کی بہن کے بلانے پر گئی تھی اتنی سی بات ہے جسے آپ نے جانے کیا رنگ دے دیا ہے۔ اور مجھے اس حوالے سے طعنے دے دے کر بلیک میل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر میرے سکندر کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات ہوتے یا میں جذباتی طور پر اُس کے ساتھ انوالو ہوتی تو ہرگز اُسے چھوڑ کر آپ کی جانب مائل نہ ہوتی۔

عورت صرف زندگی میں ایک ہی بار محبت کرتی ہے اور آپ میری زندگی میں آنے والے پہلے اور آخری مرد ہیں جسے میں نے اپنے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ چاہا ہے۔ مگر آپ کو میری چاہت کا یقین ہی نہیں آتا۔ اس لیے مجھ سے شادی کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ جب آپ پہلے بھی دو دو شادیاں کر چکے ہیں تو تیسری کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہمارے مذہب میں تو چار چار شادیوں کی اجازت ہے۔ اور آپ مالی طور پر اس قدر مضبوط ہیں کہ دو دو بیویوں کے اخراجات پورے کر سکیں۔ یا پھر آپ میرے ساتھ سنجیدہ ہی نہیں ہیں اور محض وقت گزاری کر رہے ہیں۔'' انیلہ نے نہایت جرأت سے کہا۔

حارث پہلے تو کچھ دیر اُسے حیرت سے دیکھتا رہا کہ اس ذرا سی لڑکی میں کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ یوں اُس کے منہ پر صاف صاف ہر بات کہہ ڈالی۔

''سنو مس انیلہ اگر میں تمہارے ساتھ سنجیدہ نا ہوتا تو مجھے پاگل کتے نے کاٹا تھا جو اتنے عرصے سے تمہارے ساتھ جھک مار رہا ہوں رہی بات وقت گزارنے کی تو اس مقصد کے لیے مجھے لڑکیوں اور عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ میرے پاس اتنا پیسہ اتنی شہرت اور اتنی حیثیت ہے کہ میں ہر روز نت نئی لڑکیوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزار رہا ہوں۔ یہ بہتر نہیں کہ آئے روز ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی سے دل بہلایا جائے بجائے اس کے کہ ہر وقت روتی بسورتی بیویوں کی طرح گلے شکوے کرتی اور شادی شادی کی رٹ لگاتی لڑکی سے روز ملا جائے اُس کے سارے خاندان کے اخراجات پورے کیے جائیں تو اُس پر بھی اپنا محنت سے کمایا ہوا پیسہ اڑایا جائے اور پھر بھی وہ خوش نا ہو۔ پھر بھی اُسے میری محبت اور وفا پر شک وشبہ ہو مجھ جیسا احمق اور چغد بھی کوئی نا ہوگا اس دنیا میں۔''

انیلہ نے محسوس کیا کہ حارث کا پارہ چڑھ رہا ہے تو اُسے اندیشہ ہوا کہ کہیں اُس کا میٹر زیادہ ہی نا گھوم جائے کہ اُسے یہیں کہیں اُتار کر رفو چکر ہو جائے۔ اس لیے جلدی سے بات بدل کر بولی۔

''مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے صبح بھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ آج سعدیہ آنٹی بھی ابھی نہیں آئی تھیں ورنہ وہ کچھ نہ کچھ کھانے کو ضرور دے آتی ہیں۔ چلیے پہلے کھانا کھالیں کہیں بیٹھ کر پھر آپ کے گھر چلتے ہیں۔''

پہلے تو حارث خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا پھر آہستہ آہستہ اُس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہونے شروع ہوئے اور بالآخر کہنے لگا۔

''جب تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارا بلاوجہ کا الٹا

سید حا بولنا میرا موڈ خراب کر دیتا ہے۔ تو کیوں ایسا کرتی ہو میں نے کئی بار تم سے کہا ہے کہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ وقت آنے پر جو تم چاہتی ہو وہی ہوگا۔ یہ ایک مرد کا وعدہ ہے جو وعدہ وفا کرنا بہت اچھی طرح جانتا ہے۔''

''اچھا باس...... آئی ایم سوری غلطی ہوگئی نا۔ اب معاف کر دیجیے اور غصہ تھوک دیں۔''

''آج ہمیں باہر سے کھانا کھانے کی ضرورت نہیں بیگم صاحب بہت کچھ بنا کر فریز کر گئی ہیں۔ آج انہی مزے مزے کے کھانوں کی دعوت اڑائیں گے۔''

''واہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کتنے دنوں بعد آج گھر کا پکا ہوا کھانا کھاؤں گی۔''

''میری بیگم میں اور کوئی خوبی ہو نا ہو مگر ایک بات طے ہے کہ وہ کوکنگ بہت اچھی کرتی ہے۔'' حارث نے گاڑی اپنے گھر کے گیٹ کے آگے روکتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے گاڑی سے اتر کر گیٹ کا لاک کھولا۔ اور گیٹ کھول کر گاڑی اندر لے گیا۔ چونکہ انیلہ نے ایک بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اور چہرے پر بھی نقاب کر لیا تھا۔ اس لیے اگر آس پاس کے گھروں میں سے کوئی شخص اسے دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ حارث کی بیوی ہے۔ کیونکہ وہ بھی چادر اوڑھتی تھی۔ اور چہرے کو نقاب سے ڈھانپے رکھتی تھی۔

حارث اس سلسلے میں بہت سخت مزاج تھا باہر دوسری عورتوں کے ساتھ گلچھڑے اڑاتا تھا اور گھر کی عورتوں اور جن عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرتا تھا۔ ان سے سختی سے پردہ کرواتا تھا۔ اسی لیے تو اتنے سالوں سے انیلہ کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا مگر آج تک کسی کو علم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے یا محبوبہ......

''تم بیٹھ کر ٹی وی دیکھو میں جلدی سے کھانا گرم کرتا ہوں۔'' حارث نے لاؤنج میں داخل ہو کر انیلہ سے کہا۔

''نہیں آپ بیٹھیے میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔'' انیلہ نے پیش کش کی۔

''تمہارے لیے مشکل ہوگا ادھر اُدھر سے برتن تلاش کرنا اور پھر مائیکرو ویو اوون کو استعمال کرنا۔ تم میری مہمان ہو اس لیے یہ کام میں ہی کروں گا۔'' یہ کہہ کر حارث کچن میں گھس گیا۔ اور پھر کچھ دیر بعد ایک ڈش میں گرم گرم بریانی، رائتہ اور سلاد لے آیا اور ایک ٹرے میں گلاس اور سیون اپ کی بوتل رکھ کر لایا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں حارث کے بیڈروم میں آگئے۔ اسی لمحے ایک جھٹکے سے بیڈروم کا دروازہ کھلا اور حارث کی بیوی غصے سے تتا ہوا چہرہ لیے سامنے کھڑی تھی۔ ان لوگوں کو خبر ہی نا ہو سکی کہ کیسے وہ اچانک آگئی۔ انیلہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی ٹشو سے اپنے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ جبکہ حارث باتھ روم میں تھا۔ وہ باتھ روم سے نکلا تو ایک عجیب سا منظر اس کے سامنے تھا۔ اس کی بیوی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے انیلہ کو قہر آلود نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

''تو اب تم نے اپنی داشتاؤں کو گھر میں بھی لانا شروع کر دیا ہے۔''

''یہ میری داشتہ نہیں ہے۔'' حارث نے سخت لہجے میں کہا۔

''تو پھر یہ کون ہے؟ اور میرے بیڈروم میں کیا کر رہی ہے؟''

''یہ...... یہ...... میری بیوی ہے۔'' حارث نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''جھوٹ بولتے ہو تم۔''

''سنو منزہ مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں نے اس سے خفیہ نکاح کر رکھا ہے۔ کیونکہ اس کے والدین شادی پر رضامند نہیں تھے۔ بہت جلد ہماری رخصتی ہونے والی ہے۔ اور اسی مسئلے پر بات کرنے کے لیے میں اسے یہاں لایا ہوں۔ اتنی سی بات ہے جس کو لے کر تم نے بتنگڑ بنا دیا ہے۔'' حارث نے بڑے اعتماد سے منزہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''تم بتاؤ لڑکی کیا یہ سچ کہہ رہا ہے۔'' منزہ نے انیلہ کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ج...... جی...... با...... باجی۔'' انیلہ ہکلائی۔

''مت کہو مجھے باجی میں تم جیسی بدکردار عورتوں کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ جو اپنی نوجوانی اور حسن کا جال پھینک کر دوسری عورتوں کے شوہروں کو پھانستی پھرتی ہیں۔''

''یا...... یقین...... کر...... کریں منزہ

با...... باجی...... مجھے یہ علم نہیں...... نہیں تھا کہ...... یہ یہ آپ...... آپ کے شوہر ہیں۔'' انیلہ بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے الفاظ بھی نوٹ نوٹ کر نکل رہے تھے۔

''بہت خوب...... یعنی کہ اگر یہ میرے علاوہ کسی اور عورت کا شوہر ہوتا تو اس کے ساتھ یوں دن دھاڑے اسی کے بیڈ روم میں رنگ رلیاں منانے پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ویسے بائی داوے تم مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہو...... اور ہاں...... یاد آیا...... تم وہی لڑکی ہو نا جو سعدیہ آپا کے پارلر میں کام کرتی ہے اور جسے میں نے ملازمت دلوائی تھی اس قدر احسان فراموش نکلو گی تم یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔'' منزہ انیلہ کو پہچان کر غصے سے دھاڑی۔

''تم کیوں اس طرح اس بے چاری پر چلا رہی ہو میں تمہارا مجرم ہوں جو کہنا ہے مجھ سے کہو۔'' حارث نے بھی تیز لہجے میں منزہ سے کہا۔

''ہوں بے چاری اس جیسی چند اور بے چاریاں پیدا ہو جائیں تو یہ دنیا بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ جائے۔'' منزہ زہر خند سے ہنسی۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم اس قدر غصے میں کیوں ہو میں نے شادی کی ہے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔'' حارث نے دھیرے سے کہا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تم نے اس حرافہ سے کوئی شادی وادی نہیں کی۔ میں نے تمہیں شادی کے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے مجھ سے پوچھے بغیر شادی کی تو اسی لمحے ہم دونوں کے راستے علیحدہ ہو جائیں گے۔ میں تو پہلے ہی تمہاری عیاشیوں کی خبریں سن سن کر تنگ آئی ہوئی تھی۔ اور تم جیسے بدکردار شخص سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ آج تم نے خود ہی موقع فراہم کر دیا ہے مجھے اب ہماری ملاقات کورٹ میں ہوگی۔ کل تک تمہیں خلع کا نوٹس مل جائے گا۔'' منزہ نے غصے سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... تم مجھ سے الگ ہونا چاہتی ہو تو پھر کورٹ کچہریوں کے دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے میں تمہیں ابھی اور اسی وقت آزاد کرتا ہوں۔ میری طرف سے تمہیں طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے۔'' حارث نے بڑے آرام سے کہہ دیا اور منزہ جو محض دھمکانے کی غرض سے حارث کو خلع کا نوٹس بھجوانے کا کہہ رہی تھی پہلے تو زرد چہرہ لیے اُسے گھورتی رہی اور پھر چیخ کر بولی۔

''تم...... تم نے اس...... اس آوارہ...... تھرڈ کلاس لڑکی کے لیے مجھے...... مجھے طلاق دی ہے جو تمہارے دو بچوں کی ماں ہے جس نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ تم اس قدر احسان فراموش شخص ہو میرے سارے احسانات بھلا کر اس دو ٹکے کی چھوکری کے لیے مجھے چھوڑ دیا۔ میں اس کے لیے تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' یہ کہہ کر منزہ بیڈ پر گر کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

''منزہ بیگم اب یہ ناٹک بند کرو۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے چلتی بنو۔ اب تمہارا مجھ پر اور میرے گھر پر کوئی حق نہیں۔ ہاں اگر تم چاہو تو بچوں کو رکھ سکتی ہو تم جیسی عورت کی کوکھ سے جنم لینے والے بچوں کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔'' حارث نے نفرت بھرے لہجے میں منزہ سے کہا۔

''ہاں...... ہاں تم جیسے عورتوں کے شکاریوں کو بچوں کی کیا ضرورت اور پرواہ ہو سکتی ہے تمہارے تو پتہ نہیں کتنے ہی ناجائز بچے اِدھر اُدھر رلتے پھرتے ہوں گے۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے تم جیسے شخص کے مکروفریب میں آ کر تم سے شادی کر لی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ جو شخص پہلے ہی ایک بیوی چھوڑ چکا ہے۔ وہ کل مجھے بھی چھوڑ دے گا۔ میری آنکھوں پر تو پٹی بندھی تھی اندھی ہو گئی تھی۔

''اب تم اپنی اس چہیتی کا ہاتھ پکڑو اور چلتے بنو یہاں سے۔ یہ گھر میرے نام پر ہے شکر ہے میں نے تمہاری منت سماجت کے باوجود گھر تمہارے نام پر نہیں کیا اور ہاں گاڑی کے کاغذات بھی میرے نام پر ہیں اُسے بھی ہاتھ مت لگانا۔ گاڑی کی چابی یہاں ٹیبل پر رکھو اور نکلو میرے گھر سے۔ ورنہ پولیس کو بلا کر دھکے مار مار کر باہر پھنکوا دوں گی تم او باشوں کو۔'' منزہ نے بیڈ سے اُٹھ کر دوپٹے کے پلو سے اپنی متورم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے غصے سے بلبلا کر کہا۔

تو حارث نے جلدی جلدی اپنے کپڑے اور دوسری

ضروری چیزیں سمیٹیں پھر فون کر کے ٹیکسی منگوائی اور انیلہ کے ہمراہ ٹیکسی میں بیٹھ کر ہمیشہ کے لیے اس گھر سے نکل گیا۔

منزہ کے گھر سے نکل کر حارث انیلہ کے ہمراہ ماڈل ٹاؤن اور فیصل ٹاؤن کے درمیان سے گزرنے والی سڑک پر واقع ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آ گیا۔ یہ فلیٹ اُس کے ایک دوست کا تھا جو بیرون ملک ہوتا تھا اور وہ جاتے ہوئے حارث کو اُس کی چابی دے گیا تھا کہ وہ کوئی مناسب گاہک دیکھ کر اُس کو بیچ دے۔ دو کمروں پر مشتمل اس فلیٹ کے لیے کوئی گاہک ڈھونڈ ھنے کی بجائے حارث نے اُسے اپنے قبضے میں رکھا تھا تا کہ اپنی اور اپنے جیسے دوسرے عیاش دوستوں کی عیاشیوں کے لیے ایک ٹھکانہ بنا سکے۔ وہ انیلہ کو کئی بار پہلے بھی اس فلیٹ میں لے کر آ چکا تھا۔ اور اب تو وہی اُس کا گھر تھا۔

''حارث منزہ باجی نے ابا کو فون کر کے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔'' فلیٹ میں پہنچ کر اتنی دیر سے چپ چاپ ذری سہمی انیلہ نے لب کشائی کی۔

''اُسے تمہارے ابا کا فون نمبر کہاں سے معلوم ہوگا۔'' حارث نے غصے سے انیلہ سے کہا۔

''وہ اکثر سعدیہ آنٹی کے پارلر پر جاتی رہتی ہیں اُن کو فون کر کے معلوم کر لیں گی۔'' انیلہ نے کہا۔

''ہاں اس سلسلے میں تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آج تم آفس نا جاؤ۔ میں تمہارے باس کو فون کر دوں گا۔ پہلے چلو تمہیں گھر چھوڑ آؤں اور ساری صورتِ حال بھی واضح کر دوں۔'' حارث نے فلیٹ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ جب وہ لوگ انیلہ کے گھر پہنچے تو جیسا انیلہ نے کہا تھا ویسا ہی ہوا انیلہ کا ابا دکان سے گھر آ چکا تھا اُسے منزہ نے فون کر کے ساری بات بتا دی تھی۔ اور وہ صغریٰ غریب پر غصے سے چلا رہا تھا اُسے اور انیلہ کو غلیظ گالیاں بک رہا تھا۔ غصے کے مارے اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ جیسے ہی اُس نے انیلہ اور حارث کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا وہ غصے سے لال پیلا ہو کر انیلہ کی جانب لپکا۔

''آ گئی حرام زادی اپنے یار کے ساتھ جیسی ماں ویسی بیٹی..... یہ صلہ دیا ہے تم نے میرے لاڈ پیار کا۔''

صدیق نے انیلہ کو بالوں سے پکڑ کر اُس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو صدیق تمہیں کوئی حق نہیں میری بیوی پر اس طرح ہاتھ اٹھانے کا۔'' حارث نے صدیق کا ہاتھ پکڑ کر غصے سے کہا۔

''تم بکواس کرتے ہو تم نے کوئی شادی وادی نہیں کی اس سے تمہاری بیوی نے تمہارے سارے کرتوت مجھے بتا دیے ہیں رنگے ہاتھوں عیاشی کرتے پکڑے گئے تو نکاح کرنے کا بہانہ بنا دیا۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس نکاح کا..... کہاں ہے نکاح نامہ کن گواہوں کے سامنے تم نے نکاح کیا تھا۔'' صدیق نے حارث کا گریبان پکڑ کر اُسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

اس اثناء میں گھر کے سارے ہی افراد شور سن کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ صدیق کی بوڑھی والدہ اور والد بھی لاٹھی ٹیکتے ہوئے وہاں آ گئے۔ صدیق کے بڑے بھائی اور والد، والدہ نے اُسے سمجھایا کہ وہ اس طرح اونچی آواز میں بول کر اپنی بیٹی کو محلے میں بدنام نہ کرے۔ پہلے بیٹھ کر آرام سے بات کرے پھر جو بھی فیصلہ کرنا ہے باہم سارے گھر والوں کی صلاح سے ہو انہوں نے حارث کو بھی سمجھایا۔ کافی دیر کی بحث و تکرار کے بعد حارث اور صدیق کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

حارث نے اعتراف کر لیا کہ اُس نے انیلہ سے باقاعدہ نکاح تو نہیں کیا البتہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر اُسے اپنی بیوی ضرور کہا تھا مگر یہ کہ اُن دونوں کے درمیان کسی قسم کے غلط تعلقات نہیں تھے وہ انیلہ کو اپنے گھر اس لیے لے کر گیا تھا تا کہ اپنی بیوی سے اُسے ملوا سکے اور پھر اُس سے شادی کی اجازت لے کر وہ اُن لوگوں کے پاس شادی کی بات چیت کی غرض سے آ سکے۔ اور یہ کہ وہ پہلی مرتبہ گھر سے باہر انیلہ سے اس طرح ملا تھا۔ ورنہ تو اُسے پتہ ہی نہیں تھا کہ انیلہ کس وقت دفتر جاتی ہے اور کس وقت پارلر جاتی ہے۔ وہ اُسے اچھی لگتی ہے اس لیے اُس نے اس سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔'' حارث کی بات سن کر اگرچہ سب کو یقین تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہا ہے مگر اس کی بات ماننے بغیر کوئی چارہ بھی نا تھا کہ بیٹی کی عزت کا سوال تھا۔

(جاری ہے)

ناولٹ

نزہت جبیں ضیا

درد یہ لا دوا نہیں جاناں

"نہیں نہیں یار! چھوڑوں گا نہیں پڑی رہے گی وہ بھی گھر میں ممز جان کو اس کی خدمتوں کی عادت ہوگئی ہے اس کے لیے یہی محبت ہے کہ اس کے نام کے ساتھ میرا نام جڑا ہو وہ میرے نام سے منسوب رہے اور کیا چاہیے اسے اور سب سے بڑی بات......

ظفریاب خان کی گاڑی جیسے ہی 'پھول گلی' کی سمت مڑی۔ اُن کی سماعتوں میں طبلے کی گونج ڈھولک کی تھاپ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہی مانوس آوازیں جو برسوں سے اُن کی سماعتوں کے کسی کونے میں محفوظ تھیں۔ گلاب اور چنبیلی کی مہک 'میٹھے پان کی مخصوص الائچی والا ذائقہ جوان کی زبان پر آج بھی محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری وہی 'رنگینیاں' لہراتے آنچل سب کچھ...... سب کچھ آج بھی ویسا ہی لگتا تھا جیسے...... جیسے وہ برسوں پہلے چھوڑ گئے تھے۔ یہاں سے ناطہ توڑ کر...... ان راستوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر وہ یہاں سے لوٹے تھے مگر...... آج...... آج...... بائیس سال...... بائیس سال بعد آج ایک بار پھر...... نہ جانے کیوں...... اُن کے قدم اسی منزل کی جانب اُٹھ گئے تھے۔ راستہ وہی تھا...... ماحول وہی تھا...... ظفریاب خان بھی وہی تھے مگر...... اب حالات بدل چکے تھے۔ آج...... وہ تنہا تھے...... تب وہ اکیلے نہیں آئے تھے۔ تب ظفریاب خان کے اندر اکتاہٹ تھی۔ بیزاری تھی' ناامیدی تھی۔

لیکن آج...... آج اُن کے اندر بے چینی تھی بے قراری تھی اضطراب تھا' تنہائی تھی آج وہ ڈپریشن کا شکار تھے۔ عمر کے بائیس قیمتی سال گزارنے کے بعد آج پھر...... وہی...... مقام اور اسی دروازے کی جانب...... اسی غلاظت کی طرف نہ چاہتے ہوئے بھی...... نہ جانے کیوں ان کے قدم 'ستارہ بائی' کے دروازے کی جانب اٹھنے لگے تھے اور ذہن ماضی کی جانب......

جیسے ہی شام کی سرخی رات کی سیاہی میں بدلنے لگی۔ 'ستارہ بائی' کے ٹھکانے میں رنگینیاں پوری آب و تاب کے ساتھ ماحول کو خیرہ کر دینے کے لیے اتر آئی تھیں۔ ہال کے مخصوص حصے پر ستارہ بائی رنگین غالیچے پر بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے بڑا سا چاندی کا گول نقش پاندان رکھا تھا۔ پاندان کے ساتھ ہی گول چاندی کی خوبصورت ٹرے رکھی تھی۔ جس میں ستارہ بائی پان کی

گلوریاں بنا کر چاندی کے ورق میں لپیٹ کر سجا رہی تھیں۔ ہال کے ساتھ بنے ہوئے کمروں میں بھی سجائی تو خیز لڑکیاں ستارہ بائی کے اشارے کی منتظر بیٹھی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ خوب صورت قالین پر گاؤ تکیوں سے لگے شہر کے معززین اور شرفاء بیٹھے تھے جو اس خوب صورت محفل کا لطف اٹھانے یہاں پر جمع ہو کر اپنی ناجائز کمائی ناجائز حرکتوں پر لٹانے کے لیے آئے تھے۔ ہال کے بیچ میں لڑکیاں گانے گا کر اور رقص کر کے آنے والوں کے دلوں کو خوش اور اُن کی آنکھوں کو تازگی دے کر اُن کو دعوتِ گناہ دے رہی تھیں۔ آنے والے تماش بین' معززین ان کی اداؤں پر سر دھن رہے تھے اپنی آنکھوں کو سیراب اور اپنی جیبوں کو ہلکا کر رہے تھے۔

ظفریاب خان خاندانی رئیس اور جدی پشتی امیر تھے۔ وہ آج پہلی بار اس بزم کا حصہ بنے تھے۔ اپنے جگری دوست فرقان احمد کے اصرار پر وہ یہاں آ تو گئے تھے مگر...... یہاں آ کر انہیں سخت کوفت ہو رہی تھی۔ یہ بے باکی' فحش اشارے بازیاں' مردوں کی حریص لڑکیوں کے جسموں پر پڑتی ہوئی نگاہیں' یہ سب اُن کے لیے قطعاً نیا اور ناقابل برداشت تھا۔ فرقان احمد بھی اُن جیسا ہی رئیس تھا مگر بگڑا ہوا تھا۔ وہ ایسے ماحول کا عادی تھا۔ کئی بار یہاں آ چکا تھا اس لیے وہ پوری طرح سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ظفریاب بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ اُن کی بیزاری اور اُکتاہٹ ستارہ بائی کی گھاگ نظروں سے پوشیدہ نہ تھی وہ تو پہلی نظر میں مرد کو بھانپ لیتی تھیں۔ اُن کو اندازہ تھا کہ فرقان احمد کے ساتھ آنے والا معمولی آدمی نہیں ہے۔

ظفریاب دو تین بار فرقان کو واپس چلنے کا کہہ چکے تھے مگر فرقان احمد تو گائیکا کی مدھر آواز میں غرق تھا۔

''او کے فرقان تم یہاں بیٹھو میں جا رہا ہوں۔'' ظفریاب نے اٹھتے ہوئے فرقان احمد کے کان میں کہا اور جانے کے لیے کھڑے ہو گئے اور جیسے ہی رخ بیرونی دروازے کی جانب کیا یکدم ہی ماحول پر مکمل سکوت چھا گیا۔ مغنیہ کی آواز تھم گئی فضا میں پائل کی چھم چھم گونجی نہ چاہتے ہوئے بھی ظفریاب نے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا۔ ایسے لگا جیسے پورے ماحول کو کسی نے اپنی مدھر آواز کے سحر میں جکڑ ڈالا ہو۔

کیا ہے پیار جسے ہم نے زندگی کی طرح
وہ آشنا بھی ملا ہم سے اجنبی کی طرح
ستم تو دیکھیے وہ بھی نہ بن سکا اپنا
ستم......
قبول ہم نے کیے جس کے غم خوشی کی طرح
وہ......

ظفریاب خان کی نظریں اٹھیں تو پلکیں جھپکنا بھول گئیں اندرونی حصے سے ہال میں آنے کے لیے چمکتی موتیوں کی لڑیوں کے درمیان کھڑی وہ کم عمر اور نازک اندام حسینہ جس کی آواز نے کانوں میں امرت تو گھولا ہی تھا۔ ساتھ ساتھ اُس کا مکمل اور ملکوتی حسن نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ سفید لمبی گھیر والی فراک جس پر گولڈن نگینوں اور موتیوں کا بھاری کام تھا جس پر چوڑی دار گولڈن پاجامہ گولڈن اور سفید دوپٹہ سر پر ڈالے۔ کانوں میں ننھے ننھے گولڈن جھمکے کی چمک اس کے گالوں کو روشن کر رہی تھی۔ ہاتھوں میں گولڈن کانچ کی چوڑیاں خوبصورت سفید اور مخروطی انگلیوں میں چمکتی انگوٹھیاں' نرم و نازک ریشمی پاؤں میں گولڈن گھنگھرو والی نازک پازیب' ایک ادا سے

اُس نے ہاتھوں کو اٹھایا اور سیدھا ہاتھ ماتھے پر رکھ کر آداب کیا۔ ظفریاب کی آنکھیں اس کے خوبصورت سفید ہاتھوں کے پیچھے سے چمکتے چہرے پر ٹک گئیں بڑی بڑی براؤن آنکھیں' اس پر جھکی لمبی کالی سیاہ پلکیں' گلابی گال' گلاب کی نازک پنکھڑیوں جیسے تراشیدہ ہونٹ' ستواں ناک اور ناک میں چمکتی ہیرے کی ننھی سی لونگ اور اس سے نکلتی شاعیں جس نے اس پری وش کے چہرے کو جادوئی حسن بخشا تھا۔ قدرت کا ایسا مکمل شاہکار...... اتنا دلکش سراپا' ایسا ملکوتی حسن...... وہاں پر موجود ہر شخص کے لیے باعث توجہ تھا۔

''آؤ...... آؤ...... اُجالا......'' ستارہ بائی نے ایک نظر ہال میں موجود تمام لوگوں پر ڈالی اور خاص طور پر ظفریاب کو دیکھا جو ان تمام لوگوں میں سب سے الگ اور منفرد نظر آرہے تھے۔ جن کے لباس' گھڑی' گلے میں پڑی بھاری چین اور انگوٹھیوں سے ستارہ بائی جیسی عورت مرعوب ہو چکی تھی۔

''یہ ہماری بزم کی نئی بچی ہے' ہماری محفل کی جان۔'' ستارہ بائی نے دوبارہ مسکراتے ہوئے کہا۔

''واہ...... کیا چیز ہے...... ایسی پری...... چشم بدور' صدقے کیا جوانی ہے؟'' چاروں طرف سے مختلف آوازیں آنے لگیں۔ اُجالا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آگے آرہی تھی فرقان احمد نے ظفریاب کا ہاتھ پکڑ کر دبایا تو وہ چونکے اور دوبارہ بیٹھ گئے۔ ہال کے درمیان مخصوص جگہ پر اُجالا آکر بیٹھ گئی اس کی خوبصورت آواز ایک بار پھر فضا میں بکھر گئی۔ اس کی آواز میں درد تھا' سوز تھا' محرومی اور کرب تھا گاتے ہوئے ایک دو بار اس کی نگاہ اوپر اٹھی ظفریاب نے اس کی آنکھوں میں بے بسی دیکھی۔ اس کی پُر سوز آواز نے ماحول پر مکمل سکوت چھا گیا۔ اس کے اوپر چاروں جانب سے نوٹوں کی برسات ہونے لگی۔ ظفریاب بھی اس پر پیسے لٹانے لگے۔

''اچھا لگا ناں یہاں آکر......'' گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے فرقان احمد نے پلٹ کر ظفریاب کی جانب دیکھا۔

''فرقان یار مجھے یہ سب کچھ واقعی بالکل اچھا نہیں لگتا...... مگر......''

''مگر کیا؟'' فرقان نے پلٹ کر پوچھا۔

''اتنا مکمل اور پُرسوز حسن' ایسی دل نشین آواز...... یار یہ پہلی بار دیکھا ہے۔ اُجالا...... جتنی حسین ہے اس کی آواز اتنی ہی پُرسوز اور دل کو چھو لینے والی ہے۔'' ظفریاب مکمل طور پر اس کی آواز کے سحر میں ڈوب چکے تھے۔

''ارے میری جان! تُو نے دیکھا ہی کیا ہے؟ ایک لڑکی کو لے کر تو سمجھتا ہے ساری دنیا ختم ہوگئی ہے سب کچھ ختم ہوگیا۔ تُو نے کبھی کہیں اور دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی مشرقی مرد کی طرح ایک کو لے کر بچپن سے آج تک اس کے خواب دیکھتا رہا۔ اس کو سوچتا' اس کے لیے جیتا رہا' دنیا بہت حسین ہے میرے بھائی۔ میں کون سا تجھے اُلٹا سیدھا کرنے کو کہتا ہوں۔ بس کبھی کبھار یہاں آکر خود کو فریش کرلیا کر آنکھوں کو بھی اور دل کو بھی۔'' فرقان نے شرارت سے کہہ کر آنکھ دبائی تو ظفریاب بنا جواب دیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

ظفریاب خان خاندانی لحاظ سے نواب فیملی سے تھے۔ لاکھوں کی جائیداد کے تنہا اور اکلوتے وارث والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑا سا کاروبار تھا' جس کو والد کے دوست ولایت صاحب کی زیرے

سرپرستی وہ خود چلاتے تھے۔ ظفریاب کے تایا سکندر یاب خان کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اُن کی اکلوتی بیٹی اُلفت آراء جو ظفریاب سے چار سال چھوٹی تھی۔ ظفریاب کو بچپن سے ہی گڑیا جیسی اُلفت بہت اچھی لگتی تھی اُلفت کو بھی ظفریاب اچھا لگتا تھا۔

بچپن سے ساتھ ساتھ رہتے' ایک دوسرے کا خیال رکھتے رکھتے وقت کے ساتھ ساتھ آپس میں دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی یوں حشمت آراء اور سطوت آراء جو دیورانی جٹھانی ہونے کے ساتھ ساتھ بہنیں بھی تھیں دونوں کا رشتہ طے کر دیا۔ ظفریاب فطرتاً نرم خو اور مصالحت پسند تھے۔ بے تحاشہ پیسے اور لاکھ اکلوتے ہونے کے باوجود غرور یا تکبر نہ تھا جبکہ الفت فطرتاً ضدی' من مانی کرنے والی اور خود مختار تھی۔ دونوں کے گھروں میں زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ اس لیے اکثر ایک دوسرے کے گھر آجاتے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بہت ساری باتیں کرتے' مستقبل کی پلاننگ کرتے دونوں مائیں اپنے اپنے بچوں کو دیکھ دیکھ جیتی تھیں۔ اسی طرح بچپن سے جوانی آگئی۔ پڑھائی بھی چلتی رہی ظفریاب کو اسٹیڈیز کے لیے باہر جانے کا چانس مل گیا تب الفت نے میٹرک کیا تھا۔ شادی میں ابھی ٹائم تھا اس لیے حشمت آراء نے اُسے روکا نہیں اور وہ پڑھائی کی غرض سے آسٹریلیا چلا گیا۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب وہ الفت سے بات نہ کرتا کم از کم چار سال تو اس نے باہر ہی گزارنے تھے۔

اُدھر الفت کالج میں آئی تو مزید آزاد ہوگئی۔ سطوت آراء اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ آگے پیچھے ہونے والے بچے جانبر نہ ہو سکے اس لیے وہ اُلفت کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتیں اس کی کوئی خواہش' کوئی بات رد نہ کرتیں۔ مالی لحاظ سے کوئی پریشانی تو تھی نہیں سکندر یاب خان کا اپنا ذاتی کاروبار تھا جو اب سطوت آراء کے بھائی نے ایمانداری سے سنبھال رکھا تھا۔

ظفریاب تعلیم مکمل کر کے آیا تب تک اُلفت نے گریجویشن کرلیا تھا۔ دونوں بہنوں کا ارادہ تھا کہ اب ظفریاب اور الفت کی شادی کر دی جائے۔

مگر الفت نے ہٹ ڈال دی کہ اس نے ماسٹرز کرنا ہے۔

''کوئی ضرورت نہیں اب مزید پڑھنے کی' تمہیں کون سا وہاں جا کر نوکری کرنی ہے بس شادی کرو اور گھر سنبھالو۔'' سطوت آراء نے سختی سے انکار کر دیا۔ مگر الفت نے تو ضد پکڑ لی۔

''ظفریاب! کیا تم مما جان سے میرے ایڈمیشن کی بات نہیں کرو گے؟'' الفت نے ظفریاب کا سہارا لیا۔

''سچ پوچھو تو اُلفت میرا بس چلے تو ابھی تم کو اُٹھا کر لے جاؤں اور شادی کرلوں مگر..... تمہاری خواہش ہے تو چلو تم پڑھ لو اور ایڈمیشن لے لو۔'' ظفریاب نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہا۔

''اوہ تھینکس جانو آئی لو یو۔'' اُلفت بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔

''آئی لو یو تو میری جان۔'' ظفریاب نے اُس کا ماتھا چوم کر کہا اسے وہ لڑکی دل و جان سے زیادہ عزیز تھی اس کی خوشی کی خاطر ظفریاب مزید دو سال کی دوری برداشت کرنے کو تیار ہو گیا۔

الفت یونیورسٹی گئی تو اُس میں واضح تبدیلیاں آ گئیں۔ پہلے سر سے چادر اتری اور پھر..... چادر کی جگہ صرف دوپٹے نے لے لی۔ کپڑوں کی

تراش اور فیٹنگ پر خصوصی توجہ دینے لگی۔

''اُلفت! تم نے چادر کس کی مرضی سے اُتاری ہے؟ یوں صرف دوپٹے میں آنے جانے لگی ہو۔ ہمیں یہ سب اچھا نہیں لگتا اور قمیض دیکھی ہے اپنی...... اتنی چست ہے...... چلو جاؤ جا کر سر پر چادر لے کر پھر یونیورسٹی جانا۔'' اس روز اُسے جدید فیشن کے کپڑوں پر چھوٹا سا جارجٹ کا دوپٹہ ڈال کر تیار ہوتے دیکھ کر سطوت آراء نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

''اوہ مما جان! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ میری ساری فرینڈز ایسے ہی یونیورسٹی آتی ہیں اور کبھی ...... کبھی تو بغیر دوپٹے کے بھی آ جاتی ہیں۔ میں نے چادر ہی اُتاری ہے۔ دوپٹہ تو نہیں اتارا ناں؟'' چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے الفت نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''واہ جی واہ! بہت اچھی بات ہے تمہاری دوستوں کی؟ بی بی اُن کی مائیں اندھی ہوں گی یا بے غیرت...... نہ میں ابھی اندھی ہوئی اور نہ ہی اتنی بے غیرت کہ تمہیں اُن جیسا بننے کے لیے چھوڑ دوں۔'' اس بار سطوت آراء کے لہجے میں تلخی کے ساتھ غصہ بھی تھا۔

''ارے مما جان! ڈونٹ وری اب میں ایسی بھی نہیں ہوں آپ کیوں ناراض ہوتی ہیں؟''

''اچھا! میں چلتی ہوں دیر ہو رہی ہے او کے بائے۔'' قریب آ کر الفت نے لاڈ سے سطوت آراء کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا اور پھر اپنا بیگ اُٹھا کر باہر کی جانب چل دی سطوت آراء اُسے دیکھتی رہ گئیں۔

ظفریاب کو جب ٹائم ملتا وہ چکر ضرور لگا لیتا۔ ویسے میسجز پر تو بات کرتا رہتا۔ اُلفت بھی ایک ایک بات اُس سے شیئر کرتی۔ ظفریاب کو اچھا لگتا جب وہ چھوٹی چھوٹی باتیں اُسے بتاتی چھوٹی چھوٹی بات پہلے اس کے گوش گزار کرتی۔ مگر چند دنوں سے اُس میں تھوڑی سی تبدیلی آئی تھی۔

حشمت آراء کی طبیعت کچھ ناساز تھی سطوت آراء اور الفت انہیں دیکھنے کے لیے آئے تھے۔

''ہائیں یہ کیا...... تم نے بال کٹوا لیے؟'' حشمت آراء کے پاس بیٹھے ظفریاب نے جب الفت کو جدید انداز سے سیٹ کیے گئے شولڈر تک بالوں کو دیکھا تو اُسے بری طرح دھچکا لگا۔ سیاہ لمبے گھنے اور چمکیلے بالوں سے تو ظفریاب کو عشق تھا جب وہ نہا کر اپنے گیلے بال سلجھا کر اپنی کمر پر پھیلاتی تو ظفریاب اس کے حسین بالوں کو دیکھتا رہ جاتا۔

''ہائے جانے کب مجھے اِن حسین بالوں میں منہ چھپا کر سونے کا موقع ملے گا۔'' وہ دل پر ہاتھ رکھ کر محبت کی شدتوں کے ساتھ اُس کے کان میں گنگناتا۔ اُلفت کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور ظفریاب کی نگاہ اس کے بالوں سے ہٹ کر اس کے سرخ گالوں پر پڑتے ڈمپل سے اُلجھ جاتی۔

''کیوں اچھے نہیں لگ رہے؟'' ایک ادا سے جھٹکا دے کر بالوں کو شولڈر پر پھیلا کر سوال کیا تو ظفریاب چونکا۔

''اچھے لگ رہے ہیں مگر...... مجھے تمہارے لمبے بال ہی اچھے لگتے تھے۔ مجھ سے ہر بات پوچھتی ہو، بتاتی ہو کم از کم مجھے بتا دیتیں کٹوانے سے پہلے۔'' اس بار ظفریاب کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''سوری ظفریاب! اصل میں، میں فرینڈز کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی تھی۔ اس کی ہیر کٹنگ مجھے اچھی لگی تو میں نے کروالی۔'' اُلفت نے صفائی پیش کی۔

''اِٹس او کے!'' ظفریاب آہستگی سے بولا۔ اُسے تو بس الفت کی خوشی عزیز تھی۔

الفت کا لاسٹ سیمسٹر ہونے والا تھا۔ اس کے بعد ظفریاب اور الفت کی شادی ہو جانی تھی۔ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حشمت آراء اور سطوت آراء تیاریاں کر رہی تھیں۔ حشمت آراء کے ساتھ برسوں پرانی ملازمہ سکینہ تھیں جو گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔۔ اِدھر شادی کی تیاریوں میں تیزی آئی اُدھر الفت کے رویے میں ظفریاب نے تبدیلی محسوس کی۔ اکثر وہ ظفریاب کے میسیجز کا جواب نہیں دیتی کال ریسیو نہ کرتی۔ ظفریاب گلہ کرتا تو پڑھائی کی ٹینشن اور سمسٹر کی تیاری کا کہہ کر اُسے مطمئن کر دیتی۔

اللہ اللہ کر کے سمسٹر ختم ہوئے ظفریاب نے سکون کی سانس لی۔ اسی شام آفس سے سیدھا الفت سے ملنے چلا آیا۔

''آؤ آؤ بیٹا! کافی دنوں بعد آئے حشمت آپا کو بھی لے آتے۔'' سطوت آراء نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''خالہ جان! میں آفس سے آیا ہوں اور الفت پڑھائی میں مصروف تھی اس لیے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے وہ ہے کہاں؟'' ظفریاب نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ اپنی فرینڈز کے ساتھ باہر گئی ہے۔'' سطوت آراء نے کہا۔

''اچھا......'' ظفریاب نے حیرت سے کہا وہ تو سمجھ رہا تھا کہ الفت سو رہی ہو گی تب ہی میسیجز کا ریپلائی نہیں کیا۔

''اچھا خالہ جان میں چلتا ہوں۔'' ظفریاب کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ گیا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ الفت نے جواب کیوں نہیں دیا۔ گاڑی لے کر وہ بازار کی طرف آ گیا۔ حشمت آراء کی کچھ دوائیاں لینی تھیں۔ گاڑی سے اُتر کر اس نے ڈور بند کرتے کرتے سامنے نگاہ اٹھائی۔ آنکھیں پھیل کر ساکت ہو گئیں۔

''الف...... وہ الفت ہی تھی۔ کسی غیر مرد کے ساتھ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہنستی مسکراتی اور پُرسکون...... اور...... آدمی نے پھول بیچنے والے بچے سے گجرے لے کر اسے اپنے ہاتھوں سے پہنائے۔ الفت نے بے خود ہو کر اپنا سر آدمی کے کاندھے پر ٹکا دیا اور...... اور...... آدمی نے اس کے سر پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

''اُف...... اُف......'' ظفریاب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ بے ہودگی' یہ وارفتگی' یہ انداز...... ایک غیر مرد کے ساتھ...... اس کی ہونے والی بیوی تھی۔ اس کی چاہت...... ظفریاب کے سارے بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ دل چاہا جا کر الفت کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر گاڑی سے نکالے اور اس مرد کو...... اس مرد...... کو گولی سے اڑا دے...... وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھونے لگا تھا۔ اتنی دیر میں وہ گاڑی زن سے نکل کر گاڑیوں کے اژدھام میں کھو گئی۔ قبل اس کے ظفریاب سنبھلتا اور اس گاڑی کا پیچھا کرتا وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ظفریاب نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''یہ...... کیسا منظر تھا؟'' کیسا لمحہ تھا جب اس نے یہ سب کچھ دیکھا۔ اپنے گھر جانے کی بجائے اس نے سطوت آراء کے گھر کی جانب گاڑی موڑ لی۔

''الفت...... اُلفت......'' چیختا ہوا وہ گھر میں

داخل ہوا۔ اور دندناتا ہوا سطوت آراء کے کمرے کی جانب آیا جہاں بیٹھ کر الفت اپنی سینڈلز اُتار رہی تھی۔

''کہاں سے آرہی ہو تم آوارہ گردی کر کے......؟'' آتے ہی چلا کر الفت کو مخاطب کیا۔

''ظفریاب دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟ یہ کیا بک رہے ہو؟'' سطوت آراء کو بھانجے کا انداز انتہائی ناگوار گزرا۔

''یہ تو آپ اپنی اس لاڈلی سے پوچھیں جو نہ صرف میری بلکہ آپ کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک رہی ہے۔ آپ کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچا رہی ہے۔''

ظفریاب نے پلٹ کر زہر خند لہجے میں خالہ کو مخاطب کیا۔

''کیوں کیا کیا ہے اس نے؟''

''مما جان! یہ بکواس کر رہے ہیں۔'' الفت نے زہریلی نظر ظفریاب پر ڈال کر بدتمیزی سے کہا۔

''بکواس کر رہا ہوں میں...... ہاں...... میں بکواس کر رہا ہوں...... اور...... تم...... جو فحاشی پھیلا رہی ہو۔ سرعام اوچھی اور ناشائستہ حرکتیں کر رہی ہو۔ غیر مرد کے ساتھ گھر رے اڑا رہی ہو...... میرے نام کے ساتھ منسوب ہونے کے باوجود کسی اور مرد کے ساتھ اخلاقی حدیں پار کر رہی ہو...... وہ...... وہ سب کیا ہے؟ تمہاری شرافت؟''

''نیک نامی اور...... تمہاری سچائی......؟ بولو...... جواب دو......'' ظفریاب غصے سے کانپ رہا تھا۔ الفت سمجھ چکی تھی کہ وہ سب کچھ دیکھ چکا ہے اب کچھ چھپانا فضول تھا۔

''ہاں...... ہاں وہ میری محبت ہے اور میں اس کے ساتھ تھی...... اور...... اچھا ہوگیا کہ تم نے خود دیکھ لیا اور میرے لیے آسانی پیدا کردی۔ اور یہ بات اپنے دل اور دماغ سے نکال دو کہ میں تم سے منسوب ہوں۔ تمہاری ہونے والی بیوی ہوں۔ یا مجھ پر تمہارا کوئی حق ہے۔ کیوں کہ...... میں نے فراست سے نکاح کرلیا ہے۔ اور اب تم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

اُف کس قدر سفاکی بے رحمی ڈھٹائی اور بے غیرتی سے الفت نے اعتراف کرلیا تھا۔

''ک...... کیا...... کیا کہہ رہی ہو تم؟ الفت تم...... پاگل ہوگئی ہو کیا؟ الفت ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے صرف تمہارے ساتھ جینے مرنے کے خواب دیکھے ہیں بچپن سے لے کر آج تک...... صرف اور صرف تمہیں چاہا ہے۔ تم ایسا کس طرح کرسکتی ہو...... پلیز...... کہہ دو یہ مذاق ہے۔ جھوٹ ہے۔ اتنا بڑا مذاق...... اتنا جان لیوا...... بھیانک مذاق مت کرو مجھ سے...... میں...... برداشت نہیں کرپاؤں گا۔''

ظفریاب کے لہجے میں غصے کی جگہ نرمی اور لجاجت آگئی تھی۔ یہ سب کچھ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا الفت یوں اتنا بڑا قدم اٹھالے گی۔

''ظفریاب خان! یہی سچائی ہے میں دو سال سے فراست کو جانتی ہوں میری فرینڈ کے کزن ہیں اور میرے آئیڈیل بھی اس لیے اس حقیقت کو تسلیم کرلیں اور آئندہ مجھ سے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش مت کریں۔'' کتنی بے رحمی سے فیصلے پر فیصلہ سنا رہی تھی۔

''الفت...... الفت...... تو نے یہ کیا کیا...... نامنجار لڑکی ہمارے اعتماد کی اعتبار کی یوں دھجیاں

بکھیر دی تُو نے...... ہمیں اپنی ہی نظروں میں ذلیل کر دیا...... کیوں کیا...... کیوں کیا ایسا؟'' سطوت آراء جو دم بخود آنکھیں پھاڑے سب کچھ سن رہی تھیں اچانک سے اٹھیں اور الفت پر تھپڑوں کی بارش کرتے ہوئے روتے ہوئے چلا چلا کر سوال کر رہی تھیں اور الفت مضبوط چٹان کی طرح کھڑی تھی۔ کسی قسم کی ندامت' شرمندگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

اب سوال جواب کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ تاویلیں...... دلائل' اعتراضات' وجوہات سب کچھ بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اگر مگر کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ بچی تھی کوئی راستہ کوئی صورت' کوئی امکان...... کچھ بھی تو نہیں تھا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اس گز بھر کی لڑکی نے چھ فٹ کے مضبوط مرد کو ریزہ ریزہ کر ڈالا تھا۔ اُن کی حیثیت کو دو کوڑی کا بنا کر مٹی میں ملا دیا تھا۔ ظفریاب نے دھندلائی آنکھوں سے آخری بار اس سفاک لڑکی کے مضبوط چہرے کو دیکھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے سے نکل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس گھر اور گھر والوں کی زندگی سے نکلتے چلے گئے۔

اُن کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ ذہنی طور پر بری طرح بکھر چکے تھے۔ دل بھر آ رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ گاڑی ڈرائیو کر کے گھر تک پہنچے اور ماں کی گود میں سر رکھ کر بری طرح بکھر گئے۔ دل کا درد آنکھوں کے راستے بہہ بہہ کر ماں کی شفیق بازوؤں میں بکھرتا گیا۔

''میری جان! میرے بچے خیر تو ہے ناں؟ کیا ہو گیا؟ ارے میرا کلیجہ منہ کو آ رہا ہے' ہوا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔'' ظفریاب کی حالت پر وہ تڑپ کر انہیں جھنجھوڑنے لگیں اور جب اُن کو حقیقت کا علم ہوا تو اُن کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ غصے سے دماغ پھٹنے لگا۔

''میں ابھی جا کر خبر لیتی ہوں اس ناہنجار لڑکی کی...... اُس نے کیا سوچ کر یہ قدم اٹھایا۔ ناک کٹوا کر رکھ دی...... ہم اتنے گرے پڑے تو نہیں کہ گز بھر کی لڑکی کے آگے بے بس ہو جائیں۔''

''مما جان! اب ان باتوں کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ضرورت...... الفت آراء ہماری زندگیوں سے دور...... بہت دور جا چکی ہیں۔ ہمیں ٹھکرا دیا ہے...... میری کوئی اہمیت نہ رہی۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ اس نے مجھے میری نظروں میں گرا دیا ہے مما جان...... میں...... اس کے قابل نہیں۔'' ظفریاب نے ہاتھ اُٹھا کر ماں کو کچھ کرنے اور کہنے سے روکا اور ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چلے گئے۔ اپنے کمرے کو لاک کر کے وہ الفت کو یاد کر کے ایک بار پھر بری طرح بکھر گئے۔

سارے رشتے ناطے تو ٹوٹے سو ٹوٹے مگر جس بری طرح سے ظفریاب ٹوٹے تھے کہ اب ان کا پھر سے جڑنا ناممکن ہوتا نظر آ رہا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ اپنے کمرے میں ہی قید ہو کر پرانی یادوں میں اُلجھے رہتے۔ ماضی کی یادیں' باتیں اور خوب صورت پل انہیں ایک لمحے کے لیے پُرسکون نہ رہنے دیتے۔ پاگلوں جیسی حالت بن کر رہ گئی تھی۔ نہ گھر کا خیال تھا' نہ ماں کی فکر اور نہ کاروبار کی خواہش وہ تو ولایت صاحب ایماندار اور نیک انسان تھے اور دوسرے ورکرز بھی اچھے تھے کہ کاروبار چل رہا تھا ورنہ جو حالت ظفریاب نے اپنی بنالی تھی اس سے تو وہ دیوالیہ ہو چکے ہوتے۔ حشمت آراء الگ اُن کو دیکھ دیکھ کر روتی

رہتیں۔ ہنستے مسکراتے شاد آباد گھرانے میں کیسا سوگوار ماحول اتر آیا تھا۔ وہ تو بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ لیکن...... حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ اب وہ بیٹا کئی کئی دن شیو نہ کرتا۔ نہ کپڑے بدلنے کی خواہش ہوتی نہ کھانے کا دل کرتا...... فرقان احمد جو آجاتا تو وہ تھوڑی بہت باتیں کرلیتا...... پھر وہی کمرہ ہوتا...... وہی تلخ یادیں ہوتیں اور ظفریاب ہوتا۔

فرقان احمد کی کوششوں سے ظفریاب نے آفس جانا اسٹارٹ کردیا مگر...... کام میں کوئی دلچسپی نہ لیتا۔ سارے کام ولایت صاحب ہی نمٹاتے ظفریاب کھوئے کھوئے خیالات میں گم رہتے۔

کچھ یادیں ہیں کچھ باتیں ہیں
کچھ ذہن میں ادھورے خواب بھی ہیں
کچھ دکھ کے خزانے پاس میرے
کچھ غم جو ملے نایاب بھی ہیں
دکھوں کے سمندر گہرے بھی
کچھ چھپے زیر آب بھی ہیں
آنکھوں میں آکر بکھرے جو
کچھ ٹوٹے پھوٹے خواب بھی ہیں
یادوں کے بھنور میں پھنسے ہوئے
پیروں میں ابھی گرداب بھی ہیں
سب چاہتیں تو فنا ہوئیں
اور محبتیں غرقاب بھی ہیں

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ظفریاب اپنے کمرے میں لیٹے تھے۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے ماضی کے تانے بانوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ کمرے کی لائٹ جلی تب وہ چونکے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا۔

''آسکتا ہوں؟'' دروازے میں فرقان احمد کھڑے تھے۔

''ہنہ...... آجاؤ!'' آہستگی سے جواب دے کر تھوڑے سے اوپر ہوکر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھے سائیڈ میں رکھا سگریٹ پیکٹ اٹھایا سگریٹ جلا کر ہونٹوں میں دبائی۔ فرقان احمد سامنے کرسی پر بیٹھ کر ان کو دیکھتے رہے انہیں ظفریاب پر ترس آرہا تھا وہ واحد جگری دوست تھے۔

''ظفریاب...... یار! یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے؟ یار کتنا نفاست پسند ہوا کرتا تھا...... وہ ظفریاب جسے میں جانتا ہوں ہر چیز میں پہننے میں کھانے میں...... ہر چیز سے نفاست نظر آتی تھی۔ جو اپنے روم میں ایک تنکا بھی برداشت نہیں کرتا تھا آج...... آج...... اُسے...... نہ تو اپنا خیال ہے...... نہ اپنے کپڑوں کا اور نہ ہی روم کی صفائی کا...... کہاں کھو گیا میرا وہ دوست یار؟'' فرقان احمد کا لہجہ بھیگنے لگا تھا اُن کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر اُداسی نمایاں تھی۔

''کیا کروں یار؟ بہت کوشش کرتا ہوں مگر...... یہ یادیں...... کمبخت یادیں اکٹوپس کی طرح میرے وجود میں دھنسی ہوئی ہیں جتنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں یہ اور زیادہ شدت سے اپنے پنجے گاڑ لیتی ہیں۔ میں بے بس ہوکر رہ جاتا ہوں۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ ماضی کی اُن تلخیوں سے چھٹکارا حاصل کرلوں؟'' ظفریاب نے اپنی سرخ سرخ انگارہ بڑی بڑی آنکھوں کو اُٹھا کر بے بسی سے فرقان احمد کی جانب دیکھا فرقان احمد تڑپ گئے۔ اُن کو اپنے دوست کی بے بسی پر رحم آگیا۔

''گولی مارو یار! ایک بے حس' بے اعتبار لڑکی کے لیے تم خود کو روگ کیوں لگارہے ہو؟ جس کو نہ تمہارے احساسات کی پروا تھی نہ تمہاری چاہت کی قدر...... اُسے تو اپنی عزت کا بھی پاس نہ تھا

یار...... وہ مطلب پرست...... کم عقل تھی۔ وہ ناقدری تھی جس نے تم جیسے انسان کی قدر نہ کی...... وہ تو اپنی زندگی میں عیش کر رہی ہوگی۔ زندگی کے مزے لے رہی ہوگی۔ زندگی کی خوشیوں سے فائدہ اٹھا رہی ہوگی..اور......تم...... تم...... اُس کے لیے اپنی زندگی کو روگ لگا بیٹھے ہو...... یہ زندگی اللہ کی امانت ہے جو اس نے ہمیں بخشی ہے۔ نہ جانے کب؟ کس لمحے...... کس گھڑی وہ اپنی امانت واپس مانگ لے...... کیوں اس امانت میں خیانت کرتے ہو؟ کیوں اللہ کی نعمتوں کا فائدہ نہیں اٹھاتے؟ کیوں خود پر زندگی کو تنگ کر رہے ہو؟ اپنا نہیں تو کم از کم بوڑھی ماں کا خیال کرو جس نے تمہاری خاطر اپنی جوانی تنہائی میں گزار دی تم...... ایک معمولی لڑکی کے لیے اپنی ماں...... اپنی جنت کو بھی بھول چکے ہو...... تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے لیے تمہاری ماں کتنا تڑپتی ہیں؟ اُن کے دل پر کیا گزرتی ہوگی تمہیں یوں بے حال...... اُجڑا ہوا دیکھ کر......؟ خدا کے واسطے زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔ زندگی کو زندگی کی طرح گزارو...... اپنی ماں کی طرف دیکھو اُن کی خواہش کا...... اُن کے جذبات کا احترام کرو......''

''فرقان! ظفریاب نے بے بسی سے انہیں دیکھا مما جان کہتی ہیں شادی کرلو...... میں...... کیسے اُن کی بات مان لوں...... مجھے نفرت ہوگئی ہے شادی کے تصور سے...... یہ خود مختار لڑکیاں...... اُلفت جیسی...... اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں۔ اُس نے بھی تو میرے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ برسا برس میرے ساتھ تو محبت کے دعوے کیے اور...... اور...... شادی کا وقت آیا تو...... تو...... مجھ سے بہتر دیکھ کر مجھے ٹھکرا دیا۔ بنا وجہ بتائے' بنا کچھ کہے۔ سمجھے۔ مجھے چھوڑ دیا...... میں۔''

''وہی تو کہہ رہا ہوں یار! ایسی بے حس اور مطلب پرست' بے وفا لڑکی کے لیے کیوں خود کو برباد کر رہے ہو؟''

''کیا کروں یار...... کسی سے ملنے بات کرنے کا دل ہی نہیں کرتا۔'' ظفریاب کا لہجہ بدستور بے بس تھا۔

''چل یار آج...... تمہیں ایسی جگہ لے چلتا ہوں جہاں جا کر تم ساری تلخیاں بھول جاؤ گے باہر کی دنیا سے الگ دنیا ہوگی۔''

''نہیں یار...... مجھے کہیں نہیں جانا میں ایسے ہی خوش ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔'' ظفریاب اُکتاہٹ سے بولے۔

''نہیں چھوڑ سکتا ناں...... ایسے کیسے چھوڑ دوں اپنے یار کو؟ یوں بے بس اور اُداسی میں ڈوبتا کیسے دیکھ سکتا ہوں میں؟ کتنے ہنس مکھ ہوا کرتے تھے تم...... ایک سال کے اندر تم کیا سے کیا ہوگئے؟ تمہیں اس ماحول سے اُداسی سے نکلنا ہوگا چاہے کسی بھی طرح...... مگر میں تمہیں یہاں سے نکالوں گا...... ایک بار...... بس ایک بار...... میرے ساتھ چلو۔'' فرقان کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی تھی۔ ظفریاب نے سرخ سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھا کتنا پریشان تھا فرقان اس کے لیے بار بار آکر اُسے سمجھاتا...... فرقان کے چہرے پر بھی دکھ تھا' اُداسی تھی۔ ظفریاب نے کتنے دن بعد آج غور سے فرقان کے چہرے کو دیکھا تھا جب دوست اتنا پریشان تھا تو 'ماں' کتنی دکھی ہوگی واقعی اپنے دکھ میں کھو کر وہ سب کو فراموش کر چکے تھے۔ ان رشتوں کو بھی جو سچے دل سے ان سے پیار کرتے تھے انہیں خوش دیکھنا چاہتے تھے۔

اور فرقان احمد کے ساتھ ظفریاب اس راستے کی جانب چل پڑے جہاں جانے کا کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا جہاں جا کر اُن کی نظروں کے سامنے نئی دنیا تھی۔ وہ دنیا جہاں دن سوتے اور راتیں آباد رہتیں تھیں جہاں ظفریاب جیسے لوگ بھی آتے تھے جو صرف اپنا غم غلط کرنا چاہتے تھے۔ ظفریاب ستارہ بائی کے ٹھکانے سے لوٹ آ ئے تھے۔

وہ ساری رات ظفریاب کے کانوں میں مدھر' میٹھی اور سریلی آواز امرت کی طرح اترتی رہی۔ وہ ملکوتی حسن' معصوم چہرہ' اُداس جھیل جیسی گہری آنکھیں تصور میں آ کر بار بار ڈسٹرب کرتی رہیں۔ اس معصوم چہرے کے پیچھے سوگوار غزالی آنکھوں کے اندر کوئی کہانی بہت گہری کہانی نظر آئی جس نے اُجالا کو وہاں پر موجود تمام لڑکیوں میں منفرد بنا دیا تھا۔ دوسری لڑکیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں کوئی اشارے کنائے' اس کے چہرے پر عامیانہ مسکراہٹ نظر نہ آئی۔ وہ تو سب سے الگ سب سے جدا اور معصوم لگ رہی تھی۔

اگلے دو دن ظفریاب نے بے چینی میں گزارے..... فرقان بھی مصروف تھا۔ ظفریاب کا دل اُجالا کی طرف کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ تیسرے دن فرقان آیا تو ظفریاب نے ستارہ بائی کے یہاں جانے کی خواہش ظاہر کی۔

''اوئے ہوئے......'' فرقان احمد نے شرارت سے آنکھیں گھما کر سیٹی بجا کر ظفریاب کو غور سے دیکھا۔ ظفریاب جھینپ گئے۔ دو تین بار تو ظفریاب فرقان احمد کے ساتھ گئے پھر جھجک دور ہوئی تو خود ہی جانے لگے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی قدم اسی منزل کی جانب اٹھ جاتے۔ اُجالا میں کوئی تو ایسی بات تھی جس نے ظفریاب کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا۔ ظفریاب میں واضح تبدیلی آ گئی تھی اب وہ خود پر بھی دھیان دیتے' حشمت آراء کو بھی ٹائم دیتے' کاروبار میں بھی اچھی طرح سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ حشمت آراء جو پہلے ہی بہن کی جدائی اور بھانجی کی حرکت سے حد درجہ دل شکستہ تھیں اوپر سے ظفریاب کی اُداسی دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھیں۔ اُن کو بھی ظفریاب کی تبدیلی نے خاصا پُرسکون کر دیا تھا۔ وہ تو بس یوں خوش تھیں کہ اُن کا بیٹا پھر سے زندگی کے ہنگاموں میں حصہ لینے لگا ہے پھر سے زندگی کی جانب لوٹ آیا ہے۔

ستارہ بائی کئی دن سے یہ بات نوٹ کر رہی تھیں کہ اُجالا کی ویران آنکھیں اس وقت چمک اٹھتیں جب ظفریاب شریک محفل ہوتے' گوکہ وہ اُن کی غیر موجودگی میں بھی محفلیں سجاتی' داد وصول کرتی بے تحاشہ پیسہ کماتی مگر...... ظفریاب کو دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ ظفریاب کے چہرے پر اُن کی آنکھوں میں اجالا کے لیے حرص' ہوس یا عامیانہ پن نہ ہوتا۔ وہ عام مردوں کی طرح للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ظفریاب نے موقع دیکھ کر اُجالا سے دل کی حالت کہہ دی۔ اُجالا جو کہ اچھی فیملی کی لڑکی تھی جسے دھوکے سے یہاں تک لایا گیا تھا۔ وہ یہاں کے ماحول میں رہتے ہوئے بھی آج تک اس نے اپنے جسم کا سودا نہ کیا تھا۔ وہ صرف اپنی آواز بیچتی' ستارہ بائی بھی کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اُجالا بہت قیمتی اور نایاب ہیرا ہے اور اس کی قدر جوہری ہی کر سکتا ہے۔ اجالا جو اس ماحول سے نکلنا چاہتی تھی اسے اچھی اور صاف ستھری زندگی گزارنے کی خواہش تھی۔ وہ بھی نیکی اور شرافت کے راستے پر چلنے کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

متمنی تھی وہ کون سا یہاں اپنی مرضی اور خوشی سے تھی۔ ستارہ بائی کی بیٹی شیلا جو کہ اُجالا کی اچھی دوست بھی تھی۔ وہ بھی اجالا کی کیفیت سے ناواقف نہ رہ سکی۔

''اجالا...... یہ ظفریاب تجھ پر زیادہ لٹو نہیں ہو گیا؟'' شیلا نے اجالا کو تیار ہوتا دیکھ کر سوال کیا۔

''ویسے سچ کہوں یہاں آنے والے مردوں میں سب سے زیادہ خوب صورت ہے وہ بندہ۔'' شیلا نے آنکھ دبا کر عامیانہ لہجے میں کہا۔

''چپ کر شیلا! پاگل ہوئی ہے کیا' وہ تو سب کی طرح ہیں۔'' اجالا سٹ پٹا کر جلدی سے بولی۔

''جھوٹ مت بول میں نے خود تمہیں اس سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔'' شیلا نے ٹھوس لہجے میں کہا تو اجالا گڑبڑا گئی اور اسے سچ سچ بتا دیا کہ ظفریاب اسے پسند کرنے لگے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مجھ سے شادی کریں۔''

''اجالا پاگل تو نہیں ہو گئی ہے تُو......'' ستارہ بائی جو ان دونوں کی باتیں سن رہی تھیں اس کے آخری جملے پر بھڑک کر کمرے کے اندر آ گئی۔ اجالا کے ساتھ شیلا نے بھی چونک کر انہیں دیکھا۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہے...... شادی...... اور تُو...... ہاہاہا...... پگلی یہ بھول جا کہ تجھ سے کوئی شریف انسان شادی کرے گا......''

''مگر اماں...... اُس نے اجالا سے وعدہ کیا ہے کہ اجالا کو اچھی زندگی دے گا اور اسے اپنا نام دے گا...... شاید...... شاید وہ سچ کہہ رہا ہو۔'' شیلا نے اجالا کے دھواں دھواں چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو...... بھی بچی ہے شیلا! تم لوگ کیا جانو ان مردوں کو؟ تم لوگوں نے ان کا صرف وہ روپ دیکھا ہے جب وہ ہم پر اپنی محبتیں نچھاور کرتے ہیں' ہماری اداؤں پر اپنی جیبیں خالی کر دیتے ہیں...... ہمارے لیے ان کی آنکھوں میں شوق اور وارفتگی ہوتی ہے...... یہ شریف لوگ...... اعلیٰ نسل اور خاندانی لوگ ہم سے صرف تسکین حاصل کرنے آتے ہیں...... کچھ دیر ہمارے کوٹھوں پر آ کر اپنی نظروں کو اپنی دل کو دماغ کو ہماری اداؤں سے خیرہ کرتے ہیں اور پھر جب یہاں سے سیڑھیاں اتر کے اپنی لمبی چمکتی گاڑیوں میں بیٹھتے ہیں تو یہی لوگ ہمیں آوارہ' فاحشہ' بدنام' اور غلیظ عورتوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شرفاء کی محفلوں میں بیٹھ کر ہمارے ذکر پر لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھتے ہیں یہ بھلا ہمیں کیا عزت دیں گے؟ کیا مقام دیں گے ہمیں؟''

''ستارہ بائی ظفریاب ایسے نہیں ہیں میں نے ان کی آنکھوں میں کبھی ہوس' مکاری یا عیاشی نہیں دیکھی ہے۔ وہ تو خود عورت کے ستائے ہوئے ہیں۔ زخمی اور ٹوٹے ہوئے' دل شکستہ سے انسان ہیں جن کو سہارے کی' سچی محبت کی ضرورت ہے۔ میں ...... آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں...... وہ تمہیں بہت سارے پیسے دے دیں گے خدا کے لیے مجھے...... آزاد کر دو...... مجھے اجازت دے دو۔'' اجالا دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے ستارہ بائی کے قدموں میں جا بیٹھی۔

''اجالا ...... میں تیری دشمن نہیں ہوں...... بیٹی بنا کر پالا ہے تجھے...... مجھے تو شیلا جیسی ہی عزیز ہے...... میں تجھے صحیح غلط سمجھا رہی ہوں...... تو جس اندھیرے کو روشنی سمجھ رہی ہے ناں...... وہ دراصل مکر و فریب کا جال ہے...... یہ مرد لوگ جذبات میں آ کر اتنا بڑا قدم تو اٹھا لیتے ہیں

مگر...... مگر...... اُن کو اُن کا تہذیب یافتہ اور شریف معاشرہ ہمیشہ کچھ کے دیتا رہتا ہے۔ وہ بہت جلد اُکتا جاتے ہیں۔ اپنے فیصلے کو اپنی ناوانی سمجھ کر ہمیشہ...... اس عورت کو کچو کے لگاتے رہتے ہیں جس کو وہ بڑی شوق سے لے کر جاتے ہیں۔ ہمیشہ ماضی کے حوالے سے طعنے دے دے کر زندگی تنگ کر دیتے ہیں۔ میں نے آج تک تجھ سے کچھ اور کام نہیں کروایا...... تیری مرضی سے تُو صرف گانے ہی گاتی ہے میں نے ہر شخص کو منع کر دیا...... صرف اور صرف تیری مرضی اور تیری وجہ سے اور...... تُو...... ایک فضول بات کو لے کر بیٹھی ہے۔ بھول جا سب کچھ وہ مرد بھی اُن مردوں کی طرح ہے جو یہاں آتے ہیں پیسہ دیتے ہیں اور اپنی خواہش پوری کرتے ہیں۔ بس اور کچھ نہیں...... ہماری طرح تجھے بھی یہیں رہنا ہے' جینا ہے اور یہی مر جانا ہے آئی سمجھ۔'' ستارہ بائی اپنا فیصلہ سنا کر کمرے سے جا چکی تھیں اجالا کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''نہیں ستارہ بائی...... ظفریاب ایسے نہیں ہیں وہ سب سے الگ ہیں' منفرد ہیں۔'' اجالا نے چلا کر کہا اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔

رات گہری ہوئی محفل بھی اپنی رنگینیوں کے ساتھ عروج پر تھی۔ اجالا نے ہال میں داخل ہوتے ہی مخصوص جگہ پر ظفریاب کو بیٹھے دیکھا تو اُس کی جان میں جان آئی۔ ظفریاب کی آنکھوں میں بھی مخصوص چمک آگئی تمام لوگوں کے چہرے بھی کھل اٹھے۔ اجالا نے اپنی مخصوص جگہ سنبھالی اور فضا میں نغمگی پھیلتی چلی گئی۔ گانا ختم ہوا ماحول پر سکوت چھا گیا۔ وہ لوگ جو اجالا کے حسن کے ساتھ ساتھ اُس کی مدھر آواز میں گم تھے۔ بے تحاشا داد دینے لگے۔ نوٹوں کی برسات ہونے لگی۔ آج فرقان بھی ظفریاب کے ساتھ تھا۔ شہر کے مشہور سیٹھ قاسم جو اجالا کے عاشق بھی تھے آج تو وہ بالکل ہی بے قابو ہو رہے تھے گانا ختم ہوتے ہی وہ جگہ سے اٹھے اور اجالا کے پاس آگئے۔ اس کے ہاتھ تھام کر اس کے ہاتھ میں بیش قیمت ہیروں کا بریسلیٹ رکھ دیا۔ ظفریاب نے دیکھا تو وہ غصے سے کھڑے ہو گئے انہیں سیٹھ قاسم کا اجالا کو ہاتھ لگانا برداشت نہ ہوا۔

''واہ! ستارہ بائی! کیسا حسین ہیرا تراش کر رکھا ہے تم نے جتنا مکمل حسن ہے اتنی ہی دلکش آواز......'' سیٹھ قاسم کے عامیانہ انداز پر اجالا نے تڑپ کر اپنا ہاتھ اُس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی مگر گرفت بہت مضبوط تھی۔

''ہاتھ چھوڑیں میرا......'' اجالا نے دانت بھینچتے ہوئے کہا اور ظفریاب کی جانب دیکھا۔

''ہاتھ چھوڑو۔'' ظفریاب تلملا کر اٹھے اور اجالا کے پاس آگئے۔

''ارے واہ! اتنا غصہ کس بات کا ہے جانِ من...... ابھی تو صرف ہاتھ ہی تھاما ہے آگے آگے نہ جانے......''

''تڑاخ! ذلیل کمینے بکواس بند کر۔'' ظفریاب کی برداشت ختم ہوگئی انہوں نے آگے بڑھ کر سیٹھ قاسم کے منہ پر زور دار تھپڑ دے مارا سیٹھ قاسم جو اس اچانک افتاد پر گھبرا گیا لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہو گیا غصے سے بل کھا کر وہ ظفریاب کی جانب پلٹا۔

''اب تو کون ہوتا ہے تیری ہمت کیسے ہوئی سیٹھ قاسم پر ہاتھ اٹھانے کی؟ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔''

''تو بھی یہاں گاہک ہے اور میں بھی گاہک ہوں۔''

"تُو نے ہاتھ کیسے لگایا گھٹیا انسان۔" ظفریاب چلایا۔

"گھٹیا..... گھٹیا..... تو تُو بھی ہے تب ہی یہاں آتا ہے۔" سیٹھ قاسم چلایا۔

ستارہ بائی گھبرا کر اُن دونوں کے درمیان آ گئیں۔ اجالا پریشان ہو کر رونے لگی۔

"بکواس کی تو تیری جان لے لوں گا۔" ظفریاب چلائے۔

"ظفریاب پلیز۔" فرقان احمد نے آکر ظفریاب کو سنبھالا۔

"بڑا آیا شریف انسان..... ابے اوئے..... یہ طوائف کا کوٹھا ہے۔ یہاں پر رہنے والی شریف زادیاں نہیں ہوتیں..... یہ جو شریف زادی بن رہی ہے کہ ہاتھ لگانے پر بھڑک گئی یہ..... نہ جانے راتوں کو.....؟"

"چپ کر ایک لفظ بھی نکالا تو گولی مار دوں گا۔" ظفریاب کی ہمت جواب دے گئی انہوں نے جیب سے پستول نکال لی۔

"خدا کے لیے سیٹھ صاحب ابھی چلے جائیں۔" ستارہ بائی نے سیٹھ قاسم کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"دیکھ لوں گا اس کو میں۔" سیٹھ قاسم تلملاتا ہوا منہ سے کف اڑاتا ہاتھوں کو جھاڑتے ہوئے باہر کی جانب چل دیا۔

"اے میاں! یہ ہمارا کوٹھا ہے اور مردوں کو لبھانا' اُن کی خواہشات پوری کرنا ہمارا دھندہ ہے۔ تم بھی یہاں ایک گاہک کی حیثیت سے آتے ہو..... اگر یہاں آنا ہے تو ایک گاہک کی طرح شرافت سے یہاں آؤ اور واپس لوٹ جاؤ۔ ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرنے یا غنڈہ گردی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

ستارہ بائی نے ظفریاب کی طرف دیکھ کر تلخ لہجے میں کہا۔

"ہوگا تمہارا دھندہ مگر..... کوئی..... کوئی..... اجالا کو ٹچ کرے یہ..... میں برداشت نہیں کروں گا' قتل کر دوں گا اگر کسی نے اجالا کی طرف گندی نظر ڈالی تو....." ظفریاب چلا کر بولے۔

"گندی جگہ پر ہوں تو گندی نظریں ہی مجھ پر پڑیں گی اور..... مجھے گندگی میں ہی رہنا ہوگا..... اگر آپ..... کو یہ سب برا لگتا ہے تو مجھے لے جائیں ناں یہاں سے..... اس ماحول سے نکال لیں۔" اجالا نے ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ظفریاب کو مخاطب کیا۔

ظفریاب اجالا کی بات پر بھونچکارہ گئے۔

"اجالا..... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں نے تجھے سمجھایا تھا ناں..... یہ لوگ اعتبار کے قابل نہیں ہوتے..... یہ کبھی بھی ہم جیسی عورتوں کو عزت نہیں دے سکتے..... یہ سب وقتی ابال' ہے جذبات ہے اور کچھ نہیں..... تُو باز نہیں آئی میرے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا تجھ پر۔" ستارہ بائی اجالا کو دیکھ کر چیخیں۔

"چپ ہو جاؤ ستارہ بائی..... بتاؤ کیا قیمت دوں تمہیں اس ہیرے کی؟ کیا چاہیے تمہیں؟ ابھی اور اسی وقت اجالا کو میرے حوالے کر دو۔ میں نہ صرف اس کو یہاں سے لے جاؤں گا بلکہ اس کو اپنا نام' مقام اور عزت بھی دوں گا۔ اس سے شادی کروں گا۔" اجالا نے حیرت اور خوشی سے ظفریاب کے چٹان جیسے سخت چہرے کی جانب دیکھا۔ ستارہ بائی نے آنکھیں پھاڑ کر ظفریاب کو دیکھا۔

"کیا کر رہے ہو؟" فرقان احمد نے تلملا کر ظفریاب کا کاندھا پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''یہ لو..... یہ لو......'' فرقان احمد کو قطعی نظر انداز کر کے ظفریاب جیب سے نوٹوں کے ڈھیر نکال کر ستارہ بائی کے سامنے اجالا کے پیروں میں پھینکتے رہے...... یہ بھی کم ہے تو یہ لو چیک بک اور لکھ لو اپنی مرضی کی رقم...... لگا دو دام اس انمول ہیرے کے۔'' ظفریاب جذبات کی شدت سے چلا رہے تھے۔

ستائی بائی کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں بلا کی حریص اور لالچی عورت تھی اس نے آگے بڑھ کر نوٹ سمیٹنا شروع کر دیے۔ اور ظفریاب نے اپنی شال اُتار کر اجالا کے نازک وجود پر ڈال دی اور اُسے کاندھوں سے تھام کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ اجالا کے چہرے پر اعتماد' تفاخر اور تشکر تھا۔ شیلا کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں اس نے آگے بڑھ کر اجالا کو گلے سے لگا کر دعا دی تھی اجالا کی بھی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ فرقان احمد حیران پریشان حواس باختہ اس اچانک ہو نے جانے والی افتاد پر ششدر تھا۔

رات کے دو بج رہے تھے اس وقت جذبات میں آ کر ظفریاب اجالا کو لے کر نکل تو آئے تھے مگر گاڑی میں بیٹھ کر سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے؟ اجالا بھی شش و پنج میں تھی۔

''یار خالہ جان سے کیا کہو گے اس ٹائم یوں ایک لڑکی کو لے کر اتنی رات کو کہاں سے آ رہے ہو؟ یہ کون ہیں؟'' فرقان احمد نے کہا۔

''ہاں یار فرقان پلیز کوئی مدد کرو ناں..... مما جان سے کیا کہوں؟'' ظفریاب پریشانی سے بولے اجالا ہونٹ کاٹتی ہوئی جھینپی جھینپی سی شرمندہ لگ رہی تھی۔ فرقان احمد نے ایک نظر اجالا پر ڈالی ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر چٹکی بجائی۔

''چلو آئیڈیا آ گیا بس تم لوگ چپ رہنا میں فی الحال سنبھال لوں گا۔ مگر یار تم خالہ جان کو راضی کر کے جلدی نکاح کر لینا تاکہ اجالا کو بھی سکون مل جائے اور تم بھی مطمئن ہو جاؤ۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' ظفریاب نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

فرقان احمد نے حشمت آراء کو بتایا کہ اجالا اس کی کزن ہے جس کے والدین فوت ہو چکے ہیں اور وہ اب تنہا ہے اچھی شریف لڑکی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ آپ کے ساتھ رہ جائے اور آپ کی خدمت بھی کرے گی آپ کے ساتھ ساتھ رہے گی۔ حشمت آراء جو کہ ہمدرد اور شفیق خاتون تھیں اجالا کے حالات سن کر دکھی ہوگئیں اور اس کو گھر رہنے کی اجازت دے دی۔ چند دن میں اجالا نے اُن کی اتنی خدمتیں کیں اور اپنے حسن و سلوک سے ان کے دل میں گھر کر لیا وہ نماز کی پابند تھی صبح صبح تلاوت کلام پاک کرتی تو ماحول میں اُس کی خوش الحان آواز سے ایک جمود سا طاری ہو جاتا۔ پلان کے مطابق ایک روز فرقان احمد نے کہا۔

خالہ جان! اُجالا کا کوئی بھائی نہیں ہے میں ایک بھائی کی حیثیت سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ظفریاب کی رضامندی ہو تو آپ اجالا کو ظفریاب کی دلہن بنالیں۔'' حشمت آراء کو اجالا بہت پسند تھی انہیں بھلا کیا اعتراض ہوتا وہ جھٹ پٹ راضی ہوگئیں یوں ایک مشکل مرحلہ آسانی سے پایہ تکمیل تک پہنچ گیا اور ظفریاب اور اجالا کی شادی ہوگئی۔

گھر کے نوکر چاکر' بوڑھی ملازمہ سے لے کر ظفریاب تک' ہر کوئی اجالا کے حسن و سلوک سے متاثر تھے۔ اجالا نے محنت' جانفشانی اور سچی لگن سے گھریلو امور سنبھال لیے' نوکروں کے ہوتے'

ہوئے بھی وہ ظفریاب کے سارے کام خود کرتی حشمت آراء کی دوائی کا' ان کے کھانے پینے' سونے جاگنے اور ضروریات کا خیال رکھتی ان کی خدمتیں کرتی حشمت آراء اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتیں کہ ان کو اجالا جیسی خوبصورت اور نیک سیرت بہوملی ہے۔ الفت آراء کی طرف سے ملنے والے زخم کو وہ بالکل بھول چکی تھیں۔ ظفریاب کی دنیا بدل چکی تھی۔ اُجالا نے ان کی زندگی میں آ کر سارے اندھیرے دور کر دیے تھے۔ سچ میں اُن کی زندگی میں اجالا بکھیر دیا تھا۔ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر وہ مکمل طور پر اجالا کی محبتوں کے حصار میں تھے۔ بہت خوشگوار اور حسین زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس میں ہر طرف سکون' اطمینان' محبتیں اور خلوص تھا۔ ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے احساسات کا بھرم رکھنا ان کی زندگی کے اصولوں میں شامل تھا۔ جہاں آپس میں ایک دوسرے کے جذبات کا احساس کیا جائے ایک دوسرے کی خواہشات کا خیال رکھا جائے جس رشتے میں خلوص ایمانداری اور سچائی ہو وہاں سکون ہی سکون ہوتا ہے یہی سکون حشمت آراء' ظفریاب اور اجالا کی زندگیوں میں بھی تھا۔

اجالا کو یوں خیال کرتے دیکھ کر ظفریاب اُس کو سینے سے لگا لیتے۔

''اجالا تم نے آ کر سچ مچ میری زندگی میں اجالے بکھیر دیے ہیں۔ میری ماں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی جینا سکھا دیا ہے' میں کس طرح تمہاری محبتوں کا قرض اتاروں گا......؟ تم نے مجھے خرید لیا ہے جاناں......'' وہ جذب سے اجالا کے نرم و نازک وجود کو اپنے اندر سمو لیتے اور اجالا اُن کے چوڑے سینے میں منہ چھپا لیتی۔

''ظفریاب احسان مند تو میں ہوں کہ آپ نے مجھے نام' نام' مقام دیا' عزت دی...... اگر آپ میری زندگی میں نہ آتے تو میں ابھی تک نہیں......''

'بس چپ' ظفریاب اس کے نازک ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ کر مزید کچھ کہنے سے روک دیتے۔ اجالا بھیگی بھیگی آنکھوں سے انہیں پیار سے دیکھنے لگتی۔

دن گزرتے رہے حشمت آراء کی دلی خواہش تھی کہ اب ان کی گود میں ننھا منا کھلونا آ جانا چاہیے وہ بیمار بھی رہنے لگی تھیں۔ شادی کو سال ہو گیا تھا اور ابھی تک کوئی امید نظر نہیں آئی تھی۔ فرقان علی باہر سیٹل ہو گیا تھا اس کی شادی بھی وہیں (سعودی عرب) میں ہو چکی تھی۔ اپنے کام میں مصروف ہوتا اس سے بھی بات چیت کم کم ہوتی۔ اجالا کا دل بھی چاہتا کہ اس کی گود میں کوئی ننھا مہمان آ جائے۔

''ارے بھئی تمہیں کیوں جلدی ہے...... ہو جائے گا بچہ بھی...... ابھی تو میں زندگی انجوائے کرنا چاہتا ہوں تمہارے ساتھ...... صرف تم اور میں...... درمیان میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا...... فی الحال میں صرف میں...... تم پر اپنا بھرپور حق جمانا چاہتا ہوں۔ ابھی تو ساری زندگی پڑی ہے دیکھ لینا پھر پورے ایک درجن چھوٹے موٹے پیدا کروں گا۔'' اجالا کبھی کچھ کہتی تو ظفریاب اسے بانہوں میں سمیٹ کر جذبات سے چور لہجے میں کہتے ہوئے تھوڑا سا شرارتی انداز اختیار کر لیتے تو اجالا بری طرح جھینپ کر مسکرا دیتی۔

شادی کو دو سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ظفریاب نے اپنا کاروبار مزید وسیع کر لیا تھا۔ اس سے اُن

کی مصروفیت بھی بڑھ گئی تھی۔ اب زیادہ تر وقت باہر ہی گزرتا۔ کبھی میٹنگ، کبھی پارٹی اور کبھی کبھی شہر سے باہر بھی جانا پڑ جاتا۔ کام کی زیادتی سے تھکے تھکے سے رہنے لگے تھے۔ گھر میں ہوتے تو بھی زیادہ تر کال یا میسجز پر مصروف ہوتے اجالا مزید خیال رکھنے لگی تھی۔ کیوں کہ تھک کر آتے تو جھنجلاہٹ کا شکار رہتے۔ حشمت آراء نے بھی ان کی سرد مہری محسوس کی تو ان سے باز پرس کی۔

''مما جان! نیو کام اسٹارٹ کیا ہے، ٹائم تو دینا پڑے گا ناں۔ ولایت انکل بھی اب بوڑھے ہو گئے ہیں میں اُن پر زیادہ بوجھ نہیں ڈال سکتا۔ کچھ دن میں سیٹل ہو جاؤں گا آپ فکر مت کیا کریں۔'' ظفریاب نے کہا۔

''مگر چھ ماہ ہو گئے ہیں میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم گھر کے ساتھ ساتھ اجالا کے ساتھ بھی بہت دور رہنے لگے ہو بہت کم ٹائم دیتے ہو، بچی بے چاری کچھ کہتی نہیں مگر...... تمہیں اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔'' حشمت آراء کا لہجہ تھوڑا سا سخت ہو گیا تھا۔

''اوہ مما جان...... پلیز آپ کو میری مجبوری بھی سمجھنی چاہیے آپ لوگوں کو کیا پتہ کہ مجھے باہر کیا کیا فیس کرنا پڑتا ہے؟ میں ویسے بھی آج کل بہت پریشان ہوں مجھے مزید پریشان مت کریں دعا کریں میرے لیے۔'' ظفریاب نے جھنجلاتے ہوئے کہا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا حشمت آراء تاسف سے انہیں جاتا دیکھنے لگیں۔

گزشتہ چھ ماہ سے ظفریاب کے رویے کی واضح تبدیلی، سرد مہری اور اجالا کے ساتھ دلی وابستگی کی کمی کسی آنے والے خطرے کی گواہی دے رہی تھی۔ اجالا کا ننھا سا دل خوفزدہ رہنے لگا۔ وہ ظفریاب سے پوچھتی...... اُن کا سر یا پیر دبانے کی کوشش کرتی تو ظفریاب منع کر دیتے بس کاروباری ٹینشن کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ کبھی کبھی فرقان احمد کی کال آ جاتی اجالا کا دل چاہتا کہ فرقان احمد کو کہے کہ وہ ظفریاب سے پوچھیں ان سے پتہ کریں کہ ایسی کون سی اُلجھن ہے کون سی پریشانی ہے جس نے ظفریاب اور اجالا کے درمیان فاصلے پیدا کر دیے ہیں۔

اس روز چھٹی کا دن تھا خلافِ معمول آج ظفریاب گھر پر تھے رات کافی دیر سے لوٹے تھے اس لیے سو رہے تھے گھر کی کچھ ضروری چیزیں خریدنی تھیں۔ حشمت آراء کے لیے بھی ایک دو چیزیں لانی تھیں۔ اجالا نے کہا تھا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ جا کر لے آئے گی۔ سامان کی لسٹ بنا کر اجالا نے کمرے میں رکھی تب ہی ظفریاب نے کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول کر اجالا کو دیکھا۔

''مجھے مما جان کی دوائیں اور کچھ سامان لانا ہے میں بازار تک جا رہی ہوں ایک گھنٹے تک آ جاؤں گی۔'' اجالا نے انہیں جاگتا پا کر کہا۔

''ہنہ ٹھیک ہے مجھے جگانا مت میں خود اُٹھ جاؤں گا۔'' ظفریاب نے خمار آلود لہجے میں کہا اور کروٹ بدل کر چادر تان لی۔

''جی بہتر......'' اجالا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور چادر اوڑھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ حشمت آراء کے کمرے میں آئی اُن کو دوائیں وغیرہ دیں۔ باہر جانے کے لیے نکلی تب یاد آیا کہ کمرے میں سامان کی لسٹ بھول آئی۔

''اُفوہ!'' سر پر ہاتھ مار کر اپنے کمرے کی طرف آئی۔ دروازے پر آ کر یکلخت اس کے قدم رُک گئے۔ ظفریاب فون پر کسی سے بات کر رہے تھے یقیناً فرقان احمد سے بات ہو رہی

تھی۔

''ارے یار تجھ سے کوئی بات چھپی ہوئی تو نہیں ہے ناں! کن حالات میں وہ میری زندگی میں آئی ...... بے شک مجھے اچھی لگتی تھی۔ مگر مگر...... اُس نے تو بھری محفل میں مجھ سے ایسا سوال کر ڈالا...... میں بھی جذبات میں آ گیا...... اپنا بھرم بھی رکھنا تھا بہر حال شادی تو کر لی ہی ناں یار...... ہاہاہا...... پاگل سمجھا ہے کیا مجھے تم نے؟'' ویسے تو اللہ پاک بھی میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ اور سچ پوچھو تو میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ اجالا سے میری...... ظفریاب خان کی کوئی اولاد ہو...... نہ ...... نہ...... بالکل نہیں...... مجھے اندازہ ہو گیا یار وہ میرا ایک جذباتی فیصلہ تھا جس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ...... میرا پہلا پیار' الفت آراء دوبارہ میری زندگی میں آ گئی......وہ...... اپنے کیے پر شرمندہ بھی ہے اور دوبارہ سے میری دنیا میں آنا چاہتی ہے...... سچ ہے یار انسان اپنا پہلا پیار کبھی نہیں بھلاتا اس بات کا احساس ہم دونوں کو ہو گیا۔ میں بہت جلد الفت آراء سے شادی کرنے والا ہوں اولاد...... پھر ہماری اولاد ہوگی انشاء اللہ...... ہمارا اپنا خون ہوگا جس کا مجھے یقین ہے......''

''نہیں نہیں یار! چھوڑوں گا نہیں پڑی رہے گی وہ بھی گھر میں مما جان کو اس کی خدمتوں کی عادت ہو گئی ہے اس کے لیے یہی محبت ہے کہ اس کے نام کے ساتھ میرا نام جڑا ہو وہ میرے نام سے منسوب رہے اور کیا چاہیے اسے اور سب سے بڑی بات مما جان کو بھی میرے بچے کی خواہش ہے تو اس بات کو میں بنا کر میں دوسری شادی کر سکتا ہوں۔

کیسا بھیانک اور تلخ سچ تھا جو آج...... وہ ظفریاب کے منہ سے سن رہی تھی ایک ایک لفظ زہر بن کر اس کی رگ رگ میں اتر گیا تھا۔

تحقیر آمیز الفاظ کے نشتر اس کی روح کو تار تار کر چکے تھے وہ زخمی زخمی وجود لیے سر سے پاؤں تک پسینے میں نہائی دیوار کا سہارا لے کر بہ مشکل سنبھلی۔ ایک ایک لفظ تازیانے کی طرح روح میں شگاف ڈال گیا تھا۔ سبکی اور تحقیر کے احساس سے اس کا روم روم سلگ اٹھا تھا۔

یہ سب کیا تھا؟ اتنی ہتک' اتنی بے وقعتی......

اجالا نے تو ظفریاب پر خود سے زیادہ بھروسہ کیا تھا اور ظفریاب...... ظفریاب نے اُسے استعمال کیا' کتنے گھٹیا خیالات تھے اُس کے اس شریف انسان کے اندر شک اور غلاظت کے کتنے کیڑے پل رہے تھے۔ کتنی چھوٹی اور گندی سوچ تھی اس اعلیٰ اور نفیس انسان کی۔ اجالا کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بری طرح بکھر چکا تھا۔ اپنے ماضی کی ساری گندگی' غلاظت اور ناپاکی کو وہ دفن کر چکی تھی لیکن آج...... اسی انسان نے کتنی بے رحمی اور سفاکی سے اسے دوبارہ سے طعنے دے کر اسی غلاظت کے ڈھیر میں لا پھینکا تھا۔ سچ ہی تو کہا تھا ستارہ بائی نے' شیلا نے یہ مرد جب چاہے اُٹھا کر سینے سے لگا لیتے ہیں اور جب دل بھر جائے تو ٹشو پیپر کی طرح ہاتھ صاف کر کے پھینک دیتے ہیں۔ جب دل چاہے جسم پر سجاتے ہیں اور دل بھر جائے تو میلے کپڑے کی طرح اُتار کر گندگی میں پھینک دیتے ہیں۔ بہ مشکل اجالا نے اپنا لڑکھڑاتا وجود سنبھالا اور دبے پاؤں پلٹ کر باہر کی طرف آ گئی جہاں ڈرائیور منتظر کھڑا تھا۔

''ہاہاہا......'' اُف...... یہ کیسا انکشاف تھا

''اوہ خان جی [illegible] تو مما جان کے

کمرے میں بھول آئی آپ ذرا لادیں اُسے۔‘‘ اُس نے ہمت سے چہرے کو نارمل بناتے ہوئے خان بابا کو مخاطب کیا۔

’’اچھا بی بی آپ گاڑی میں بیٹھو ام ابھی پرچی لے کر آتا ہے۔‘‘ خان بابا نے کہا اور اندر کی جانب چل دیے۔ اجالا نے اپنے وجود کو چادر میں اچھی طرح سے چھپایا اور اور تیز تیز قدموں سے کھلے گیٹ کی طرف بڑھی باہر نکل کر تیزی سے پچھلی گلی کی جانب مڑی اور تقریباً بھاگتی ہوئی سنسان گلیاں پار کرتے ہوئے آگے نکلتی چلی گئی۔

اجالا کی آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔

کاش...... کاش...... ظفریاب آپ نے مجھے اس غلاظت سے نہ نکالا ہوتا...... مجھے وہیں پڑے رہنے دیتے۔ یوں مجھے بے وقعت تو نہ کرتے۔ آپ نے تو میری ذات کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔ سچ کہا تھا ستارہ بائی نے ہم جیسی عورتوں کے نصیب میں غلاظت کا ڈھیر ہی ہے...... آپ لوگ...... اور آپ جیسے بہت سے لوگ ہماری مجبوریوں سے صرف فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اپنی انا کی تسکین...... اپنے شوریدہ جذبوں کی تسکین کے لیے ہم کو ہماری معصومیت کو بھاری قیمتیں دے کر خرید لیتے ہیں۔ ہمارے لیے وہی مسکن ہے وہی ٹھکانہ ہے...... اجالا کے قدم ایک بار پھر ان ہی راستوں کی جانب اٹھ گئے تھے جہاں سے وہ یہ سوچ کر نکلی تھی کہ کبھی بھی یہاں کا رخ نہیں کرے گی مگر...... ایک بار پھر...... ایک بار پھر...... وہیں...... اسی جگہ اور...... اسی ٹھکانے پر موجود تھی۔ موبائل پر برابر ظفریاب کے میسج آرہے تھے۔ کال آرہی تھیں مگر...... اجالا اگنور کر کے اسی دہلیز تک واپس آگئی تھی۔ وہی ہال' وہی ماحول' وہی لوگ' سب کچھ وہی تھا۔ اور رونے کو بھی وہی کاندھا...... وہ شیلا کے کاندھے پر سر رکھ کر بری طرح بکھر گئی۔

’’محترم ظفریاب صاحب! میں آپ کی شریفانہ اور عزت دار زندگی سے دور...... بہت دور نکل آئی ہوں...... اب میرا ٹھکانہ کہاں ہے؟ اور میں کیا ہوں...... اس سے آپ کو واسطہ ہونا چاہیے اور نہ ہی ضرورت...... مجھے آپ نے جو عزت دی اور آج جو عزت افزائی کی یہ ساری زندگی کے لیے بہترین سبق کی صورت میں ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہے گا۔ آپ بھی عام مردوں کی طرح کم ظرف نکلے...... مگر میں...... میں لاکھ غلاظت کا ڈھیر سہی' گندگی کی پوٹلی صحیح لیکن...... میرے اندر بھی احساسات ہیں جذبات ہیں...... اور میں اپنے معصوم احساسات کو یوں بے آبرو ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں عورت ہوں...... آپ نے مجھے عورت بننے کا حق ضرور دیا مگر...... 'نامکمل عورت' کیوں کہ آپ اعلیٰ نسل اور شریف خاندانی لوگ ہیں۔ اس لیے میں آپ کی زندگی سے نکل آئی آپ کو اپنی زندگی مبارک مجھے ڈھونڈنے کی کوشش بھی مت کیجیے گا۔‘‘ میسج کر کے اجالا نے موبائل سے سم نکال کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دی۔

دل تھا کہ بھر چلا آرہا تھا۔ درد حد سے زیادہ بڑھا تو درد دل کو سنبھالتے سنبھالتے خود پر قابو پاتے پاتے وہ چکرا کر ستارہ بائی کی گود میں گر پڑی اسے ہوش نہ رہا۔ اجالا میں اب بھی وہی کشش تھی۔ وہی نزاکت اور ساحرانہ انداز گزشتہ تین سالوں نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا تھا وہ آج بھی لاکھوں دلوں کی دھڑکن بننے کے قابل تھی۔ ستارہ بائی جو اس سے ناراض بھی تھی مگر اس سے پیار بھی کرتی تھی اس نے اجالا کو سنبھالا دیا۔

اُدھر حشمت آراء کو سنبھالنا بھی آسان نہ تھا۔ ظفریاب نے ایسا تو نہ چاہا تھا۔ اُس کا تو اجالا کو بھی رکھنے کا ارادہ تھا اور اولاد کو Base بنا کر شادی کرلی تھی۔ جب حشمت آراء کو ظفریاب نے بتایا کہ اجالا کو کسی نے اغواء کرلیا ہے تو حشمت آراء نے اتنا اثر لیا کہ اُن کو دل کا دورہ پڑ گیا اور وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ ظفریاب کو اجالا سے جدائی کا اتنا ملال تھا نہ دکھ...... مگر ماں کی جدائی اور اچانک موت نے اُن کو بالکل توڑ کر رکھ دیا ایسے وقت میں الفت آراء نے اُن کا بہت ساتھ دیا۔ سطوت آراء کا بھی انتقال ہوچکا تھا الفت بھی شوہر سے طلاق لے کر آگئی تھی۔ اُدھر الفت اکیلی تھی اِدھر ظفریاب اور دونوں کے اندر برسوں پرانی محبت کے جراثیم بھی موجود تھے۔ حشمت آراء کے چہلم کے بعد ظفریاب نے الفت آراء سے نکاح کرلیا۔ شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی الفت آراء نے خوشخبری بھی سنادی ظفریاب بہت خوش تھے۔ اُلفت آراء کو پورے نو ماہ ظفریاب نے ہاتھوں ہاتھ رکھا کہ وہ وارث پیدا کرنے جارہی ہے۔ آنے والا بچہ خاندانی تھا دونوں جانب سے ایک ہی خون تھا۔ الفت کی ڈلیوری کا وقت قریب آیا تو ظفریاب اس کو دیکھ کر بے چین ہوگئے۔ الفت کی تکلیف پر وہ تڑپ جاتے۔ الفت آپریشن تھیٹر میں تھی اور باہر ظفریاب مضطرب اور بے قرار ٹہل رہے تھے۔ الفت کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ڈاکٹرز پریشان تھے۔

''ڈاکٹر پلیز آپ الفت کو بچانے کی کوشش کریں مجھے اُن کی زندگی عزیز ہے۔'' ظفریاب تڑپ کر ڈاکٹر کے قریب آئے تھے۔

''دعا کریں جناب!'' ڈاکٹر کہہ کر دوبارہ اندر جاچکی تھیں۔ ظفریاب کی دعائیں قبولیت کا درجہ نہ پاسکیں۔ اُن کے نصیب میں اس وقت نہ اولاد تھی نہ ہی آگے الفت کا ساتھ...... جب ڈاکٹر نے آکر یہ روح فرسا خبر سنائی کہ......

''سوری مسٹر ظفریاب ہم نے اپنی ہی ساری کوششیں کرلی لیکن...... اللہ کو یہی منظور تھا آپ کا بیٹا اور آپ کی وائف دونوں ہی......''

''نہیں ...... نہیں ڈاکٹر ایسا مت کہیں ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ ابھی تو الفت میری زندگی میں آئی ...... یوں ...... ایک بار پھر ...... پھر مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ مجھے بار بار کیوں چھوڑ جاتی ہے؟ کیوں مجھے ...... آزماتی ہے ...... کیوں ...... کیوں......'' ظفریاب دونوں مٹھیوں میں اپنے بال جکڑتے ہوئے ہوش وخرد سے بیگانہ ہوتے چلے گئے۔

ہوش آیا تو سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ ایک بار پھر وہ خالی ہاتھ اور خالی دامن رہ گئے تھے۔ فرقان احمد بھی آئے ہوئے تھے دکھ میں فرقان احمد کے کاندھے پر سر رکھ کر بے تحاشا آنسو بہا ڈالے۔

''یہ سب کیا ہورہا ہے میرے ساتھ فرقان؟ ابھی تو الفت کو جی بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا میں نے ...... ابھی تو ہم نے زندگی شروع کی تھی۔ ہمیں تو ساتھ ساتھ مل کر بہت دور تلک جانا تھا۔ اتنے بڑے سے گھر میں ہمیں اپنے بچوں کو لے کر ڈھیر ساری خوشیاں منانی تھیں۔ سب کچھ ...... سب کچھ ختم ہوگیا۔ سب کچھ ختم ہوگیا۔'' ظفریاب بچوں کی طرح بلک رہے تھے ایک بار پھر وہ ٹوٹ گئے۔ اس بار بھی الفت نے اُن کو بیزار کردیا تھا۔ زندگی سے بیزار...... نوکر ظفریاب کا حال دیکھ کر روتے رہتے۔ فرقان احمد کو واپس چلے جانا تھا وہ کچھ دنوں کے لیے آئے تھے مگر ظفریاب کی حالت دیکھتے ہوئے وہ زیادہ دن پاکستان میں

رُک گئے تقریباً 2 ماہ بعد ظفریاب کچھ سنبھلے اور پھر سے کاروبار میں اور زندگی میں کچھ دلچسپی لینا شروع کی۔ دن ماہ و سال گزرتے رہے گزشتہ اٹھارہ انیس سال میں ظفریاب نے الفت کے بعد ایک نکاح اور کیا وہ آفس میں کام کرنے والی زویا تھی جس کی باتوں میں آ کر ظفریاب نے اس سے نکاح کر لیا وہ ایک غریب فیملی کی لڑکی تھی خوب صورت کم عمر تھی' جاذب نظر اور دلکش جو دیکھتا تو دوسری بار نظر اُٹھا کر ضرور دیکھتا، نہ جانے اُس نے ظفریاب کو کیا پٹیاں پڑھائیں کہ ظفریاب نے اس سے شادی کر لی اور وہ چھوٹے سے گھر کی غریب لڑکی جب اتنے بڑے گھر میں آئی۔ نوکر چاکر' گاڑی' روپیہ پیسہ دیکھا تو اس کے تو لچھن ہی بدل گئے وہ آزاد ہوگئی بے ہودہ کپڑے پہننا' دوستوں کو جمع کرنا' پکنک پارٹیاں کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ اُسے ظفریاب کے پیسوں سے پیار تھا ظفریاب سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ دونوں ہاتھوں سے پیسہ لٹانے لگی۔ شادی کے چار پانچ ماہ میں اس نے بے حساب پیسہ اڑا دیا۔ ظفریاب اُسے کچھ نہ کہتے اتنا پیسہ تھا سب کچھ اسی کا تھا اور تھا ہی کون بس اُس کو انتظار تھا کہ اللہ پاک اولاد دے دے۔ اس روز ظفریاب شام کو گھر آئے اتفاق سے زویا گھر پر ملی ورنہ وہ تو کہیں نہ کہیں گئی ہوئی ہوتی۔ ماسی نے بتایا کہ بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ ہاسپٹل سے ہو کر آئی ہیں۔''

''ارے کیا ہوا؟ خیریت ہے ناں...... کہاں گئی تھیں؟ مجھے کال کر دیتیں میں آ جاتا......'' ظفریاب پریشان ہوگئے اور کمرے میں آ کر زویا کو دیکھ کر بے شمار سوالات کر ڈالے...... زویا برا سامنہ بنا کر لیٹی ہوئی تھی۔

''بخار ہے کیا؟'' ظفریاب نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اُس نے بری طرح سے ہاتھ جھٹک دیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' ظفریاب نے اس کی حرکت پر حیرانی سے اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''ہونا کیا ہے؟ میں...... میں...... ماں بننے والی ہوں۔'' انتہائی بدتمیزی سے جواب دیا لہجے میں بیزاری نمایاں تھی۔

''ارے واہ...... گڈ...... بہت اچھی خبر ہے یہ تو...... اس میں غصے والی کون سی بات ہے؟'' ظفریاب کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا انہوں نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

''ظفریاب آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے ناں؟ یہاں میری جان پر بن گئی اور آپ کو اتنی خوشی ہو رہی ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو زویا؟ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے اللہ پاک نے ہمیں یہ خوشخبری دی ہے اور تمہیں جان پر کیوں بن رہی ہے۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔''

''چپ کریں ظفریاب! میں یہاں آپ کے بچے پیدا کرنے نہیں آئی ہوں...... میں یہاں اچھی زندگی گزارنے آئی ہوں...... اپنی مرضی کی زندگی...... ایسی زندگی جس کو میں ترستی تھی...... بچے پیدا کرنے تھے تو آپ کسی عورت سے شادی کر لیتے...... ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟ ساری زندگی پڑی ہے ان کاموں کے لیے...... ابھی مجھے صرف زندگی انجوائے کرنی ہے اتنی جلدی...... اتنی جلدی میں یہ فضول بکھیڑوں میں نہیں پڑنے والی میں تو آج ہی اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیتی مگر ڈاکٹر نے کل بلوایا ہے اس لیے کل صبح جا کر میں یہ جھنجٹ ختم کروا رہی ہوں۔''

زویا کی بات پر ظفریاب نے آنکھیں پھاڑ کر اس کو دیکھا۔

کیسی فضول باتیں کر رہی تھی وہ..... اتنی چھوٹی اور نیچ سوچ تھی اُس کی..... وہ ایک نعمت کو 'مصیبت' کہہ رہی تھی۔

''زویا تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ اللہ کی نعمت سے منہ پھیرنا اور ایک جیتی جاگتی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے۔ میں تمہیں کسی صورت اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا اپنے سامنے تمہیں اس قتل کی اجازت نہیں دے سکتا جو بھی ہوا اللہ کی رضا سمجھ کر شکر ادا کرو اور اپنے ذہن سے یہ فضول بات نکال کر اپنا خیال رکھو۔ آئی سمجھ.....؟''

''مسٹر ظفریاب! میں آپ سے اجازت نہیں لے رہی ہوں آپ کو اپنا فیصلہ سنا رہی ہوں۔'' زویا تیزی سے اٹھی بدتمیزی سے کہتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔ ظفریاب منہ پھاڑے اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھتے رہ گئے۔

ظفریاب نے صبح آفس جاتے جاتے ایک بار پھر اُسے پیار سے سمجھایا وہ چپ چاپ رہی کوئی جواب نہ دیا ظفریاب آفس چلے گئے اُن کے خیال میں زویا کا جواب نہ دینا اس بات کی دلیل تھی کہ اس کی سمجھ میں اُن کی بات آگئی ہے اور وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔

لیکن یہ ظفریاب کی محض خام خیالی تھی کیونکہ وہ تو دل میں تہیہ کر کے بیٹھی تھی اور ہر حال میں پورا کرنا چاہتی تھی۔ اس روز ظفریاب نے آفس سے اُسے کال بھی کی مگر زویا نے کال ریسیو نہیں کی نہ میسجز کا جواب دیا۔ دوپہر کو ظفریاب گھر آگئے یہی سوچ کر کہ جا کر زویا کو منالیں گے اس کو لے کر باہر چلے جائیں گے گھما پھرا کر اس کو شاپنگ کروا کر اس کا موڈ ٹھیک کر دیں گے۔ وہ چھوٹی بھی ہے پریشان ہو رہی ہو گی۔ دل میں سوچتے ہوئے وہ گھر آئے گھر آ کر پتہ چلا کہ زویا ہاسپٹل گئی ہوئی ہے۔ وہ بھی ہاسپٹل پہنچے وہاں جا کر پتہ چلا کہ زویا نے ظفریاب کی مرضی کے خلاف جا کر اپنی مرضی اور خواہش سے اپنا ابارشن کروا لیا ہے۔

''یہ..... یہ تم نے کیا کیا زویا..... میں نے منع بھی کیا تھا؟ تم ضدی ہی نہیں ظالم اور قاتل ہو..... میری اجازت کے بنا اتنا بڑا قدم اٹھالیا..... میں تم کو کبھی معاف نہیں کروں گا؟ تم نے بہت غلط کیا ہے زویا..... بہت غلط..... میرے ساتھ بھی ظلم کیا اور..... اور..... ایک معصوم کے ساتھ بھی۔'' ظفریاب غصے سے پاگل ہو کر پہلی بار اتنی زور سے چلائے تھے۔

''آہستہ بولیں ظفریاب یہ آپ کا بیڈ روم نہیں ہے اور نہ میں آپ کی زرخرید ہوں۔ اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ جو چاہوں گی کروں گی..... مجھے بچے پسند نہیں تو نہیں..... نہ ابھی اور نہ آئندہ کبھی..... آپ کو بچے ہی پیدا کروانے ہیں تو مجھے طلاق دے کر کسی عورت سے شادی کر لیں 'آزاد' کر دیں مجھے ان پابندیوں سے مجھے میرے مہر کی رقم دے کر فارغ کر دیں۔''

''اُف خدایا! ظفریاب نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ زویا نے کیسی چال چلی تھی اس لیے مہر میں اتنی بڑی رقم کی ڈیمانڈ کی تھی۔ ظفریاب کا سر گھوم گیا۔ تقدیر اُن کے ساتھ یہ کیسے مذاق کر رہی تھی۔ زویا بھی اُن کی زندگی سے نکل گئی۔ ایک بار پھر تنہائی اُن کا مقدر بن گئی۔

دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ اب ان تنہائیوں کے عادی ہو چکے تھے ولایت صاحب

بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ اُن کی موت پر بھی ظفریاب بری طرح بکھر گئے تھے وہ اُن کے لیے باپ کی طرح تھے۔ پرانے نوکر تھے بڑا سا گھر...... جس میں ہر وقت ویرانی اور اُداسی کا ڈیرہ رہتا۔ مسلسل عذاب تنہائی نے ظفریاب کی صحت پر بھی بری طرح اثر ڈالا تھا۔ وہ کمزور ہوگئے تھے۔ اندر سے ٹوٹ چکے تھے۔ خوشیوں نے اُن سے منہ موڑ لیا تھا۔ لاکھوں کی جائیداد بڑا سا گھر بینک بیلنس اور آسائشات وہ سب بے معنی ہوکر رہ گئے تھے کبھی کبھی اُن کا دل چاہتا کہ وہ غریب ہو جائیں مگر اُن کی زندگی میں سکون آ جائے۔ اُن کی بے چینیوں کو چین مل جائے اُن کی بے قراریوں کو قرار نصیب ہو جائے۔ گھر میں ہوتے تو پاگلوں کی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکر لگاتے رہتے۔ دردِ دل حد سے سوا ہو جاتا تو گاڑی لے کر سڑکوں پر نکل آتے۔

نہ جانے کیوں برسہا برس بعد دل میں اجالا کا خیال آیا تو آتا ہی چلا گیا۔ اضطرابی کیفیت طاری ہوئی وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے اجالا...... جو سب سے منفرد تھی...... معصوم اور سیدھی سادی ظفریاب کے اشاروں کی منتظر...... کبھی اپنی مرضی نہ چلائی...... کبھی غصہ...... ضد اور بحث نہ کی...... کتنی الگ تھی وہ...... صرف اور صرف تحفظ مانگا تھا...... چار دیواری اور عزت کی طالب تھی وہ...... محبت کی بھوکی...... بے ضرر اور معصوم...... خدمت گزار ادب کرنے والی رشتوں کا تقدس کرنے والی...... شام کے سائے دھیرے دھیرے پھیل رہے تھے اجالا کا خیال آیا تو ظفریاب کا دل بوجھل ہوگیا۔ عجیب سی بے قراری نے آن گھیرا...... دل تھا کہ بیٹھا جا رہا تھا...... خود پہ کنٹرول پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہونے لگا......

''آج...... آج برسہا برس بعد ایک بار پھر اُن کے قدم انہی راہوں کی طرف اُٹھ گئے۔ نہ جانے کون سی تڑپ تھی۔ کیا جستجو تھی جو انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ برسوں پہلے وہ اس دہلیز سے یہ سوچ کر نکلے تھے کہ کبھی یہاں نہیں آئیں گے مگر...... ایک بار پھر وہ...... اُن تماش بینوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ جہاں بیٹھ کر اُن کو اجالا کا دیدار نصیب ہوتا تھا۔ مگر آج...... کتنی سونی محفل تھی سب کچھ اسی طرح تھا۔ ستارہ بائی نے بڑی طنزیہ اور جاندار مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا منہ سے کچھ نہ بولی تھیں۔ ظفریاب نے نگاہیں جھکا لیں......

دل چاہا کہ ستارہ بائی سے پوچھیں اجالا کے بارے میں معلوم کریں مگر...... وہ کہہ نہ سکے۔ دل تھا کہ کسی صورت سنبھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کچھ دیر میں ہی اُن کو اکتاہٹ ہونے لگی۔ قبل اس کے کہ وہ اٹھتے اور باہر کی سمت نکلتے' اُن کی سماعتوں میں مانوس آواز ابھری۔ قدم زمین نے جکڑ لیے، سامنے نظر اٹھی...... آنکھیں خوف کی حد تک پھیل گئیں......

ہو بہو اجالا...... اجالا کی تصویر سامنے کھڑی تھی برسہا برس پہلے کا منظر ان کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

اجالا...... بھی اسی جگہ...... یہیں پر کھڑی تھی۔

آج...... آج...... اسی جگہ...... اجالا کی کاپی......

وہی نین نقش...... وہی جسامت...... وہی انداز...... وہی دلکشی اور معصومیت......

''یہ...... یہ کون ہے؟'' وہ پاگلوں کی طرح لڑکی کی سمت بڑھے......

''یہ...... یہ روشنی ہے صاحب! اجالا کی روشنی......'' مانوس میٹھی آواز کانوں سے ٹکرائی تو ظفریاب نے آواز کی جانب نگاہیں اٹھائیں۔

''یہ ...... یہ ...... تمہاری ...... مطلب ......؟''
ظفریاب کی کیفیت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی بے ربط جملے ادا ہو رہے تھے۔

''ہاہاہاہا ...... جناب ظفریاب صاحب یہ ...... یہ ...... ایک نواب صاحب کی بیٹی ہے اور اس کی ماں مطلب اس ناچیز نے ایک بار ہی شادی کی تھی کیسے بات کچھ شریفانہ دماغ میں آئی کہ نہیں۔'' اجالا نے زہر خند لہجے میں کہا ظفریاب آنکھیں پھاڑے کبھی اجالا کو اور کبھی روشنی کو دیکھ رہے تھے۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں ظفریاب صاحب ...... یہ معاشرہ آپ جیسے شریف لوگوں نے ہی بنایا ہے۔ یہاں کے اصول وضوابط' طور طریقے ...... یہاں پر صرف مرد ہی شطرنج کھیل سکتے ہیں چالیں چلنے کا ہنر ہم جیسی خواتین کو بھی آتا ہے ...... جو آپ جیسے مردوں کی عنایات ہمیں سکھاتی ہے۔ عورت کی کمزوری پر آپ لوگ نظر رکھتے ہیں مگر شاید یہ نہیں جانتے کہ کمزور ناتواں اور معصوم عورت جب انتقام لینے پر آتی ہے ناں تو ...... زہریلی ناگن بن جاتی ہے ...... بڑے بڑے شرفاؤں کے چھکے چھڑا دیتی ہے ...... اور یہ قدرت کا انتقام ہی تو ہے کہ وہ غلیظ عورت' گندے ماحول کی رہنے والی گندے خون والی عورت جس سے آپ اپنا بچہ پیدا کروانا توہین سمجھتے تھے آج ...... وہی عورت آپ کی بیٹی کی ماں بنی آپ کے سامنے کھڑی ہے اور آپ ...... آج ...... بھی ناشاد ہیں۔ گوکہ میں نے شاید یہ غلط کیا کہ واپس یہاں آئی اور اپنی بچی یہاں پر جنم دی لیکن ...... مجھے آپ کو سبق سکھانا تھا ...... آپ جیسے بے شمار مردوں کو ...... آپ آج بھی اکیلے ہیں ظفریاب صاحب ...... اب آپ مجھے جواب دیں کہ آپ کو اپنی بیٹی کو ...... اپنے شریف خاندان کے شریف خون کو اس ماحول میں ...... گندے اور غلاظت کے ڈھیر میں دیکھ کر کیسا محسوس ہو رہا ہے؟ ہم جیسے لوگ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔ کبھی ہمارے اندر جھانک کر کیوں نہیں دیکھا جاتا ...... ہمارے جسموں سے ہی پیار کیوں کیا جاتا ہے؟ ہمارے حسن پر بھی کیوں پیسے لٹائے جاتے ہیں۔ کبھی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کوئی بھی جان بوجھ کر گندگی کا انتخاب نہیں کرتا ...... کسی کا دل نہیں چاہتا کہ وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں اپنی زندگی گزارے ...... ریت' رسم و رواج بناتے وقت آپ لوگ اس بات کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہم یہاں پر اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوتے ...... ہمیں بیچا جاتا ہے ...... ہمیں اغوا کیا جاتا ہے ...... ہماری مجبوریوں کو ...... ہماری بے بسی کو ڈھال بنایا جاتا ہے ...... میں تو آپ کی نظر میں گندا خون تھی ...... غلیظ تھی مگر ...... مگر ...... یہ ...... روشنی تو آپ کا اپنا خون ہے ناں کیا آپ اس کی رگوں میں دوڑنے والے اپنے خاندانی اور شریف خون کو کوئی تحفظ ...... کوئی رشتہ ...... کوئی نام دے سکتے ہیں ...... یا ...... اس کو بھی اسی گندے ماحول میں چھوڑ دیں گے۔

ظفریاب خان صاحب آپ جیسے ہزاروں مرد صرف اور صرف اپنے عیش کے لیے ...... اپنی تسکین کے لیے ہم جیسی معصوم عورتوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ اُن کے جذبات کی توہین کرتے ہیں' انہیں وہ مقام' وہ تحفظ' وہ رشتہ نہیں دیتے جن کی خواہش ان کو بھی ہوتی ہے۔ اب بتائیں کہ روشنی کو بھی کسی ظفریاب جیسے امیر آدمی کے لیے چھوڑنا گوارا کریں گے جو آپ کے ...... آپ کے شریف خون کو گندی اور غلیظ گالی دے ...... میں نے شاید غلط کیا ...... ایک ماں

ہو کر...... میرا قدم شاید غلط ہو لیکن...... روشنی کی پرورش یہاں کرنے کا مقصد آپ کی آنکھیں کھولنا تھا...... جب آپ جیسے مردوں کی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ ایسا کچھ ہوگا تب آپ لوگوں کو احساس ہوگا۔

ظفریاب جو پہلے ہی اس عجیب وغریب اور غیر یقینی صورتحال سے سراسیمہ تھے۔ اجالا کی باتوں نے ان کے ضمیر کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا...... اجالا کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ نے ظفریاب کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ تو پہلے ہی احساسِ ندامت سے چور چور سرتاپا لرز رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قدرت نے آج اُن کو کیسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔

''جواب دیجیے سرکار...... آپ کے دائیں اور بائیں جو طوائفیں کھڑی ہیں ایک آپ کی بیوی ہے اور دوسری آپ کی بیٹی ہے...... جس کی رگوں میں آپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس کا مستقبل کیا ہے؟ کیا اس کو تحفظ ملے گا؟''

''بس کرو اجالا...... خدا کے لیے چپ ہو جاؤ...... میں بہت نادم ہوں...... بہت شرمسار ہوں...... سچ تو یہ ہے کہ تم لوگوں کو اس مقام پر لانے والے ہم جیسے ہی مرد ہیں...... اگر ہم ہمت کر کے تم لوگوں کو تحفظ دیں تو نہ کوٹھے آباد ہوں گے نا گندگی کے ڈھیر لگیں گے......''

''میں نام دوں گا...... اپنی بیٹی کو...... اس تمام زیادتیوں کی معافی مانگتا ہوں...... میں آج...... ہاتھ جوڑ کر...... تم لوگوں کو یہاں سے لے جاؤں گا...... ماضی میں جو غلطی کی ہے...... وہ وقت تو نہیں لوٹا سکتا...... لیکن...... لیکن اب ان غلطیوں کی تلافی ضرور کرنا چاہوں گا۔''

''اس بار آپ کیا قیمت ادا کریں گے سرکار؟ سودا بہت بڑا ہے کیونکہ اس میں شریف خون شامل ہے۔'' اجالا نے تلخی سے سوال کیا۔

''اس بار...... اس بار میں قیمت ادا کر کے اس پاک رشتے کی توہین نہیں کروں گا...... اس مقدس رشتے کو پامال نہیں کروں گا...... یہ رشتہ روپے پیسے اور خاندانی حیثیت سے تولہ جانے والا نہیں ہے اجالا...... مجھے معلوم ہے کہ اس وقت بھی تم لوگ میری باتوں کو دیوانے کی بڑ سمجھ رہے ہو گے...... آج...... میں اپنی سچائی کا یقین دلانے کے لیے اپنی جان دے سکتا ہوں...... اور میرے خون سے بڑھ کر اس رشتے کی پاکیزگی کی گواہی کیا ہوگی......'' یہ کہہ کر ظفریاب نے جیب سے پستول نکالی اور اپنی کنپٹی پر رکھ لی۔ اس سے پہلے کہ ان کی انگلی ٹریگر پر اپنی گرفت سخت کرتی شیلا بائی تیزی سے آگے بڑھی اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ان کے ہاتھ کو زور سے دھکا دے دیا۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری...... ظفریاب دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر سسکتے ہوئے زمین پر بیٹھتے چلے گئے کچھ دیر بعد ظفریاب اجالا اور روشنی کو دائیں بائیں اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ آج اجالا کے چہرے پر پُرسکون مسکراہٹ تھی۔ روشنی کے لیے یہ سب کچھ نیا نیا اور انوکھا تھا۔

ظفریاب کے چہرے پر آج مدتوں بعد سکون دکھائی دے رہا تھا۔ بے چینی' بے قراری ختم ہو چکی تھی۔ آج وہ برسہا برس بعد خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔ اللہ پاک نے اُن کو ایک موقع فراہم کیا تھا نئی زندگی' نئے حوصلے اور امنگ کے ساتھ مطمئن انداز میں گاڑی کی سمت بڑھتے آج سے نئی زندگی کی شروع کرنے جا رہے تھے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

نفیسہ سعید

دیوانگیٔ عشق

> بس آپا فی الحال آپ اماں کو منع کر دیں مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" اس نے اپنی بہن کی بات سنتے ہی سختی سے جواب دیا۔ "دیکھو سجاول بنا دیکھے جانے تم ایک انجان لڑکی کے لیے اتنا اچھا رشتہ چھوڑ رہے ہو چاچا فیضی کے گھر پہلے ہی دو رشتے.....

فردوس میرے بھائی کے سارے بچوں میں سب سے خوبصورت ہے۔ فردوس کی قابلیت پر ہمارا سارا خاندان رشک کرتا ہے فردوس اس قدر نیک ہے کہ اللہ سب کو ایسی ہی اولاد عطا کرے۔ یہ تھا وہ فردوس نامہ جو پچھلے کئی ماہ سے سجاول سن رہا تھا۔

وہ اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد تقریباً ایک سال قبل اپنی ملازمت کی خاطر اس شہر میں منتقل ہوا تھا جبکہ اُس کے والدین یہاں سے کافی دور ایک چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے۔ جو کسی زمانہ میں دیہات تھا مگر وقت کے ساتھ ترقی کر کے اب ایک چھوٹے سے شہر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہاں کی محدود زندگی سے ایک دم ایک بڑے شہر کی تیز رفتار زندگی کا حصہ بننا' شروع شروع میں تو کافی مشکل لگا لیکن اب وہ کافی حد تک اس کا عادی ہو چکا تھا۔

قسمت اچھی تھی جو اُسے اماں جی کی کمپنی نصیب ہو گئی جب وہ یہاں آیا تھا تو شروع شروع میں اُسے رہائش کا خاصہ مسئلہ ہوا تھا پھر کسی دوست کے توسط سے اُسے اماں جی کی چھت پر بنے اِک کمرے میں جگہ مل گئی۔ جس کا نہ صرف کرایہ بے حد مناسب تھا سب سے بڑی بات یہ کہ وہاں اس کے معاملات میں دخل اندازی کرنے والا بھی کوئی نہ تھا کیونکہ اماں جی اس گھر کی واحد مالک تھیں جو کہ نیچے والے پورشن میں رہتی اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی صرف دو بیٹیاں تھیں ایک شادی کے بعد عمان چلی گئی تھی جبکہ دوسری اسی شہر میں رہتی تھی۔ جس کا نام کلثوم تھا اور سجاول انہیں آپا کلثوم کہا کرتا' وہ ہر ہفتے اپنی اماں کے گھر آتیں ماسی کے ساتھ مل کر سارے گھر کی صفائی کرواتیں' کپڑے دھلائی ہوتے' ایک ہفتہ کا کھانا بنا کر فریز کر دیا جاتا بے شک وہ اماں جی کھاتیں یا اُن کی ملازمہ کے پیٹ کی خوراک بنتا مگر کلثوم آپا اپنا فرض ضرور پورا کرتیں ہفتہ کی رات وہ اماں کے ساتھ گزار کر اتوار کی شام واپس جاتیں اور اس دن دو وقت کا کھانا سجاول کو بھی وہیں سے ہی ملتا کیونکہ آپا کلثوم کا رویہ اس سے بالکل اپنے بھائیوں جیسا تھا۔

یہ ہی وجہ تھی کہ ہفتہ کے باقی پانچ دن وہ بھی ایک بیٹے کی طرح اماں جی کا خیال رکھتا صبح میں ملازمہ آ کر اُن کا سارا کام کر جاتی۔ وہ پہر کا کھانا بھی گرم کر کے

انہیں کھلا دیتی جبکہ رات گھر واپسی پر سجاول جو خود کھاتا وہ نیچے انہیں بھی دے آتا بدلے میں اماں جی نہ صرف اُسے ڈھیروں دعائیں دیتیں بلکہ آپا کلثوم کی آمد پر مزیدار کھانے میں حصہ دار بھی بنا لیتیں سجاول بھی مطمئن تھا کیونکہ اُسے یہاں گھر جیسا ماحول ملا ہوا تھا آپا کلثوم کے علاوہ سجاول نے اپنی موجودگی میں کبھی کسی رشتہ دار کو نیچے آتے جاتے نہ دیکھا تھا مگر اب جانے کیوں پچھلے کچھ ماہ سے اماں جی کو فردوس کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ فردوس غالباً اُن کے سب سے چھوٹے بھائی کی بیٹی تھی جو کسی دور دراز شہر میں رہتی تھی اور جس نے آج کل اماں جی کی سوچوں پر مکمل قبضہ جما رکھا تھا۔

ایسی ہی رات گھر آتے ہوئے جب اُس نے اپنے دوست کے ساتھ ایک کیفے میں بیٹھ کر بریانی کھائی تو اماں کے لیے بھی پیک کروالی اور اب جو انہیں دینے گیا تو وہ ایک بار پھر فردوس کا ذکر لے بیٹھیں آج کل تو ویسے بھی سجاول کو اُن کی زبانی فردوس نامہ سننا بہت اچھا لگتا حالانکہ وہ نہ جانتا تھا کہ فردوس کون ہے؟ سوائے اُس کے جو اماں جی نے اُسے بتایا بھی سجاول کی ازلی شرافت نے اُسے اجازت نہ دی کہ وہ اس کے بارے میں مزید کوئی سوال کرتا بس جو وہ کہتیں نہایت دلچسپی سے سنے جاتا جیسے ابھی بھی بریانی کا پہلا چمچ منہ میں ڈالتے ہی اماں کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''فردوس کھانا پکانے میں بہت ماہر ہے تمہارے آنے سے کچھ عرصہ پہلے اپنے کسی کام کے سلسلے میں

اُس کا یہاں آنا ہوا تھا تو اُسے نے مجھے بہت مزے مزے کے کھانے خود اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلائے مانو بہت ذائقہ ہے اُس کے ہاتھ میں......''

''فردوس کی شادی ہوگئی اماں جی؟'' ایسے ہی جھجکتے ہوئے سجاول نے پہلی بار آج فردوس کے متعلق ایک سوال پوچھ لیا۔

''ارے ابھی کہاں' ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے؟ ابھی تو پڑھائی مکمل کی ہے پھر اللہ خیر کرے نوکری مل جائے تو ماں باپ شادی کا سوچیں۔''

''کیا پڑھا ہے فردوس نے؟'' ایک دفعہ جھجک ختم ہوئی تو دوسرا سوال خود بخود لبوں پر آ گیا۔

''انجینئر ہے ماشاء اللہ اور اپنی ساری پڑھائی ہوسٹل میں رہ کر مکمل کی ہے یہی وجہ ہے جو ہوسٹل کی زندگی نے اُسے ہر کام میں طاق کر دیا۔''

اُن کے حواسوں پر فردوس پھر سے سوار ہوگئی اور پھر جب تک سجاول وہاں رہا فردوس کے متعلق اماں جی کا تبصرہ سن کر خود ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔

☆......☆......☆

وہ لڑکی تھی یا کوئی پری' گولڈن لمبے کھلے بال اور نیلی آنکھوں کے ساتھ وہ سجاول کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اماں جی بالکل سچ کہتی تھیں فردوس واقعی میں بہت خوبصورت تھی اس سے قبل کہ سجاول آگے بڑھ کر اُسے چھوتا کہ اچانک تیز تکلیف کے احساس سے اس کی آنکھ کھل گئی بے خیالی میں اُس کا سر بیڈ کے کونے سے لگ گیا تھا وہ اپنا سر تھامتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی کا گلاس بڑھ کر غٹاغٹ پی گیا جانے اماں جی کی باتوں میں ایسا کیا جادو تھا جو سجاول کو چلتے پھرتے سوتے جاگتے ہر طرف فردوس ہی دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ سیدھا سادا نوجوان تھا جس نے کبھی لڑکیوں کے ساتھ تعلیم حاصل نہ کی ان کے گھر کے محدود ماحول میں لڑکیوں سے کھلے ملنے کا رواج نہ تھا ایسے میں لمحہ لمحہ فردوس کے ذکر نے اس کے دل میں ایک بار ضرور فردوس کو دیکھنے کی حسرت پیدا کر دی تھی وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ صرف ایک بار فردوس کو دیکھ لے پھر اپنی اماں کو اُس سے شادی پر آمادہ کرے حالانکہ اُن کے ہاں خاندان سے باہر شادی کا رواج نہ تھا مگر پھر بھی اُسے امید تھی کہ اس سلسلے میں بڑی آپا اُس کی ضرور مدد کریں گی کیونکہ وہ ہمیشہ ہر جگہ اُس کے کام آجایا کرتی تھیں اس لیے اُس نے ان سے بات کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔

☆......☆......☆

''بس آپا فی الحال آپ اماں کو منع کر دیں مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔'' اُس نے اپنی بہن کی بات سنتے ہی سختی سے جواب دیا۔

''دیکھو سجاول' بنا دیکھے جانے تم ایک انجان لڑکی کے لیے اتنا اچھا رشتہ چھوڑ رہے ہو چاچا فیضی کے گھر پہلے ہی دو رشتے آئے ہوئے ہیں۔''

''ہاں تو اُن سے کہیں وہاں کر دیں جہاں انہیں اچھا لگے اور آپ اماں کے ساتھ یہاں آجائیں کلثوم آپا سے مل کر بات کر لیں شاید کوئی سبیل نکل آئے۔''

''میرے آنے سے پہلے ضروری ہے کہ تم خود ان سے بات کرو ساری تفصیل معلوم کرو فردوس کون ہے؟ کیسی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ پھر مجھے بتاؤ تو میں اماں سے بات کروں۔''

آپا کے لہجے میں تھوڑی سی ناراضگی تھی کیونکہ انہیں شروع سے ہی سورٹھ بہت پسند تھی اور ہمیشہ ان چاروں بہنوں نے اُسے اپنی بھابی کے روپ میں ہی دیکھا تھا مگر اب جو بھائی سے بات کی تو کچھ عجیب سی کہانی سننے کو ملی صرف ایک لڑکی کے ذکر خاص نے سجاول جیسے پریکٹیکل زندگی جینے والے لڑکے کے دل کی تاروں کو چھو لیا تھا اور بنا اُسے دیکھے جانے سجاول کو فردوس سے محبت

ہوگئی تھی جس کا اندازہ ابھی ابھی آپا کو اس سے بات کر کے ہوا۔

''یہ سب باتیں تو میں جانتا ہوں آپا۔''

''ہاں تو پھر تم اماں یا کلثوم سے بات کر کے ہمیں بتاؤ کس طرح رشتہ لے کر آنا ہے لیکن ایک بات میں تمہیں اور بتادوں کہ ایک بار پہلے تم خود فردوس سے مل لو تاکہ تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ فردوس یا سورٹھ دونوں میں سے کون تمہارے لیے بہتر ہے۔''

''میں فیصلہ کر چکا ہوں آپا اور جتنی تعریفیں اماں جیسی خاتون اس کی کرتی ہیں میرا نہیں خیال کہ اس کے بعد مزید کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہو۔''

اس کے لہجے میں مصمم ارادہ چھلک رہا تھا جس نے آپا کو خاموش کروادیا اور پھر سلام دعا کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

خلاف توقع آج اماں بہت خوش تھیں اور کام والی بتول کے ساتھ مل کر خود سارے گھر کی صفائی کرواتے انہیں دیکھ کر سیڑھیاں چڑھتے سجاول کو اندازہ ہو گیا کہ آج ضرور کوئی خاص بات ہے اور وہ اوپر جانے کے بجائے نیچے اماں کے پاس آ گیا۔

''خیریت ہے اماں جی آج تو بڑی صفائیاں ہو رہی ہیں۔''

''ہاں بیٹا ابھی ابھی راشد کا فون آیا اس نے بتایا کہ فردوس کو کسی ضروری کام سے ایک ہفتے کے لیے دبئی جانا ہے اور دبئی جانے سے پہلے اپنے ایک ضروری کام کے سلسلے میں اسے یہاں رکنا ہو گا تو میں نے سوچا جلدی جلدی گھر کی اچھی سی صفائی کروادوں کیونکہ اس کی نفیس طبیعت کو ذرا سی بھی گندگی برداشت نہیں۔''

وہ بتول سے گیٹ جھڑواتے ہوئے مسلسل بول رہی تھیں مگر اس ساری گفتگو میں صرف ایک بات کام کی تھی وہ یہ کہ فردوس یہاں آنے والی تھی اور اس کے ساتھ ہی سجاول کی وہ ساری پریشانی دور ہو جاتی جس میں پچھلے کئی دنوں سے اسے آپا نے ڈالا ہوا تھا اماں جی کی گفتگو سن کر اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔

''اچھا تو کب آنا ہے اس نے یہاں؟'' اپنی خوشی بمشکل چھپا کر وہ بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''کل صبح......!''

''اوہ یعنی اتوار والے دن......''

سجاول خوش ہو گیا اور پھر وہ ساری رات اس نے فردوس کے تصور میں گزار دی اسے اپنے گھر میں چاروں طرف فردوس چلتی پھرتی دکھائی دے رہی تھی۔ رات نیند نہ آئی اور صبح فجر پڑھ کر جو آنکھ لگی تو گیارہ بجے ہی کھلی وہ افراتفری میں تیار ہو کر نیچے اترا اس ہفتے کلثوم آپا نہ آئی تھیں کیونکہ ان کی نند کی بیٹی کی شادی تھی اس لیے سونڈ بونڈ سجاول جلدی سے نکڑ والی دکان سے ناشتے کے لیے پوریاں اور حلوہ خرید کر سیدھا اماں جی کی طرف آ گیا باہر کھڑے ہو کر اس نے گرل کا بند دروازہ بجایا مبادا منہ اٹھائے اندر داخل ہونے پر فردوس برا نہ مان جائے حالانکہ اس نے صبح اوپر سے خوب تاک جھانک کی تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اور اسے ابھی تک دیدار یار نصیب نہ ہوا تھا۔

''ارے تم تم کیا مہمانوں کی طرح باہر کھڑے ہو کر دروازہ بجا رہے ہو اندر آ جاؤ۔''

اماں جی کی حیرت زدہ آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔ اور وہ اندر داخل ہو گیا سامنے چارپائی پر وہ تن تنہا بیٹھی تھی۔ کچن کے سامنے سے گزرتے ہوئے سجاول نے ترچھی نگاہ اندر ڈالی لائٹ کھلی ہوئی تھی ضرور اندر کوئی تھا۔

''السلام علیکم اماں جی......'' وہ پوری والا تھیلا قریبی موجود لکڑی کی ٹیبل پر رکھتا ہوا وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ارے یہ کیا لے آئے؟'' اماں نے ایسے پوچھا جیسے

انہیں علم ہی نہ ہو حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ تھیلے میں کیا ہے۔

''سوچا آج کلثوم آپا نہیں ہیں اس لیے آپ کے لیے ناشتہ لے آیا۔''

''بلاوجہ زحمت کی...... ناشتہ تو ہم نے کرلیا فردوس نے بڑے مزے کا آملیٹ بنایا تھا خیر اب تم لے آئے ہو تو کوئی بات نہیں یہ بتاؤ چائے پیو گے؟ میرا خیال ہے پی ہی لو تو اچھا ہے کیونکہ فردوس کی چائے میں ایسی لذت ہے کہ تمہیں پٹھان کے ہوٹل کی چائے بھلا دے۔'' خود ہی سوال کر کے انہوں نے خود ہی جواب بھی دے دیا اور پھر سجاول کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی پکار اٹھیں۔

''بیٹا چائے کے تین کپ بنا لو سجاول بھی آ گیا ہے۔''

سجاول کے کان کسی جوابی جملے کے منتظر تھے اس لیے وہ اپنا مکمل دھیان کچن کی طرف لگائے بیٹھا تھا مگر خلاف توقع وہاں سے کوئی جواب نہ آیا البتہ اسی پل کوئی کچن سے باہر نکلا سجاول کی جھکی نظریں مزید جھک گئیں کسی نے کپ اس کے قریب موجود ٹیبل پر رکھا۔ کندھوں تک کھلے گولڈن سلکی بال اس کے دل کو شانت کر گئے اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر دیکھا اور ششدر رہ گیا اس کے سامنے خوبصورت نیلی آنکھیں اور گولڈن بالوں کے ساتھ جو شخصیت موجود تھی وہ یقیناً ایک لڑکا تھا جس کی مونچھیں دیکھ کر شک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی تھی وہ لڑکا مسکراتا ہوا سجاول کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' بالوں کی بہ نسبت آواز خاصی مردانہ تھی۔ وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا اماں جی نے تو کہا تھا کہ فردوس نے تنہا آنا ہے پھر یہ لڑکا کون تھا اس لڑکے سے گلے مل کر بھی سارا دھیان فردوس میں ہی تھا کہیں فردوس نے شادی تو نہیں کر لی؟'' وہ گھبرا اٹھا۔

''بیٹا چائے پی کر بتاؤ کیسی بنی ہے؟'' اماں جی نے اپنا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

فردوس شاید کچن میں تھی کیونکہ وہاں کی لائٹ ابھی بھی جل رہی تھی یہ ہی سوچ کر اس نے کپ منہ سے لگایا ہی تھا کہ اماں کی آواز کان سے ٹکرائی۔

''اے بیٹا فردوس کچن کی لائٹ تو بند کر دو یہاں بجلی کا بل بہت آتا ہے۔'' سجاول کو یک دم کھانسی لگ گئی اندر جاتا گرم چائے کا گھونٹ باہر نکل آیا کیونکہ خالہ کے کہتے ہی وہ لڑکا اٹھ کھڑا ہوا اور کچن کی لائٹ بند کر کے واپس آ گیا۔

''اماں جی یہ کون ہے؟'' ابھی بھی سجاول کو شاید کچھ شک تھا اس لیے وہ تصدیق چاہتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''ارے یہ میرا بھتیجا فردوس ہے تو بھلا کئی بار تو میں نے تم سے ذکر کیا کہ بچے نے آنا ہے اب تم پھر پوچھ رہے ہو کہ یہ کون ہے بیٹا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

اماں جی حیرت سے پوچھ رہی تھیں جبکہ فردوس مسکرا رہی تھی، سوری مسکرا رہا تھا۔ سجاول کو جیسے کوئی کام یاد آ گیا اور وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''اماں جی میں ابھی آیا۔'' ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ بھی اس نے وہیں ٹرے میں رکھ دیا۔

''اے لڑکے پوریاں تو اٹھا لو ہم دونوں ناشتہ کر چکے ہیں۔''

اسے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر اماں جی نے پیچھے سے پکارا مگر وہ نہ رکا اسے ابھی اوپر جا کر آپا کو فون کرنا تھا تا کہ وہ اماں کو سورنھ کے رشتہ کے لیے ہاں کر سکیں اس کی نظروں کے سامنے خوبصورت سی سورنھ گھوم گئی وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ چاچا کو انکار سے پہلے ہی اس کا سامنا فردوس سے ہو گیا ورنہ جانے کیا ہوتا لازمی طور پر ایک انجانی قابل لڑکی کے چکر میں ایک جانی پہچانی خوبصورت لڑکی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا سچ ہے بنا دیکھے بنا جانے کیے جانے والے فیصلے کئی دفعہ ہمیں ایسا ہی دھوکہ دیتے ہیں۔

☆☆......☆☆

افسانہ

ڈاکٹر الماس روحی

رومانیت

''بیٹی تمہیں ہم نے کیا اس لیے پڑھایا لکھایا تھا کہ تم اپنے سے عمر میں بڑے اور نکمے شاعر سے شادی کروگی۔ اس کے پاس ہے کیا کنگال 'فقیر کہیں کا' اُسے بے وقوف بنانے کے لیے تم ہی ملی تھیں۔'' ماں کی بڑبڑ وہ پتھر بنی سنتی رہی۔ فیصلہ تو وہ کر چکی تھی۔ اُدھر......

زندگی ہر نئے رنگ میں اُس پر عیاں تھی۔ مگر یہ رنگ تو اُس کے انگ انگ کو جھلسا گیا تھا۔ خوابوں کی تعبیریں مختلف ضرور ہوتی ہیں لیکن بھیانک ہوجائیں تو زندگی زہر بن جاتی ہے۔ تلخ اب اس کا قلم نہیں لہجہ بھی ہوگیا تھا کیونکہ وجود کی تھکن اب بیماری میں ڈھل گئی تھی۔

پہلے کبھی اس کا ہر قدم پُرعزم ہوتا تھا مگر اب ہر قدم تھکا تھکا رکا رکا سا تھا۔ اُسے تو ایسا لگتا تھا جیسے ایک پہاڑ اس پر آ گرا ہو۔ وہ ایک ایسا پنچھی تھی جو آسمان کی وسعتوں کو چھونا چاہتی تھی۔ اُسے ایسا لگتا تھا دور ہوا کے دوش اڑتے ہوئے کسی ظالم شکاری کی گولی کا نشانہ بن گئی ہو اور لمحوں میں زمین پر آ گری ہو۔

وہ خود کو جب کبھی آئینے میں دیکھتی تو اس کو اپنا وجود مکڑی جیسا لگتا۔ مکڑی جو اپنی حفاظت کے لیے جالا بنتی ہے۔ مگر یہی جالا بنتے ہی وہ غیر محفوظ ہوجاتی ہے۔ حادثوں کا ایک سلسلہ اس کے ہر جالا بننے کی اختتامی کاوش کو ختم کر دیتا ہے۔ کبھی ہوا کا تند و تیز جھونکا، کبھی پانی کا بہاؤ، کبھی جھاڑو تو کبھی کپڑے کا ہاتھ۔

اُس نے بھی اُس سے ایک ایسے گھر کی چاہ کی تھی۔ جس میں وہ اس کی حفاظت کر سکے۔ مگر وہ اس کی کیا حفاظت کرتا۔ وہ تو گھر چاہتا ہی نہیں تھا۔

''یہ در و دیوار میرے اور تمہارے جیسے فنکاروں کے لیے نہیں ہوتے ہیں۔ یہ در و دیوار اور لگی بندھی زندگی سوچوں اور ذہنوں کو مقید کر دیتے ہیں۔'' وہ دم بخود اُسے سن رہی تھی۔ جس نے دنیائے اب و گل کے تلخ حقائق اور مسائل سے فرار ہو کر تخیلاتی حسین و جمیل دنیا میں پناہ لے رکھی تھی۔

وہ اُن سے پیار کرتی تھی جو متنازعہ شخصیت تھی۔ کتنی بے شمار جھوٹی سچی، من گھڑت فرضی اور خیالی باتوں کا اس کے اردگرد ہجوم تھا۔

مگر وہ ایک بڑا اور مقبول شاعر تھا۔ جادو اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے کلام میں بھی تھا۔ ایسی تاثیر تھی بوڑھوں کے سرد دلوں میں شباب کی حرارت پیدا ہوئی تھی۔ اور جوانوں کے دل کی حرارت آفتاب، بن کر پوری ہستی پر چھا جاتی تھی۔

اس کے ذہن و دل پر بھی وہ چھا گیا تھا وہ اس کی قربت چاہتی تھی اس قربت کو رشتے کا حوالہ دینے کے خواب دیکھنے لگی۔ وہ بے نیاز ہنس کر کہا کرتا تھا۔

''تم ادیبہ ہو تمہیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں تم گھر گرہستی کے لیے نہیں پیدا ہوئیں۔ تم لفظوں اور حرفوں کے جادو جگانے کے لیے ہو۔ تمہیں ملک کی مایہ ناز ادیبہ بننا ہے۔

تمہاری ابھی عمر ہی کیا ہے۔ اٹھارہ سالہ نوجوان دوشیزہ، لکھتی تم ایک منجھے ہوئے فنکار کی طرح ہو بھئی میں تو تمہارے فن کا پرستار ہوں۔ اسی لیے تمہیں دوست بنایا ہے تاکہ تم مجھ سے کچھ سیکھو اور اردو ادب کو میں ایک ادیبہ دے سکوں۔''

وہ اس دل کا کیا کرتی جو ہر پل اُسے یہ کہتا تھا کہ تم عمروں کو درمیان میں کیوں لاتے ہو۔ سوچو تم اور میں ازل سے فنکار ہیں۔ تم آج نامور ہو میں کل نام کروں گی۔ ہماری سوچیں ایک قلم میں ڈھلتی ہیں۔ تم شاعری میں پھول کھلاتے ہو۔ میں نثر کا گلزار سجاتی ہوں۔ میرا وجود تمہاری شاعری میں بولتا ہے۔

اور تم میرے افسانوں کے ہیرو ہو۔ پھر ہم تم

کیوں ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ عمر جو دیوار کھینچ رہی ہے اُسے گرا دو یہ دس پندرہ سال کا فرق بھلا کیا فرق ہے۔ جب سوچوں کے سفر تیزی سے بڑھتے ہیں تو شخصیت میں ٹھہراؤ آ ہی جاتا ہے۔

دوستوں یاروں نے جب مشاعروں اور محفلوں میں اُسے سنا تو اندازہ ہوا وہ جو کوہساروں 'وسیع و عریض' سمندروں اور سمندروں میں طوفانوں' کشتیوں اور بادبانوں کا دلدادہ تھا۔ اس کی رومانیت اب محبوبہ کی آغوش میں کھو جانے کی آرزو سے تشکیل پا رہی ہے۔ جس کا بچپن سے رومان اور محبت مشغلہ رہا ہے۔ اُسے اب دنیا کی محفل میں محبت ہر طرف لہلہاتی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ محبت کی معراج پر پہنچ گیا ہے اُسے سرتاج عبادت بنا بیٹھا ہے۔

اُس نے محبت کی تمام تر رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ اپنے جذبوں کو بے نقاب کیا تھا۔ پھر ان دوست احباب نے بڑا دباؤ ڈالا اور اسے گھر بسانے کی صلاح دی' کبھی کبھی دعا دیر سے سہی مگر قبول ہوتی ہے۔

انسان کو اپنی قسمت پر رشک آنے لگتا ہے۔ اُسے بھی اپنے آپ پر رشک ہوا جب تین برس بعد اُس سنگدل شاعر نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔

''نہ جانے تم میں کیا ہے۔ تم مجھ میں بولتی ہو۔ لوگوں کو میرے حرفوں اور لفظوں میں محسوس ہوتی ہے۔ شاید میری روح میں اتر گئی ہو۔ اب ممکن نہیں میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

اور پھر انہوں نے اپنے خوابوں کو پانے کے لیے ایک واضح فرق کو بے معنی بنا دیا۔ اس شادی سے دونوں کے خاندان ناخوش تھے۔ سویرا رحمان کی ماں نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔

''بیٹی تمہیں ہم نے کیا اس لیے پڑھایا لکھایا تھا کہ تم اپنے سے عمر میں بڑے اور نکمے شاعر سے شادی کرو گی۔ اس کے پاس ہے کیا کنگال' فقیر کہیں کا' اُسے بے وقوف بنانے کے لیے تم ہی ملی تھیں۔''

ماں کی برہمی وہ پتھر بنی سنتی رہی۔ فیصلہ تو وہ کر چکی تھی۔ اُدھر راحت شاہ کی گھر کی خواتین بہن بھائی' بھانجیوں اور بھتیجیوں نے شور کیا کہ وہ ماموں کے ساتھ اچھی نہیں لگے گی۔ وہ تو بہت چھوٹی اور سانولی ہے۔ دوسرے ان کا فرقہ الگ ہے۔ نذر نیاز درود و فاتحہ ان کے یہاں تو ہوتا نہیں ہے۔ اعتراض ہی اعتراض ہے لیکن گھر کے مرد اس کی خوشی چاہتے تھے۔

وہ جانتی تھی جس گھر میں اُس نے میگزین کے لیے اس کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی کوٹھی تھی۔ ایک پوش ایریا میں وہ ایک کوٹھی میں رہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اُسے اس کوٹھی کا گوشہ دے رکھا تھا۔ اُسے دنیاوی معاملات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے دو بڑے بھائیوں کو زندگی میں مداخلت سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ وہ بھی جانتے تھے یہ پیدائشی شاعر ہے۔ اس کا سونا جاگنا معمولات کے برعکس ہے۔

اس لیے اُسے گھر کے کاٹھ کباڑ کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا۔

وہ اسی حصے میں رہتی تھی کیونکہ اُسے میگزین 'بازیچہ'' خامہ' کا مدیر بنا دیا گیا تھا وہ اس میگزین کو آسمان کی بلندی پر لے جانا چاہتی تھی۔ شب و روز وہ انہی کاوشوں میں تھی تب ہی اس کے دوستوں نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ یہ لڑکی اس کی بہترین جیون ساتھی ثابت ہوگی اس میں بڑی انرجی ہے۔ پھر یوں ہوا کہ وہ واقعی اس کی جیون ساتھی

بن گئی۔
دعا قبولیت کے وقت جزا اور وقت گزرنے پر سزا لگتی ہے۔ اور ایسی سزا جو زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ شادی کے ابتدائی برس کے دو سے تین سال تو اچھے ہی گزرے۔ وہ خود بھی حقیقت پسند تھی۔ جانتی تھی اس نے ایک شاعر سے شادی کی ہے۔ جس کی شاعری کی ہزاروں لڑکیاں دیوانی ہیں۔ وہ اب اس کا شوہر تھا یہ احساس اُسے اچھا لگتا تھا۔ رومانیت زندگی کی ایک خاص طرح کی کیفیت کا نام ہے۔ جس میں عقلیت سے زیادہ جذباتیت کے عناصر غالب ہوتے ہیں۔ بلکہ جذباتی کیفیات کا رنگ اس قدر شوخ اور گہرا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے عقلی کیفیات کا رنگ قدرے ماند پڑ جاتا ہے۔ اس کی رومانیت نے جو رنگ دکھائے وہ اب وقت گزرنے پر ماند پڑتے جا رہے تھے۔
تلخ حقائق انسان کو توڑ دیتے ہیں۔ اور ٹوٹے ہوئے انسان کی اخلاقیات بھی کمزور پڑ جاتی ہیں۔ وہ بھی ٹوٹ گئی ایک خوددار عورت جس کی انا بہت مضبوط تھی۔
اس کا ٹوٹنا کسی المیہ سے کم نہ تھا۔ وہ سارا سارا دن شراب کے نشے میں دھت پڑا رہتا تھا اور راتوں کو مشاعرے پڑھتا جو پیسے ملتے وہ نشے میں اڑا دیتا ہفتوں گھر سے غائب رہتا ہر ذمہ داری اور ہر کام سے خود کو معذور کہتا۔ حیلے' بہانے' معذرتیں سبھی کچھ اس کے پاس تھا۔ جتنا بڑا فنکار تھا اتنا ہی بدترین انسان نکلا۔
لفظوں اور حرفوں سے زندگی نہیں گزرتی۔ شہرت مفلسی کے ساتھ کھلتی ہے' چبھتی ہیں۔ اُسے بھی اس کی شہرت بری لگنے لگی تھی اس کے گھر والے بہت عام سے تھے۔ جنہوں نے اُسے اس کوٹھی میں نکلنے ہی نہیں دیا۔ آخر اُس نے کرائے کا فلیٹ لیا۔ کرائے کا مکان' گیس' بجلی کا بل اور بچوں کی فیسیں وہ چند سالوں میں بیمار دکھائی دینے لگی۔
گھڑی کی سوئی کے ساتھ اُس کی صبح کا آغاز ہوا اور جب وہ رات کو لیٹتی تو تھکن سے چور ہوتی اور آنسو اس کے تکیے کو بھگو دیتے۔ پچھتاوے ناگ بن کر ڈستے تھے۔ صبح شام اسے فکریں کھاتی تھیں۔ مہینہ کیسے گزرے گا ضرورت کی ہر چیز پہلی آنے سے پہلے ختم ہو جاتی۔ نرمی اور لطافت اس کی طبیعت سے دور ہوتی جا رہی تھی۔
قلم سے لفظ روٹھ گئے تھے خیال ذہنوں کے دریچوں سے دور بہت دور چلے جاتے تھے۔ لفظ ان کا تعاقب کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ ہر بار لکھنا رہ جاتا اور وہ یہ سوچ کر رہ جاتی تھی ہر چیز کا جان لینا اور کرنے کا عزم بھی زندگی کو آسانی کے بجائے مشکل کی طرف لے جاتا ہے۔ اُسے کیا خبر تھی وقت گزرنے پر باقی رہے گا اور نہ جذبہ باقی صرف تھکن رہ جائے گی۔
اس نے 'بازیچہ خامہ' میگزین کی جگہ ڈائجسٹ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس میگزین کا مواد بدل دیا۔ پندرہ سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اب ادبی میگزین سے زیادہ ڈائجسٹوں کی پذیرائی تھی۔ اُس نے اشتہارات حاصل کیے اور گھر کے کمرے کو ڈائجسٹ کا دفتر بنا دیا۔ ملک کے کونے کونے سے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پہ جمع کیا اور افسانے لکھوائے۔ 'رنگ ریز' ڈائجسٹ کو شہرت ملتی چلی گئی رات دن کی محنت رنگ لائی اور اس کے حالات بہتر ہونے لگے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی کی ماں جس کے بچے جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکے تھے۔ وہ شوہر کی نظر میں نامعتبر ہوئی

گئی۔ وہ شوہر جو ظلم و تشدد کے خلاف نعرہ احتجاج بلند کرتا تھا۔

اور ایسے معاشرے کے خواب دیکھتا تھا جہاں چلچلاتی دھوپ میں ہل چلانے والے کسان کو پیٹ بھر کر روٹی میسر آسکے۔ جہاں عشق کی بادشاہت' محبت کا قانون اور حسن کا سکہ رائج ہو۔ جہاں اُلفت کی سرسبز و شاداب وادیوں میں اخوت کے پھول کھلتے ہوں۔ اور ان پھولوں کی خوشبو چاروں اطراف انسان دوستی کا پیغام دیتی ہو۔

جہاں جھرنے دھت کا گیت گاتے ہوں۔ جہاں دریاؤں کی تندی و تیزی' بغض' حسد' مکاری وعیاری' عداوت' ولگاوٹ کے خس وخوشاک کو بہا کر لے جاتی ہو۔ جہاں ندیاں تخم مسرت کی آبیاری کرتی ہوں۔

ایسے معاشرے کی چاہت رکھنے والے شاعر جب غصے میں دھاڑتا تو غلیظ سے غلیظ زبان استعمال کرتا۔ وہ حیران ہوکر دیکھتی ورڈز ورتھ' کیٹس' لارڈ بائرن اور شیلے' پڑھنے والے کی رومانیت یہ تھی۔ ڈھلتی عمر نے اس کے اعصاب کو کمزور کردیا تھا۔

عمروں کا فاصلہ میاں بیوی کے تعلقات کو کھا رہا تھا۔ وہ اب سر محفل اپنی شریک حیات کی بے عزتی کردیتا تھا۔ دوستوں کی محفل میں اُسے اتنا برا بھلا کہتا کہ سننے والے کان پکڑنے لگتے تھے۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ ایک عورت نے کس طرح اس گھر کو بسا رکھا ہے اور اس میں ایک مرد کا کیا کردار ہے۔

بچے بچپن سے دیکھتے آئے تھے جس زبان دانی پر ان کے والد کو فخر تھا۔ اس زبان کا کھلا غلط استعمال وہ جب کرتے تھے۔ تو کسی جاہل انسان سے بدترین اظہار ہوتا تھا۔ بچوں کی تربیت میں وہ اپنی مشغولیات کی بنا پر کوئی کردار ادا نہ کرسکا۔

اُدھر زندگی کی تلخیوں نے سویرا کے قلم کو پھر سے جلادی اس نے اخبار میں کالم لکھنے شروع کیے۔ اب وہ ملک مایہ ناز ادیبہ تھی اور راحت شاہ کی شاعری کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ اب مشاعروں میں اُسے نہیں بلایا جاتا تھا وہ گوشہ نشین ہو چکا تھا۔

اپنی ناکامی کا بدلہ بیوی سے لیتا تھا۔ نشے کی حالت میں ایک رات کے اگلے پہر آکر اُس نے شور مچایا اور بیوی بچوں کو گالیاں گلوچ دینے لگا۔ وہ بندھن جسے نبھاتے نبھاتے اُس نے چودہ سال گزرے تھے۔ اُس نے اپنی عزت کو پاش پاش ہوتے دیکھ کر توڑ دیا۔

محض شک پر اُس کی بیوی اب بھی جوان ہے۔ مدیر ہے اور چاہنے والے دفتر آتے ہیں۔ اور ان سے تعلقاتِ خاص رکھتی ہے۔ اُس نے ماں کا اعتبار توڑا' بیوی کا مان توڑا اور اُسے رسوا کر کے رکھ دیا۔

تنہائی جب اُس کے اردگرد بولتی ہے۔ تو اُسے اپنے رائیگاں جانے کا بڑا احساس ہوتا ہے محبت وقت کے ہاتھوں یوں بھی نامعتبر ہوجاتی ہے کچھ ہی عرصے بعد سویرا نے اخبار میں پڑھا۔ ملک کے نامور شاعر راحت شاہ طویل علالت کے باعث انتقال کرگئے وہ طویل عرصے سے سرکاری اسپتال میں زیرِ علاج تھے۔

اس نے آنسو پی لیے وہ اس کی موت پر بہانہ بھی نہیں چاہتی تھی جو بہت کمزور اخلاق کا مالک تھا۔ جس نے رومانیت تو کی لیکن اس کے بھرم کو نہ سمجھا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

تحسین انجم انصاری

تجدیدِ وفا پھر

''ماہ رخ...... امی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اُس کے ساتھ کیسی زیادتی ہو رہی ہے۔ وہ کیوں چپ ہو کر رہ گئی ہے۔ کیوں اتنی اُداس رہتی ہے۔ اور تم فکر نہ کرو میں اُس سے بھی اگلوالوں گی جس کا نام اُس نے لیا ہے۔ مجھے تو پہلے ہی اُس پر......

سفید پتھروں سے بنی باوقار مینشن کے ایک خوبصورت کمرے میں سنہری بارڈر والی میرون ساڑھی زیب تن کیے ماہ رخ نے مغلیہ طرز کے منقش ڈریسنگ ٹیبل کے شفاف آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور بے اختیار ایک مغرور مسکراہٹ لبوں کو چھوگئی۔

اُس نے خوبصورت اور ماڈرن اسٹائل میں کٹے براؤن بالوں میں برش کیا جن میں میرون اسٹریکس اُن کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ میک اپ پہلے ہی کر چکی تھی۔ لبوں پر ایک بار پھر میرون لپ اسٹک کا آخری ٹچ دے کر نازک میرون اور سنہری ہائی ہیل سینڈل پہنی۔ چھوٹا سا گولڈن پرس اور بڑا میرون لیدر بیگ اٹھایا اور کمرے سے باہر آگئی۔

کاریڈور کے سرے پر صدوری ایک موڑھے پر بے چین سی بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی قریب آ کر مودب انداز میں کھڑی ہوگئی۔

''صدوری......'' ماہ رخ نے لیدر بیگ اُس کے حوالے کیا اور بولی۔

''شام پانچ بجے رفیق صاحب کی فلائٹ ہے۔ جہاز وقت پر پہنچ رہا ہے۔ سارے انتظامات مکمل ہونے چاہئیں، وہ ذرا سی بے ترتیبی برداشت نہیں کرتے۔''

''جی بیگم صاحب...... آپ فکر نہ کریں میں سب دیکھ لوں گی۔''

''خانساماں سے کہہ کر رفیق کی پسند کی چند ڈشز تیار کروالینا، مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''جی بیگم صاحب......''

''مجھے کافی دیر ہو چکی ہے...... یہ بیگ ڈگی میں رکھوا دو...... اور ڈرائیور سے کہو فوراً گاڑی نکالے۔'' ہدایت دے کر وہ مڑی تھیں کہ پھر صدوری کو روک لیا۔

''اور ہاں چار بجے رزاق صاحب آئیں گے...... چونکہ وہ دفتر سے سیدھے اِدھر ہی آئیں گے اس لیے کھانے کا پوچھ لینا...... ورنہ اچھی سی چائے ضرور پلوا دینا...... تین چار چیزیں ضرور

ہونی چاہئیں ساتھ...... وہی رفیق کو ایئر پورٹ
سے لائیں گے۔ وہ چاہیں تو ایمی کو ساتھ لے
جائیں۔ بائی دا وے ایمی ہے کہاں؟''
''بیگم صاحبہ بی بی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ
رہی ہیں۔''
بیگم ماہ رخ رفیق چند لمحے کھڑی کچھ سوچتی
رہیں۔ متفکر انداز میں ریسٹ واچ پر نظر ڈالی اور
باہر جاتے جاتے واپس اندر کی طرف مڑیں۔ اُن
کا رخ لاؤنج کی طرف تھا۔ وسیع و عریض لاؤنج
خوبصورت نفیس فرنیچر سے سجا تھا۔ بیڈ روم کے
مغلیہ طرز کے فرنیچر اور سجاوٹ کے برعکس یہاں
ہر چیز ماڈرن تھی۔ قیمتی ڈیکوریشن پیسز جو رفیق دنیا
کے ہر کونے سے امپورٹ کر کے لائے تھے لاؤنج
میں انوکھا پن پیدا کر رہے تھے۔ گرے رنگ کے
دبیز کارپٹ پر چلتی ہوئی وہ آرام دہ لیدر صوفوں
کی طرف آئیں جہاں ایمی ٹی وی پر نظریں
جمائے کوئی جاپانی کارٹون دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پر
بھی نظریں نہ اٹھائیں۔
''ایمی آپ نے کھانا کھالیا؟''
''جی ممی......'' وہ اُن کی طرف دیکھے بغیر
سپاٹ چہرے سے بولی۔
''ایمی...... میری طرف دیکھ کر بات کرو......
ڈونٹ بی اے روڈ گرل......'' وہ ناگواری سے
بولیں تو ایمی نے ایک سیکنڈ کے لیے گردن اُن کی
طرف موڑی۔
''تمہیں پتہ ہے آج ڈیڈی آ رہے ہیں......
شام میں رزاق انکل آ رہے ہیں۔ وہ ڈیڈی کو
ایئر پورٹ سے لائیں گے۔ تم ساتھ چلی جانا۔
ڈیڈی خوش ہوں گے۔''
''نہیں...... میں انکل کے ساتھ ایئر پورٹ
نہیں جاؤں گی۔'' ایمی زور دے کر بولی۔
''کیوں...... کیوں نہیں جاؤ گی بہت ضدی
اور خود سر ہوتی جا رہی ہو۔'' ماہ رخ نے ایک بار
پھر اپنی ریسٹ واچ پر نظر ڈالی۔
''ممی آپ کیوں نہیں جا رہی ہیں۔ میں آپ
کے ساتھ جاؤں گی ایئر پورٹ......''
''ڈونٹ بی اے بے بی ایمی...... تمہیں پتہ
ہے ممی کس قدر مصروف ہیں۔ اور آج کی میٹنگ
بہت امپورٹنٹ ہے۔ کسی صورت مس نہیں کر سکتی۔
بہت نقصان ہو جائے گا۔ تم اچھی بچیوں کی طرح
انکل کو کمپنی دینا۔ آفٹر آل وہ کتنا پیار کرتے ہیں تم
سے......''
''نہیں......'' ایمی صوفے سے اتر کر غصے میں
کھڑی ہوگئی۔
''میں انکل کو کمپنی نہیں دوں گی۔ اُن سے
بات نہیں کروں گی۔ صدوری ہے نا وہ سب کچھ
کر لے گی مجھے آج بہت زیادہ ہوم ورک ملا ہے
...... آئی ایم بزی......'' ماہ رخ نے زچ ہو کر
اُسے دیکھا اور پھر باہر جانے کے لیے مڑ گئیں۔
''میں واپس آ کر تم سے بات کروں گی۔
اس وقت ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔'' وہ کھٹ
کھٹ کرتی باہر نکل گئیں۔ تو ایمی مرے مرے
انداز سے صوفے میں دھنس گئی اُس کی آنکھوں
میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

☆......☆......☆

ماہ رخ سجاد اور رفیق اقبال دونوں اعلیٰ
سوسائٹی کے چشم و چراغ تھے۔ دونوں کے
والدین دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ فیملی
فرینڈز بھی تھے۔ دولت بڑھانے کی پالیسیوں پر
دونوں خاندان پورے جوش و خروش سے عمل پیرا
تھے۔
ماہ رخ اور رفیق کو شادی کے بندھن میں

باندھنا بھی اسی پالیسی کا حصہ تھا۔ حالانکہ ماہ رخ نے اس شادی کی سختی سے مخالفت کی تھی۔ وہ رفیق سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ یونیورسٹی کے زمانے میں مڈل کلاس کے ایک ذہین اور وجیہہ لڑکے کے عشق میں مبتلا تھی۔ لیکن نہ تو اُس کا رونا دھونا کام آیا اور نہ ہی بھوک ہڑتال نے ماں باپ کے دل نرم کیے۔ وہ تو اس حد تک وفا نبھانے کو تیار تھی کہ دونوں کورٹ میرج کر لیں۔ لیکن لڑکا شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے سختی سے اس قدم کی مخالفت کی۔ وہ اُسے اُس کے گھر سے عزت واحترام سے بیاہ کر لے جانا چاہتا تھا۔ جس کے لیے ماہ رخ کے والدین ہرگز تیار نہ تھے۔

آخر اُسے رفیق سے شادی کرنی پڑی۔ شادی نے اُس کے اندر تلخی بھر دی تھی۔ امیدوں اور آرزوؤں کا گلا گھونٹ دینے سے شخصیت پر کچھ اثر تو پڑنا تھا۔ وہ جو ہر دم ہنسنے مسکرانے والی لڑکی تھی۔ ایک دم سے بے نیازی کے خول میں سمٹ گئی۔ رفیق کے ساتھ تعلقات بھی واجبی ہی رہے۔ دل کا رشتہ نہ جڑ سکا۔ رفیق باہر کے ملک سے پڑھ کے آیا تھا۔ اس کا اپنا رویہ بھی کوئی خاص پُرجوش نہیں تھا۔ وہ قسم قسم کی لڑکیوں سے دوستی کے نام پر عیاشی کرتا رہا تھا۔ شادی کے بعد اُس کی پوری توجہ بزنس کی طرف مبذول ہوگئی۔ اُس نے اپنی نئی کمپنی کھولی تھی۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ خود کو سوسائٹی میں انفرادی طور پر منوانا چاہتا تھا اس لیے دن رات محنت کر رہا تھا۔

ماہ رخ کو وقت نہیں دے پاتا تھا اور ماہ رخ کو اس کی زیادہ پرواہ بھی نہیں تھی۔ ابھی تک وہ اپنی قیمتی چیز کھونے کے غم سے سمجھوتہ نہیں کر سکی تھی۔ رفیق آئے دن بیرونی دوروں پر ہوتا..... ماہ رخ کبھی کبھی ساتھ چلی جاتی۔ وہ اپنی بزنس ڈیلینگز میں مصروف رہتا اور ماہ رخ ہوٹل کے کمرے میں صبح دیر تک سوتی..... پھر روم سروس کو آرڈر دے کر ڈٹ کر ناشتہ کرتی۔ بعد میں شاپنگ پر نکل جاتی۔ کبھی سارا دن سو کر گزار دیتی یا ٹی وی پر فلمیں دیکھتی..... پھر اُس نے ساتھ جانا بھی بند کر دیا۔ وہاں ہر وقت بوریت کا شکار رہتی تھی۔ گھر میں بھی یہی حال تھا۔

ساس اور سسر علیحدہ اپنے گھر میں رفیق کے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ نوکروں کی فوج موجود تھی۔ کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ یہاں بھی وہی روٹین تھی۔ صبح دیر سے اٹھنا ناشتہ کرنا..... دوپہر کے کھانے کا آرڈر دینا اور پھر موبائل پر دوستوں سے لمبی لمبی گفتگو کرنا۔ دوستوں کے ساتھ رات گئے تک پارٹیاں اٹینڈ کرنا۔ اُس نے خود کو بری طرح مصروف کر لیا تھا تاکہ اپنی محبت یاد نہ آئے۔ اپنی محرومی بھول سکے اور اُسے یاد کرنے کا وقت ہی نہ ملے۔

کئی سال اسی طرح گزر گئے۔ رودھو کر دو بچے بھی پیدا کر لیے۔ ارسلان اور ایمن انہیں بھی زیادہ تر اُن کی گورنس نے پالا..... ماہ رخ صبح جاتے ہوئے ماتھے پر بوسہ دے دیتی اور واپس آتے ہوئے سوتا ہوا دیکھ لیتی۔ بڑے ہوئے تو پڑھائی کے لیے ٹیوٹر موجود تھے۔ کبھی زیادہ لاڈ نہیں کیا، کبھی موڈ ہوا یا پیار آیا تو منہ چوم لیا یا گلے سے لگا لیا۔ کبھی ساتھ بٹھا کر زیادہ بات نہیں کی۔ کبھی رات کو کہانی نہیں سنائی۔ کبھی اُن کے لیے اسپیشل کھانا پکوا کر (پکانا تو دور کی بات ہے) کھلانے کی کوشش نہیں کی۔ بچوں اور ماں میں وہ

رشتہ اور تعلق پیدا ہی نہ ہو سکا جو کہ ماں اور بچوں میں ہوتا ہے۔ بچوں نے بھی یہ دیکھ کر آپس میں رشتہ جوڑ لیا کہ یہ فطرت کا قانون ہے۔ دونوں میں بے پناہ محبت تھی۔ ایک دوسرے سے دنیا جہان کی باتیں کرتے انہوں نے اپنے لیے ایک نیا جہان ہی آباد کر لیا تھا۔ ہاں رفیق بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ شاید اُس نے ماہ رخ کا رویہ نوٹ کیا تھا اور اُس کا ازالہ کرنا چاہتا تھا یا پھر زیادہ وقت گھر سے دور رہنے کے جرم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ بچے بھی اُس کی آمد کے موقع پر خوش ہوتے تھے۔ اور زیادہ سے زیادہ وقت اُن کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتے۔

ارسلان دس سال کا ہوا تو رفیق نے اُسے پڑھائی کی غرض سے ملک سے باہر بھیج دیا۔ اُس کے خیال میں یہ ملک اس قابل نہیں تھا کہ بچوں کو اچھی تعلیم دے سکے۔ یوں بھی اتنا بے شمار پیسہ آخر کس لیے تھا۔ زندگی میں پہلی بار ماہ رخ کے دل کو کچھ ہوا۔ ارسلان دور چلا جائے گا۔ یہ تو اس نے نہیں سوچا تھا اور نہ ہی وہ چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر کو ہی وہ اُسے دیکھ تو لیتی تھی۔ اُسے یہ احساس ہی مطمئن رکھتا تھا کہ وہ گھر میں موجود تو ہے...... پہلی بار اُس نے رفیق کی مخالفت کی لیکن پھر رفیق کے سمجھانے پر سمجھ گئی۔

ارسلان کے اچھے مستقبل کے لیے مان گئی لیکن ارسلان کے جانے کا سب سے زیادہ اثر ایمن پر ہوا۔ وہ جو اسکول سے آنے کے بعد کسی چڑیا کی طرح چہکتے ہوئے اسکول کی ایک ایک بات ارسلان سے شیئر کرتی تھی بالکل خاموش ہو کر رہ گئی۔ خود کو ایک خول میں بند کر لیا۔ ایسا سخت خول جسے توڑ کر کوئی اُس کے اصل جذبات تک نہ پہنچ سکے۔

ارسلان کے جانے کے بعد ماہ رخ موبائل پر لمبی گفتگو اور رات گئے تک چلنے والی پارٹیوں سے بھی تنگ آ گئی تو اُس کے دماغ میں ایک نیا خیال آیا۔ اس نے اپنی امیر کبیر سہیلیوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم قائم کی جس کا نام 'ماہ رخ ہیلپ' رکھا گیا۔ وہ سہیلیاں بھی اُسی کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہر کام کے لیے ہیلپ موجود تھی کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ بوریت کا شکار ان عورتوں نے بطور شغل ماہ رخ کی تنظیم جوائن کر لی۔ یوں بھی نت نئے فیشن کے قیمتی فیشن ایبل ملبوسات، جوتے' اور قیمتی نوادرات سے سجے زیورات کی نمائش کا اچھا موقع تھا۔ غیبت اور شکایات کے لیے بھی اچھی جگہ تھی۔

تنظیم کا مقصد عورتوں کو اُن کے مسائل سے آگاہی اور شعور دینا اور اُن کے مسائل کا حل بتانا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی...... بچوں کی تعلیم اور بچوں کے ساتھ زیادتی کے متعلق چوکنا کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے ماہ رخ نے چار مڈل کلاس کی خواتین کو ملازم رکھ لیا تھا۔ عظمیٰ' اقصیٰ' عطیہ اور عذرا...... یہ سب تعلیم یافتہ خواتین تھیں۔ اُن کا کام زیادہ تر آؤٹ ڈور دورے...... گھر گھر جا کر ہر قسم کے مواد کے پمفلٹ تقسیم کرنا...... اور اُس کے بارے میں لوگوں سے بات چیت کرنا تھا۔ اکثر خواتین پڑھی لکھی نہیں ہوتی تھیں اس لیے انہیں سب کچھ زبانی بھی سمجھانا پڑتا تھا۔ چاروں تعلیم یافتہ خواتین خوشی خوشی یہ کام سرانجام دیتی تھیں۔ تنخواہ بھی زیادہ مل جاتی تھی اور اسی بہانے گاؤں گاؤں کی سیر بھی...... اب اونچے درجے کی مالدار سہیلیاں تو یہ کام کرنے سے رہیں۔ وہ تو کسی غریب گاؤں کی عورت سے بات کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں۔ اُن کو اسی بات پر

ناز تھا کہ وہ تنظیم کے لیے ڈونیشن دے دیتی ہیں۔

آج بھی میٹنگ کے لیے سرینا میں مہنگے ہال کو بک کروایا گیا۔ میز پر سجے لوازمات خوبصورت جگمگاتے برتنوں میں، مہکتے پھولوں کی ارینجمنٹ کے درمیان سجے تھے۔ لمبی سی میز کے ایک سرے پر ماہ رخ بیٹھی گفتگو کر رہی تھی۔ گفتگو کے دوران کبھی وہ اپنے خوبصورت جگمگاتے آویزے کو ہاتھ سے چھوتی کبھی اپنے ڈائمنڈ نیکلس کو ٹھیک سے سامنے کرتی اور کبھی اپنی انگلیوں میں سجی بڑے قیمتی پتھروں والی انگوٹھیوں سے کھیلتی، سوشل مسائل پر تقریر کرنے کے بعد وہ اپنی تنخواہ دار خواتین سے مخاطب ہوئی۔ اب تک ساری سہیلیاں ماہ رخ کے علاوہ ایک دوسرے کے ملبوسات زیورات اور جوتوں کا جائزہ لے چکی تھیں۔

''عظمیٰ...... میں نے سارا مواد اور سارے پمفلٹ جمع کر کے اس فائل میں لگا دیے ہیں۔'' ماہ رخ نے اپنے براؤن بیگ سے فائل نکالی اور میز پر رکھ دی اور مخروطی نیل پالش سے سجی لمبے ناخن والی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کچھ پمفلٹ میں جو گاؤں کی عورتوں میں بانٹنے ہیں، یہ بچوں کی تعلیم کی افادیت پر ہیں۔ یہ دیتے ہوئے اُن کو سمجھانا بھی ہے کہ بچوں کے لیے پرائمری تک تعلیم بے انتہا ضروری ہے۔ یہ تعلیم بچوں کی شخصیت پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ اُسے نکھارتی ہے سنوارتی ہے، اور عملی زندگی میں بھی کام آتی ہے سمجھ رہی ہو نا؟'' ماہ رخ کے ایک بار پھر آویزے کو سیدھا کرتے ہوئے مسکرا سے سجی آنکھوں سے انہیں دیکھا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ بروشر اُن عورتوں کو دینے ہیں جن کے نوزائیدہ یا چھوٹے بچے ہیں۔ انہیں ابتدائی روک تھام کے ٹیکوں کے بارے میں بتانا ہے کہ کتنے ضروری ہیں...... اور بیماریوں کی روک تھام کریں گے۔ پولیو سے بچائیں گے۔ اس کے علاوہ بچوں کے درمیان وقفے کی ضرورت پر زور دینا ہے۔''

ماہ رخ نے بروشر میز پر رکھے اور چند اور کاغذات نکالے۔

''یہ بروشر اسکولوں کے لیے ہیں۔ ان میں بچوں کے ساتھ ہونے والی جسمانی زیادتی کی روک تھام کے بارے میں مواد ہے۔ بچوں کو اپنے ارد گرد کے ماحول اور ارد گرد بسنے والے لوگوں کی حرکات و سکنات سے آگاہی دینے کے لیے اُن میں کافی چیزیں ہیں۔ آپ اُن لوگوں سے یہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو ہم اسکول میں آ کر اُن کے لیے ورکشاپ کا اہتمام بھی کر سکتے ہیں۔ اس طرح بچے جلدی سیکھ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اور یاد رکھنا ایک ماہ کے بعد مجھے مکمل رپورٹ چاہیے۔'' خواتین نے فائل ہاتھ میں لے لی۔

''اور ہاں...... گاؤں میں مرد حضرات اس بات کو پسند نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں ہم اُن کی عورتوں کو ورغلا رہے ہیں یا ان کے برعکس کچھ غلط سکھا رہے ہیں اُن سے محتاط رہنا ایسے وقت جانا جب مرد کام پر چلے جاتے ہیں۔''

وہ چاروں تھوڑا بہت اسنیکس لے کر رخصت ہوئیں تو امیر اور مغرور عورتیں باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ ماہ رخ سوچ رہی تھی کہ ابتدا میں اُس نے یہ کام صرف شغل کے لیے شروع کیا تھا۔ لیکن اب اُسے اس میں مزہ آنے لگا۔ کیا وہ اپنے بارے میں کبھی ایسا سوچ سکتی تھی کہ وہ کسی دن کسی

سنجیدہ کام میں ہاتھ ڈالے گی۔ پتہ نہیں وہ یہ سب کیوں کر رہی ہے..... کیا تلخی، محرومی اور مایوسی آہستہ آہستہ اُس کا ساتھ چھوڑ رہی ہے یا وہ اپنے گلٹی کانشس کو تھپکیاں دینے کے لیے سب کر رہی ہے۔ یا پھر ابھی بھی یہ سب شغل اور ایکسائٹمنٹ ہے اور کچھ عرصہ بعد وہ اس سے بھی بے زار ہو جائے گی۔

سہیلیوں کی غیبت عروج پر تھی کچھ سہیلیوں کا جو آج نہیں آسکیں تھیں خوب مذاق اڑایا جا رہا تھا اور ساتھ سب سے وعدہ لیا جا رہا تھا کہ انہیں نہیں بتانا کہ ہمارے اُن کے بارے میں ایسے خیالات ہیں۔ اپنی نئی اور قیمتی خریداریوں پر شیخی بگھارنے کے علاوہ شوہروں سے ملنے والے قیمتی تحائف کا ذکر بھی ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ چائے کافی اور ڈرائی فروٹ کے دور بھی چل رہے تھے۔ جبکہ بیرے سوچ رہے تھے کہ کب یہ محفل برخاست ہو اور وہ اِن بے کار باتوں سے چھٹکارا پائیں۔

☆......☆......☆

صدوری نے سب لوازمات ٹرالی میں سجا دیے۔ چاندی کے خوبصورت ٹی پاٹ میں چائے دم دے کر خوبصورت ٹی کوزی سے ڈھکا اور فضلو کے حوالے کر دیا۔ فضلو ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ جہاں رزاق ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اخبار میں مگن تھا۔

''سلام صاحب جی!'' رزاق نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ چونکہ کھانے سے انکار کر چکا تھا اس لیے چائے سرو کی جا رہی تھی۔ فضلو نے چائے بنا کر کپ اُس کے سامنے رکھا تو رزاق اخبار چھوڑ کر چائے اور خانساماں کی بنائی ہوئی چیزوں سے انصاف کرنے لگا۔

''واہ..... کرمو کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے..... کیا مزیدار چٹنی بنائی ہے..... میرا تمک تو بس اُس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔''

''جی صاحب۔'' فضلو مؤدب کھڑا تھا۔

''ایمی بے بی تیار ہے فضلو؟''

''نہیں صاحب جی..... چھوٹی بی بی کہتی ہیں اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اور انہیں ہوم ورک بھی زیادہ ملا ہے آج.....اس لیے وہ ایئرپورٹ نہیں جائیں گی۔''

''کیوں طبیعت کو کیا ہوا فضلو؟'' وہ اچانک فکر مند نظر آنے لگا

''پتہ نہیں صاحب جی.....''

''اچھا میں جاتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں۔''

چائے ختم کرنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم سے نکلا..... اُس کا رخ ایمی کے کمرے کی جانب تھا چونکہ وہ رفیق کا بچپن کا دوست تھا۔ اُسے گھر میں فیملی کے فرد کی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے وہ بلاتکلف ایمی کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ فضلو کو اُسے کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی۔ لیکن کوریڈور کے سرے پر کھڑی صدوری بے چین ہو گئی۔ وہ اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے فرش پر نظریں جھکائے کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ کتنی دیر وہ اس بے چین کیفیت میں کوریڈور میں چکر لگاتی رہی کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی اور کبھی ایمی کے دروازے کی طرف، ایک بار کھلے دروازے کے ہلتے پردے سے اس کی نظر اندر گئی۔ صوفے پر بیٹھے رزاق نے ایمی کو گود میں بٹھا رکھا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اُسے پچکار رہا تھا۔ اُس کی بیک پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر کر اُسے تسلی دے رہا تھا۔

صدوری کوریڈور کے سرے پر رکھے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ جیسے ٹانگوں میں دم نہ ہو دس منٹ بعد

رزاق باہر نکلا۔ صدوری کے پاس ذرا رُکا اور بولا۔

''میں نے بے بی کو دیکھ لیا ہے...... سر میں ذرا سا درد ہے۔ اُسے گرم دودھ کے ساتھ ٹیبلیٹ دے دو۔''

''جی صاحب جی......''

رزاق کے جاتے ہی وہ ایمی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ناک کیا تو کوئی جواب نہ آیا۔ دروازہ کھلا تھا لیکن دستک دیے بغیر جانا مناسب نہ تھا۔ ایمی منہ سے کچھ نہیں بولی لیکن اُس کی سسکیاں سن کر وہ رہ نہ سکی اور اندر داخل ہوگئی۔ پنک شیڈ میں سجے کمرے میں ایک طرف جالی کی جھالر دار مسہری پر اُلٹی لیٹی وہ رو رہی تھی۔ اُس کے براؤن خوبصورت لمبے بال مسہری سے تھوڑا نیچے جھول رہے تھے۔

''ایمی بی بی...... کیا ہوا...... کیوں رو رہی ہیں؟'' ایمی نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھا کر دیکھا اُس کے پیارے چہرے اور خوبصورت آنکھوں میں آنسو دیکھ کر صدوری کے دل پر چوٹ پڑی۔

''معاف کر دیں بی بی...... بغیر اجازت آ گئی...... لیکن آپ کے رونے کی آواز سن کر رہ نہ سکی۔'' صدوری شرمندہ تھی۔ گیارہ سالہ ایمی نے دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر آنسو پونچھے۔

''کوئی بات نہیں صدوری......'' وہ بیٹھ کر تمکنت سے بولی۔

''آج ڈیڈی اور ارسلان بہت یاد آ رہے تھے۔''

''تو پھر آپ ایئرپورٹ چلی جاتیں...... ڈیڈی خوش ہو جاتے۔'' ایمی کی پرسوچ نظریں صدوری کے چہرے پر جم گئیں۔

''اصل میں ہوم ورک زیادہ ہے۔ اور میں ڈیڈی کے آنے سے پہلے سب کچھ ختم کرنا چاہتی ہوں تاکہ سارا وقت ڈیڈی کے ساتھ گزار سکوں۔'' اُس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے متانت سے جواب دیا تو صدوری کو افسوس ہوا۔ یہ عمر جو بچوں کے ہنسنے کھیلنے اور شرارتیں کرنے کی ہوتی ہے ایمی بی بی اس عمر میں اتنی اکیلی اور خاموش رہتی تھیں جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز کھائے جا رہی ہو۔ اور بیگم صاحبہ اُس سے اتنی لاپرواہ کیوں رہتی ہیں جیسے وہ اُن کی اپنی اولاد نہ ہو...... سوتیلی بیٹی ہو۔''

ڈائننگ روم میں لمبے گرینڈ ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات سجے تھے۔ خانساماں اور اُس کا بارہ سالہ بیٹا ارشد بے پناہ مصروف تھے۔ آج صاحب پندرہ دن بعد گھر میں ناشتہ کر رہے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ صاحب کتنے خوش خوراک ہیں۔ میز پر اُن کی پسندیدہ چیزیں موجود تھیں۔ کچن میں فضلو کرمو کے ساتھ مصروف تھا اور ارشد ہر ڈش میز پر لا کر رکھنے میں اُن کی مدد کر رہا تھا۔ صدوری ایمی کے کمرے میں اُسے اسکول کے لیے تیار ہونے میں مدد دے رہی تھی۔

رفیق ناشتے کے ساتھ ساتھ اخبار کا مطالعہ بھی کر رہے تھے اور ماہ رخ کے سوالوں کا جواب بھی دے رہے تھے۔ آج ماہ رخ کو معمول سے بہت جلدی اٹھنا پڑا تھا۔ رفیق نے جلدی آفس پہنچ کر سارا حساب کتاب بھی چیک کرنا تھا اور شام کی فلائٹ پکڑنے کے لیے تیاری بھی کرنی تھی۔ کاغذات ترتیب دینے تھے۔

''یہ بھی کوئی آنا ہوا......'' ماہ رخ سرخ نشیلی آنکھوں سے رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ابھی کل شام پہنچے ہیں اور آج شام دوبارہ روانہ ہو جائیں گے۔ اس سے تو [illegible] تھا وہیں سے

انکل روانہ ہو جاتے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو ڈارلنگ...... لیکن مجبوری تھی۔ میں جہاز میں سوار ہو چکا تھا۔ اُسی دوران یہ اہم ڈیل طے ہوئی، سو مجھے اپنے سیکریٹری سے ٹکٹ کا بندوبست کرنے کا کہنا پڑا۔" رفیق نے تلا ہوا گردہ کانٹے سے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"رستے میں ہی احتشام نے سب بتایا تھا۔ کیا تم بہت زیادہ اُداس ہو رہی ہو میرے جانے سے۔" رفیق نے معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھا۔ ماہ رخ خاموش رہی۔

"اگر کہو تو کینسل کر دوں سب کچھ...... آج پہلی بار ہماری بیوی کو ہمارے واپس جانے پر شکوہ کرنا پڑا ہے تو کوئی تو بات ہوگی۔ نیا اس خاکسار کے لیے دل میں جگہ نکل آئی ہے یا......" رفیق کی آنکھوں میں شوخی بھی تھی اور طنز بھی...... ماہ رخ جل گئی۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں تو ایمی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بہت مس کر رہی ہے آپ کو شاید اسی وجہ سے چڑچڑی رہنے لگی ہے۔"

"وجوہات تو اور بھی ہو سکتی ہیں...... کاش کہ تم سوچنے کی زحمت گوارا کرو...... کبھی اُس سے بات چیت کر کے معلوم کرنے کی کوشش کرو، ویسے بائی دا وے ہماری شہزادی ہے کہاں؟" ماہ رخ جل بھن کر رہ گئی۔ لیکن اس وقت خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ رفیق تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے۔ اُس میں تو ٹھیک سے جھگڑا بھی نہیں سکتی تھی۔ تند و تیز تیروں کا تبادلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسی وقت صدوری کے ساتھ ایمی اندر آئی اور باپ کو دیکھ کر بھاگتی ہوئی اُن سے لپٹ گئی۔

"اوہ ڈیڈی...... آئی لو یو سوچ......"

"آئی لو یو ٹو مائی پرنسس......" انھوں نے اُسے پیار سے پیشانی پر بوسہ دیا اور محبت سے دیکھا۔

"جھوٹ۔" وہ روٹھ کر نیچے اتر گئی۔

"یہ کیوں کہا آپ نے ڈارلنگ......؟" رفیق حیران ہوا۔

"اگر آپ مجھے پیار کرتے ہیں تو واپس مت جائیں...... آئی مس یو...... آئی ایم سوالون۔" رفیق نے شکایتی نظروں سے ماہ رخ کی طرف دیکھا اور پھر ایمی کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں جلدی آ جاؤں گا اور آہستہ آہستہ اس طرح بزنس سیٹ کروں گا کہ مجھے صرف کبھی کبھی جانا پڑے۔"

"پرامس......" اُس نے اپنا ننھا سا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"پرامس......" رفیق کے بھاری ہاتھ نے اُسے تھام لیا۔ اور لبوں سے لگا لیا۔

اُسی وقت رزاق اندر داخل ہوا...... ایمی کی آنکھوں میں اضطراب سا جھلکا...... وہ وہاں سے ہٹ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آہا...... آج تو صبح ہی صبح چاند چڑھ گیا۔" ماہ رخ جواب تک جز بز باپ بیٹی کی گفتگو سن رہی تھی ایک دم کھل اٹھی۔

"ناشتہ کیا تم نے...... بیٹھو کیا لو گے؟" رزاق نے ایک نظر سب کا جائزہ لیا۔

"بھئی ہم تو اپنی بے بی کے پاس بیٹھیں گے۔ کچھ روٹھی روٹھی لگ رہی ہے۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے جیسے ہی اُس نے جھک کر ایمی کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً اٹھی اور اندر بھاگ گئی۔

رفیق نے حیرت سے اور ماہ رخ نے معذرت خواہانہ نظروں سے رزاق کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر خفت صاف نظر آرہی تھی۔

''آئی ایم سوری رزاق..... آج کل اسے جانے کیا ہوگیا ہے ہر ایک سے ناراض رہتی ہے چڑچڑی اور ضدی ہوگئی ہے۔ تھوڑی تھوڑی روڈ بھی ہونے لگی ہے۔ شاید رفیق اور ارسلان کو بہت مس کرنے لگی ہے۔ شاید اسکول میں کوئی مسئلہ ہو۔ آج تو اس لیے اپ سیٹ ہے کہ رفیق ابھی کل آئے ہیں اور آج وہ دوبارہ اٹلی روانہ ہورہے ہیں۔ تم مائنڈ نہ کرنا پلیز.....''

''نو پرابلم بھابی..... آپ بس یہ گرما گرم پراٹھا میری طرف بڑھایئے اور سب کچھ بھول جائیں اینڈ یو را سکل.....'' اس نے شوخی سے رفیق کی طرف دیکھا۔

''تمہارے پاؤں میں کیا چکر ہے چند دن تک نہیں سکتے گھر..... یا پھر اٹلی کی حسینائیں بھابی سے زیادہ دلکش ہیں؟'' اس نے رفیق کو آنکھ ماری۔ ماہ رخ کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی آگئی۔

''صدوری..... ایمی کا ناشتہ کمرے میں لے جاؤ۔'' رفیق نے ایک نظر رزاق پر ڈالی۔

''تم نے اپنا حلیہ کس خوشی میں تبدیل کرلیا۔ کہاں تم اور کہاں یہ فرنچ کٹ داڑھی اور مونچھیں؟''

''یار..... بس یوں ہی ایک دن خیال آگیا کہ دین کا بھی ہم پر کچھ حق ہے۔'' ماہ رخ نے بے ساختہ ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا۔

''کیوں مذاق کرتے ہو رزاق..... کیا نو سو چوہے کھا کر بلی حج کرنے چلی ہے۔''

''بھابی سچ بتائیں..... یہ فرنچ کٹ داڑھی اور مونچھیں اچھی نہیں لگ رہی اس ہینڈسم چہرے پر؟''

''وہ تو بلاشبہ اچھی لگ رہی ہیں۔ لیکن کب تک لنڈورے پھرتے رہوگے کہو تو تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈ دوں؟''

''بھابی..... آپ میری کشش اور چارم ختم کرنا چاہتی ہیں۔ بیچلر ہوں اسی لیے لڑکیاں مرتی ہیں مجھ پر..... شادی کرلی تو بس ایک ہی کھونٹے سے بندھنا پڑے گا..... پھر یہ عیاشیاں کہاں ہوں گی۔ آپ تو جانتی ہیں مجھے..... میں سادھو بندہ ہوں، آج یہاں اور کل وہاں۔''

''تم نہیں سدھرو گے..... اس باغی پر محنت کرنا چھوڑ دو کوئی فائدہ نہیں یہ نگر نگر پھرنے والا بنجارہ ہے۔ رزاق تم سہولت سے ناشتہ کرو۔ میں تیار ہونے جارہا ہوں پھر تم نے مجھے آفس ڈراپ کرنا ہے۔ ایک گاڑی ورکشاپ میں ہے۔ دوسری گاڑی میں ڈرائیور ایمی کو اسکول چھوڑے گا۔''

''لیکن رفیق یار میں تو چند منٹ میں نکلنے والا تھا۔ میری ایک بہت ضروری میٹنگ ہے اور تمہارا آفس دور ہے۔ تمہیں ڈراپ کرکے میں وقت پر نہیں پہنچ سکوں گا۔''

''اچھا.....؟ ماہ رخ فکرمندی سے بولی۔

''خیر تم جاؤ..... میں دیکھتی ہوں کیا کیا جاسکتا ہے۔'' رفیق تیار ہونے اندر چلا گیا۔

ایمی اسکول بیگ کے ساتھ آگئی اسے دیکھتے ہی رزاق نے میز پر مکا مارا۔

''ایک آئیڈیا ہے..... بھابی آپ کی گاڑی رفیق کو لے جائے گی۔ میں ایمی کو اسکول ڈراپ کردوں گا۔ وہ تو میرے راستے میں پڑتا ہے۔''

''نہیں.....'' ایمی نے بے اختیار احتجاج

گیا۔

''میں ڈیڈی کے ساتھ جاؤں گی۔'' ماہ رخ نے گھور کر ایمی کو دیکھا اور پھر مسکراتا چہرہ رزاق کی طرف موڑا۔

''تھینک یو سو مچ رزاق ...... یو آر اے لائف سیور......''

''شرمندہ مت کریں بھابی۔'' وہ انکساری کا مظاہرہ کرنے لگا۔

''نہیں ریئلی رزاق ..... تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ رفیق تو اکثر ملک سے باہر رہتے ہیں۔ تم ہمارا کتنا خیال رکھتے ہو۔ ہمیں مینی دیتے ہو۔ ایمی سے اتنا پیار کرتے ہو۔''

''آئی ایم ریئلی تھینک فل......'' پھر انہوں نے سنجیدگی سے ایمی کی طرف دیکھا۔

''ڈیڈی آج بہت مصروف ہیں ایمی وہ تمہیں نہیں لے جاسکیں گے۔ انکل کے ساتھ جاؤ اچھے بچوں کی طرح۔'' ایمی ٹھٹک کر رک گئی بے بس نظروں سے ماہ رخ کی طرف دیکھا اور مرے مرے قدموں سے رزاق کے پیچھے چل پڑی۔

'' گاڑی سے اُتر کر انکل کو تھینک یو ضرور بولنا۔'' پیچھے سے ماہ رخ کی آواز سنائی دی۔ تو ایمی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ صدوری کا دل بیٹھ گیا۔ اور ماہ رخ اندر چلی گئی۔

☆......☆......☆

وسیع و عریض لان تین مالیوں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ درمیان میں گہری سبز گھاس سے کسی مخملیں قالین کا گمان ہو رہا تھا۔ چاروں طرف خوبصورت اینٹوں سے بنی کیاریوں میں موسم کی مناسبت سے سرخ، کاسنی، زرد اور گلابی پھول ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے لہرا رہے تھے۔ سامنے برآمدے کے ستونوں کے درمیان بھی پھولوں سے سجے گملے لٹک رہے تھے۔ لان کے عین درمیان میں سفید پتھر سے بنے بڑے سے عقاب کا مجسمہ تھا۔ جس کے مختلف حصوں سے پانی دھاروں کی شکل میں گر رہا تھا۔ لان کے چاروں طرف سنگ مرمر کے بینچوں میں سے ایک بینچ پر ایمی اپنی ہتھیلی پر تھوڑی سجائے کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔

چند لمحوں میں اندرونی دروازہ کھلا اور اُس میں سے ماہ رخ برآمد ہوئی۔ اُس نے نیلی جینز کے ساتھ برائٹ ریڈ اور بلیک جرسی پہن رکھی تھی۔ بالوں کو اوپر کر کے کیچر میں جکڑا گیا تھا۔ سر پر ریڈ کیپ تھی۔ اور پاؤں میں بلیک جوگرز پیچھے سے بھنلو ایک پکنک باسکٹ کے ساتھ نمودار ہوا جسے گاڑی میں رکھنے کا حکم صادر کر کے اُس نے لان میں چاروں طرف دیکھا اور پھر تیزی سے چلتی ہوئی ایمی کی طرف بڑھی۔

''ایمی ...... تم اکیلی یہاں کیوں بیٹھی ہو...... اندر چلو...... کوئی کارٹون مووی لگا کر دیکھ لو...... یا اپنی کسی فرینڈ کو فون کرلو۔ یہاں بیٹھ کر کیوں بور ہو رہی ہو؟''

''میری کوئی فرینڈ نہیں ہے۔'' ایمی نے ایک نظر ماں کی طرف دیکھا اور دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

''ایمی تم اتنی روڈ کیوں ہوگئی ہو۔ اس طرح بولتے ہیں ماں کے ساتھ؟'' ایمی خاموش رہی تو ماہ رخ اُس کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گئی اور اس کے گرد بازو رکھ کر اسے قریب کیا۔

''ایمی ...... تمہارے ساتھ کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ...... ممی سے شیئر کرو......'' ایمی پھر بھی خاموش رہی۔

''ایمی اسکول میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر

اسکول میں کوئی بات ہوئی ہے جو تمہیں ڈسٹرب کررہی ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''ممی آپ گھر میں کب ہوتی ہیں جو میں آپ سے اپنے مسئلے شیئر کروں۔'' وہ بہت آہستہ سے بولی تو ماہ رخ نے غور سے اُسے دیکھا۔

''اِس وقت تو ہوں نا...... ابھی بتادو۔''

''ابھی بھی آپ پکنک پر جارہی ہیں۔ آپ کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوگا۔''

''بیٹا مسز ساغر نے ہم سب کے لیے پکنک ارینج کی ہے۔ جانا تو پڑے گا نا...... بہت ضروری ہے۔''

''ممی...... مجھ سے زیادہ ضروری ہے یہ پکنک؟'' ایمی نے پُرامید نظروں سے اُسے دیکھا۔ ماہ رخ نے حیران ہوکر اُسے دیکھا۔ ابھی وہ اُس کے سوال پر غور کررہی تھی کہ صدوری تیز قدموں سے چلتی اُن کے قریب آئی۔

''بیگم صاحبہ آپ کا فون ہے۔ کوئی فائقہ نام کی خاتون بات کرنا چاہتی ہیں۔''

''فائقہ......؟'' ماہ رخ حیران تھی۔ پھر وہ ایکسائیٹڈ ہوئی اور ایمی کی طرف دیکھے بغیر ہی اندر کو مڑ گئی...... ایمی کی آنکھوں میں دو آنسو اٹک گئے۔

آدھے گھنٹے کے بعد فون سے فارغ ہوکر واپس آئی تو ایمی وہیں بینچ پر بیٹھی تھی۔ ماہ رخ کو کافی دیر ہوگئی تھی۔

''میں گھر آکر تم سے بات کروں گی ایمی......'' اُس نے وہیں سے آواز بلند کرکے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ایمی نے نظر اُٹھا کر دیکھا تک نہیں۔

☆......☆......☆

فائقہ ماہ رخ کی وہ دوست تھی جو اسکول سے یونیورسٹی تک اُس کے ساتھ تھی۔ لوگ اُن دونوں کی دوستی پر حیران ہوتے تھے۔ خاص طور پر اُس کے اپنے طبقے کی وہ سہیلیاں جو نخوت اور غرور کی دولت سے مالا مال تھیں۔ اصل میں فائقہ مڈل کلاس کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو علم و حکمت کی دولت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ لیکن پیسہ کم کم ہی ان کے نصیب میں ہوتا ہے۔ فائقہ کے والدین بھی اپنے بچوں کو اچھے اسکولوں میں تعلیم دلوانے کے قائل تھے۔ اور اُس کی خاطر اپنی دوسری ضروریات کو پس پشت ڈال دینے میں قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔

اُن کی اولاد میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ فائقہ بڑی بڑی ذہین آنکھوں والی پُراعتماد لڑکی تھی۔ جس کے چہرے پر بے پناہ ملاحت تھی۔ سر پہ اسکارف لے کر اسکول آتی اور ہمیشہ شائستگی سے بات کرتی۔ اُس کا یونیفارم صاف ہوتا تھا لیکن دھل دھل کر پرانا ہو چکا ہوتا اسکول بیگ بھی اتنا عمدہ نہیں تھا جیسے اپر کلاس کی لڑکیوں کا ہوتا تھا۔ وہ اُن کی مانند باتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ہمیشہ غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرتی تھی۔ کیونکہ اِس کے پاس دوسری لڑکیوں کی طرح کے وینڈر لینڈ نہیں تھے۔ جس کی باتیں وہ کرتی تھیں۔ وہ تو کتابوں کی عاشق تھی۔ بریک میں بھی کسی نہ کسی کتاب میں سر دیے بیٹھی ہوتی۔ شروع شروع میں ماہ رخ کی سہیلیوں نے اُس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ لیکن فائقہ کے ہاتھوں منہ کی کھائی۔ اور جب رزلٹ آیا تو فائقہ ٹاپ پر تھی۔ نتیجتاً اُسے پسند کرتے تھے۔ اُس کی ساری کلاس میں دھاک بیٹھ گئی۔

ماہ رخ کو وہ شروع سے اچھی لگتی تھی۔ لیکن جب ایک بار فائقہ نے اُس کی پڑھائی میں مدد

کی۔ اور ٹیچر کے عتاب سے بچایا۔ اُس کی کی ہوئی شرارت اپنے ذمہ لے لی تو ماہ رخ نے اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھادیا۔ جسے فائقہ نے پورے خلوص سے تھام لیا کیونکہ ماہ رخ نے اپنی سہیلیوں کی طرح اُس کا بھی مذاق نہیں اڑایا تھا۔ اپر کلاس کی زیادہ تر خرابیاں اُس میں موجود نہیں تھیں۔ بلکہ وہ گم سم اپنی ذات کے حصار میں قید ایسی تنہا روح کی مانند لگتی تھی جس کے اندر بے پناہ دکھ ہوں۔ مختلف عادات اور مزاج ہونے کے باوجود دونوں کے دل مل گئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ دوستی وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی گئی۔ کالج میں بھی دونوں کے مضامین ایک تھے۔ لیکن یونیورسٹی میں فائقہ نے سائیکالوجی منتخب کی۔ یہ سبجیکٹ ماہ رخ کے بس کا نہیں تھا۔ سو اُس نے انگریزی ادب میں ماسٹرز کرنے کا ارادہ کرلیا۔ پھر بھی دونوں کی روزانہ ملاقات ہوتی۔ فائقہ ماہ رخ کے ہر راز سے واقف تھی۔ یونیورسٹی کا زمانہ ختم ہوا تو دونوں کو بچھڑنا پڑا کیونکہ فائقہ شادی کے بعد دوسرے شہر منتقل ہوگئی تھی۔ اُس کے شوہر نے ایم بی اے کیا تھا اور اچھے عہدے پر فائز تھا۔ ٹیلیفونک رابطہ قائم رہا گیا۔ فائقہ کے دو ہی بیٹے تھے اسد اور فہد..... چاروں اپنے گھر میں خوش اور زندگی سے مطمئن تھے۔

☆.....☆.....☆

آج ماہ رخ خوش تھی۔ فائقہ کی وجہ سے کھانے میں اچھا خاصا اہتمام کرڈالا۔ فائقہ اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ بچوں کے بہت اہم ٹیسٹ ہورہے تھے۔ اس لیے باپ کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ شادی اٹینڈ کرنے کے بعد اُس نے دو تین روز صرف ماہ رخ کے لیے مخصوص کیے تھے۔ ماہ رخ صبح سے مصروف تھی۔ ایمی اسکول سے آئی تو اُس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر پہلے تو حیران ہوگئی...... پھر ایکدم اُداس ہوگئی۔

''چلو بیٹا...... کھانا کھا کر کوئی اچھی سی جینز اور شرٹ پہن کر باہر آجاؤ۔''

''کیوں ممی...... کون آرہا ہے؟''

''میرے بچپن کی سہیلی...... فائقہ آنٹی آرہی ہیں۔'' ایمی ایکدم چپ ہوگئی۔ اُس کی تو کوئی دوست نہیں تھی۔ ارسلان ہی اُس کا بہترین دوست تھا اور وہ اُس سے بہت دور تھا۔

''ممی مجھے ارسلان بھائی سے بات کرنی ہے مجھے ابھی کال ملا کردیں۔'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

''پاگل ہوئی ہو ایمی...... اس وقت وہ سو رہا ہوگا۔ آدھی رات ہے وہاں...... تم جلدی کرو۔ آنٹی آنے والی ہیں۔''

''میں کپڑے نہیں بدلوں گی میں آنٹی کے سامنے نہیں آؤں گی۔ میں انہیں سلام بھی نہیں کروں گی۔ مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔ کوئی اچھا نہیں لگتا۔'' وہ کھانا بیچ میں چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ماہ رخ نے پریشانی سے اُسے دیکھا۔

''ایمی آج تم نے مجھے کوئی ہارڈ ٹائم نہیں دینا...... سن لیا۔'' اُس نے زور سے کہا تاکہ وہ سن لے۔

فائقہ بہت پُر جوش طریقے سے ملی۔ ماہ رخ بھی اُسے دیکھ کر بہت خوش تھی کھانے کے بعد دونوں لاؤنج میں آگئیں۔ فضلو نے کافی سرو کردی۔ کافی کے دوران دونوں خوشگوار موڈ میں باتیں کرنے لگیں۔

''تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے ماہ

رخ...... اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ میں تمہارے نفیس اور اعلیٰ ذوق کو شروع سے جانتی ہوں۔''

''بس یار...... یہ سب پیسے کے کھیل ہیں۔''
اُس پر ایکدم قنوطیت چھا گئی۔ اگر اپنے دل کی اولین خواہش کو چھوڑنا ہی مقدر ٹھہرا تو بدلے میں یہ سب تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ آخر دل بہلانے اور وقت کی گاڑی کھینچنے کے لیے کچھ تو چاہیے نا۔'' فائقہ نے چونک کر اس کی گیلی آنکھوں میں دیکھا۔

''تو تم ابھی تک اُسے نہیں بھولیں؟'' اُس نے تاسف سے اُسے دیکھا۔

''وہ کوئی بھولنے کی چیز ہے؟ تم خود ہی بتاؤ انصاف سے؟'' ماہ رخ کے چہرے پر گزرے ارمانوں کی دھول تھی۔ فائقہ کا رنگ ذرا بدلا۔

''تو رفیق بھائی کہاں کھڑے ہیں تمہاری زندگی میں؟ ابھی تک سمجھوتہ نہیں کیا؟''

''سمجھوتہ ہی تو ہے یار......'' ماہ رخ اپنے بالوں کی لٹ انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

''جو سمجھوتہ میرے طبقے کی ساری عورتیں شوہروں کے ساتھ کرتی ہیں۔ میں نے بھی کرلیا۔''

''تم کوشش تو کرتیں یار...... زندگی ایسے تو نہیں گزرتی۔''

''تو زندگی کون گزار رہا ہے یہاں...... زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے ہر روز ایک نیا بہانہ تراشتی ہوں۔ اب تو زندگی کو اتنا مصروف کرلیا ہے میں نے کہ اس بارے میں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا...... تم سناؤ تم تو خوش ہونا؟''

''بہت خوش ہوں ماہ رخ...... میں نے شادی کے بعد شوہر سے محبت کی ہے۔ وہ بھی مجھے چاہتے ہیں سعد اور فہد نے ہماری زندگی مکمل کردی۔''

''اسی لیے تم اور خوبصورت ہوگئی ہو...... محبت کا عکس تمہاری آنکھوں میں ستارے بن کر روشن ہے۔ تم بہت لکی ہو یار......'' فائقہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ماہ رخ اتنی آزردہ تھی کہ چپ ہوگئی۔

''تمہاری ملاقات ہوئی کبھی اُس سے...... کبھی دیکھا ہے اُسے؟'' وہ جیسے بہت دور سے بولی تھی۔

''نہیں...... اُس کے دوست نے بتایا تھا کہ تمہارے فراق میں ملک ہی چھوڑ دیا۔''

''کہاں گیا؟''

''شاید آسٹریلیا...... اسکالرشپ مل گیا تو چلا گیا۔''

''اور شادی......''

''ہاں وہ بتا رہا تھا ماں باپ کی ضد پر اپنی کزن سے شادی کرلی۔ تین بچے بھی ہیں لیکن بیوی اور بچے یہیں رہتے ہیں انہیں وہاں نہیں بلواتا۔ بس کبھی کبھی آجاتا ہے ملنے اور بس......''
صدوری برتن اٹھانے آئی تو اطلاع دی۔

''بیگم صاحبہ رزاق صاحب آئے ہیں اور اِدھر ہی آرہے ہیں۔'' صدوری کا جملہ ختم ہوتے ہی رزاق مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ فائقہ کو دیکھ کر دروازے پر ٹھٹکا اور پھر بے اختیار سیٹی بجاتا اندر داخل ہوا۔ فائقہ نے اسکارف ٹھیک کیا۔

''ہُو از دِس بیوٹی فل لیڈی؟'' اُس کی نظریں فائقہ کے چہرے سے ہوتی ماہ رخ کی طرف گئیں۔ فائقہ نے ناگواری سے اُسے دیکھا تو وہ تھوڑا سنبھلا۔

''آئی ایم سوری شاید میں آپ لوگوں کی پرائیویسی میں مخل ہوا ہوں؟''

''ارے نہیں ڈیئر...... ان سے ملو...... یہ میری بہت عزیز فرینڈ فائقہ ہے۔ اور فائقہ یہ

ہمارے فیملی فرینڈ رزاق ہیں۔ ہی از جسٹ لائیک فیملی نو اُس۔''

''بھابی اگر یہ آپ کو عزیز ہیں تو مجھے بھی عزیز رکھنا پڑے گا انہیں...... اور میں ریئلی بہت خوش ہوں آپ سے مل کر...... یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن فائقہ نے اُسے نظر انداز کر کے صرف سر کے اشارے سے جواب دینے پر اکتفا کیا۔ وہ خفت سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تو فائقہ اٹھ گئی۔

''ماہ رخ تم اپنے مہمان سے بات کرو میں ذرا آرام کروں گی۔''

''شور...... تمہارا بیڈروم ایمی کے ساتھ ہے، صدوری باہر ہی ہوگی۔ تمہیں بتادے گی۔'' اُس کے جاتے ہی رزاق پھیل کر بیٹھ گیا۔

''یہ عجوبہ کہاں سے گھیر لائی ہو یار؟''

''بکواس مت کرو...... مجھے بہت عزیز ہے وہ......''

''ویسے ہے آفت قسم کی چیز...... بہت پُرکشش...... پُروقار......''

''رزاق تم اپنا منہ بند رکھو پلیز...... ذرا بھی لائن مارنے کی کوشش تو وہ تمہیں تھپڑ مارنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ وہ کوئی ایسی ویسی نہیں ہے جن سے تم روزانہ ملتے ہو۔'' رزاق نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''خیر کتنی بھی توپ چیز ہو۔ پر ہماری بھابی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ آپ کا حسن تو آنکھوں کو خیرہ کردیتا ہے۔ جواب نہیں آپ کا، رفیق بہت خوش قسمت ہے۔''

''مکھن مت لگاؤ...... اور بتاؤ کھانا کھاؤ گے؟'' وہ اپنی تعریف پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ اور پھر صدوری کو آواز دی۔

''صدوری......'' رزاق بے مزہ ہوکر بولا۔ ''بھابی آپ کوئی خوبصورت ملازمہ نہیں رکھ سکتی تھیں۔''

''کیوں......؟ حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ کوئی اور منہ نہیں لگا رہا آج کل...... میں تو کہتی ہوں اب بھی وقت ہے شادی کرلو، زندگی آسان ہوجائے گی۔'' وہ ایکدم اپنا کوٹ پکڑ کر اٹھ گیا۔

''مجھے کچھ نہیں کھانا...... آپ کی یہ باتیں میری بھوک اڑا دیتی ہیں۔ میں چلتا ہوں ایمی سے میرا پیار کہیے گا۔'' وہ چلا گیا تو ماہ رخ کی پُرسوچ اُداس نظریں قیمتی ڈیکوریشن پیس پر جم کر رہ گئیں۔ آج کتنے سالوں بعد اُس کا ذکر آیا تھا اور وہ بے حساب یاد آرہا تھا۔

☆......☆......☆

فائقہ نے دروازے پر دستک دی۔

''آجاؤ......'' ایمی نے صدوری سمجھ کر جواب دیا۔ وہ اندر آئی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ کسی شہزادی کے کمرے سے کم نہیں تھا۔ فائقہ کو دیکھ کر وہ چونک کر بیٹھ گئی۔ اور اپنی بڑی بڑی اُداس آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ جانے یہ فائقہ کی غلط فہمی تھی یا اُسے اُن اُداس آنکھوں میں خوف کا ہلکا سا تاثر نظر آیا۔ وہ پنک کلر کے چوڑی دار پاجامے اور کرتے میں ملبوس تھی۔ براؤن بال شانوں پر بکھرے تھے۔ اور اُس کی گود میں باربی ڈول تھی۔

فائقہ نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''آپ ایمی ہو نا...... ماہ رخ کی بیٹی؟'' ایمی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں فائقہ ہوں...... فائقہ آنٹی...... آپ کی ممی کی بچپن کی دوست......'' فائقہ اِس کے

قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اور اُس کے شانوں کے گرد بازو پھیلا کر اُسے خود سے قریب کیا۔ اُس کے گال پر بوسہ دینے والی تھی کہ محسوس کیا کہ ایمی نے بہت غیر محسوس طریقے سے اُس سے پرے ہونے کی کوشش کی تھی۔ اور اُس کے جسم میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ وہ ٹھٹک گئی۔ خطرے کی گھنٹی دل میں کچھ عجیب سے انداز سے بجی۔

''ایمی بیٹا...... آپ آنٹی سے بات نہیں کریں گی۔ آپ مجھ سے ملنے بھی نہیں آئیں...... کیا بات ہے...... ناراض ہو؟''

''نہیں تو۔'' وہ بمشکل کہہ سکی اور پھر چپ ہو گئی۔

''پھر کوئی بات کرو...... اپنے اسکول کا کوئی قصہ سناؤ، اپنی کسی دوست کی کوئی بات مجھے بتاؤ۔''

''میری کوئی دوست نہیں ہے۔'' وہ سخت اُلجھن میں تھی اور اپنے ہاتھوں کی انگلیاں اضطرابی کیفیت میں مسلسل مروڑ رہی تھی۔

''آپ کو پتہ ہے...... آپ سے دو تین سال بڑے میرے دو بیٹے ہیں۔ وہ مجھ سے اتنی باتیں کرتے ہیں کہ بعض اوقات مجھے خود ہی انہیں چپ کروانا پڑتا ہے۔ ہم تینوں میں بہت دوستی ہے۔''

''اچھا......'' اُس نے بے پناہ حیرت سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں۔

''آپ حیران کیوں ہو...... کیا آپ کی ممی آپ سے زیادہ باتیں نہیں کرتیں؟ ممی سے دوستی نہیں ہے کیا؟''

''ممی تو گھر میں ہوتی ہی نہیں۔ صبح اسکول ٹائم وہ سو رہی ہوتی ہیں اور جب وہ گھر آتی ہیں تو میں سو رہی ہوتی ہوں۔'' وہ بہت اُداسی سے آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ فائقہ حیرت زدہ تھی۔ اور ساتھ ہی اس معصوم سی پیاری سی بچی کے لیے دل بھی لٹ رہا تھا۔

تھوڑی دیر اسی طرح گزر گئی۔ نفسیات کی ماہر ہونے کے ناطے فائقہ مسلسل اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایمی کا اضطراب اسی خاموشی میں بھی فائقہ نے نوٹ کیا۔ جیسے اُس کی شدید خواہش ہو کہ فائقہ اب کمرے سے چلی جائے۔ اس بچی کے ساتھ کوئی گھمبیر مسئلہ ہے فائقہ کو یقین ہو گیا۔

''بیٹا آپ اتنی خاموش کیوں رہتی ہیں۔'' ایمی نے گھبرا کر اُسے دیکھا۔

''کوئی بات کرنے والا نہیں ہے اس لیے سوچتی رہتی ہوں؟''

''کیا سوچتی ہو؟''

''مختلف چیزوں کے بارے میں۔''

''مجھے نہیں بتاؤ گی؟''

''یہ سیکریٹ ہے آنٹی...... پھر دوست نے منع کیا تھا۔''

''تم نے تو کہا تھا تمہاری کوئی دوست نہیں۔ پھر یہ کس دوست کا سیکریٹ ہے؟''

''یہ بھی سیکریٹ ہے آنٹی۔'' وہ بری طرح گھبرا گئی۔

''دوست نے کہا تھا کسی کو نہیں بتانا...... کیونکہ یہ ہم دونوں کا اسپیشل سیکریٹ ہے۔''

''ممی کو پتہ ہے؟''

''دوست نے کہا تھا ممی کو بھی نہیں بتانا اور ڈیڈی کو بھی نہیں۔'' فائقہ نے غور سے اُس کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔ اتنی سی عمر میں جانے دل پر کون سا پہاڑ جیسا بوجھ لیے پھر رہی تھی۔

"یہ دوست تمہیں اچھا...... میرا مطلب ہے پسند ہے؟"

"زیادہ پسند تو نہیں...... بالکل بھی پسند نہیں۔" وہ رک گئی اور دوبارہ انگلیاں مروڑنے لگی۔ فائقہ نے پریشانی سے پُرسوچ انداز سے اُس کی طرف دیکھا۔ دس گیارہ سال کی عمر کے لحاظ سے وہ بہت لاتعلق سی بچی تھی۔ بچوں والی خوشی باتونی پن اور کیئر فری انداز، کچھ بھی تو نہیں تھا اُن میں...... فائقہ کا دل بے انتہا دکھ رہا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے میری اس وقت کیا خواہش ہے؟" امی کچھ نہیں بولی۔ بس سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ یہ جو پیاری سی کیوٹ سی بچی امی یہاں بیٹھی ہے۔ میری بیٹی ہوتی میری اپنی بیٹی...... میں اُسے کبھی تنہا نہ چھوڑتی۔ اُس سے خوب کھیلتی، خوب باتیں کرتی، اُس کے اسکول کی باتیں سنتی...... اور جب تک اُس کی باتیں ختم نہ ہوتیں وہ چپ نہ ہوتی۔" امی نے حیرت کی زیادتی سے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

"رئیلی...... آپ سچ کہہ رہی ہیں؟"

"ہنڈرڈ پرسنٹ......"

"لیکن میری اپنی ممی تو یہ نہیں چاہتیں۔ وہ تو مجھ سے پیار بھی نہیں کرتیں۔"

"ایسا کیوں کہا آپ نے؟ آپ کو کیا پتہ ممی کتنا پیار کرتی ہیں آپ سے؟"

"اگر پیار کرتیں تو مجھے کمپنی دیتیں...... میری باتیں سنتیں...... کبھی تو میرے اسکول اور میری پراگریس کے بارے میں پوچھتیں۔" اُس کا چھوٹا سا چہرہ اُداسی سے مرجھا گیا۔

فائقہ کو بے پناہ افسوس اور دکھ ہوا۔ وہ امی کے لیے تسلی کے چند الفاظ بولنا چاہتی تھی جس سے اُس کے ننھے سے دل کو کچھ قرار اور سکون ملے لیکن اُسی وقت ماہ رخ آ گئی۔ فائقہ نے محسوس کیا اُس کے آنے سے امی دوبارہ لاتعلق اور سہمی ہوگئی بے نیازی کے خول میں سمٹ گئی۔

"تو امی سے باتیں ہو رہی ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں...... تم نے تو اپنی اتنی پیاری بیٹی سے ملوایا نہیں میں نے سوچا خود ہی مل لوں۔ اتنی پیاری بیٹی ہے تمہاری کہ میں جیلس ہو رہی ہوں کہ کاش امی میری بیٹی ہوتی۔"

"اپنی ہی سمجھ لو......" وہ خوش دلی سے بولی۔

"اور پیاری کیسے نہ ہوتی۔ آخر بیٹی کس کی ہے؟" اُس کے لہجے میں فخر تھا۔ پھر وہ امی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"امی ہوم ورک کرلیا...... اب تھوڑا آرام کرلو...... پھر تمہاری ٹیوٹر آجائے گی۔ میں اور فائقہ آنٹی کچھ دیر لاؤنج میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ٹیوٹر کے جانے کے بعد انکل رزاق آئیں گے اور تمہیں پلے لینڈ لے جائیں گے۔"

"نہیں......" امی بے اختیار کھڑی ہوگئی۔ وہ ایکدم ہی فائقہ کو ایجی ٹیٹڈ نظر آنے لگی۔

"میں نہیں جاؤں گی آپ انہیں منع کردیں میں اب بچی نہیں ہوں کہ پلے لینڈ جاؤں۔" فائقہ کو اس وقت وہ ایک بدلی ہوئی بچی لگ رہی تھی۔ خوف زدہ اور غیر محفوظ۔

"ڈونٹ بی اَن گریٹ فل امی......" ماہ رخ نے گھور کر اُسے دیکھا۔

"اتنا خیال رکھتا ہے وہ تمہارا...... اتنا پیار کرتا ہے تم سے...... پھر بھی اُن سے خوش نہیں ہوتی ہو...... روڈلی بی ہیو کرتی ہو۔"

''میں نے بس کہہ دیا ہے میں نہیں جاؤں گی اُن کے ساتھ۔''
''تم اس وقت سو جاؤ...... ہم بعد میں بات کریں گے۔'' وہ فائقہ کو لے کر باہر نکل گئی۔
دونوں لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔ ماہ رخ نے فریش کافی اور رولز کا آرڈر دے دیا۔
''ایک بات کہوں ماہ رخ؟''
''ہاں کہو......''
''ایمی بہت ناخوش اور اُداس لگتی ہے مجھے...... اس عمر میں تو بچے بہت چنچل ہوتے ہیں زندگی سے بھرپور ہوتے ہیں۔''
''ناخوش......؟'' ماہ رخ اچنبھے سے بولی۔
''ناخوش ہونے کی کیا وجہ ہے اُس کے پاس......؟ دنیا کی ہر چیز حاصل ہے اُسے...... قیمتی ملبوسات، قیمتی کھلونے، جس چیز پر ہاتھ رکھ دے مل جاتی ہے اُسے۔ اعلیٰ تعلیم اسکول میں پڑھتی ہے قیمتی گاڑیوں میں اسکول جاتی ہے۔ وہ کیسے ناخوش ہوسکتی ہے۔ اُسے اور کیا چاہیے؟''
''شاید تمہارا پیار...... تمہاری توجہ اور کمپنی......''
''نان سینس......'' ماہ رخ تیوری چڑھا کر ناگواری سے بولی۔
''ہماری سوسائٹی میں اس قسم کے چونچلے اور چوما چاٹی نہیں ہوتی فائقہ...... ماما نے ہمیں کبھی گود میں نہیں اٹھایا تھا...... پاپا کی شکل ہی کبھی کبھی نظر آتی تھی۔ وہ بس گال تھپتھپا کر آگے چلے جاتے تھے اور ہم حسرت سے دیکھتے رہ جاتے۔ ہم تو آیاؤں کے ہاتھوں پلے تھے۔ یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ یہ جذباتی مظاہرے بچوں کو کمزور کر دیتے ہیں اور معاف کرنا یہ سب مڈل کلاس کے چاؤ ہیں کہ بچوں کو سینے سے لگا کر رکھو۔ بچوں کو خود سے ڈیل کرنے کا طریقہ خود ہی سیکھنا چاہیے۔ اس طرح ہی وہ دنیا سے ڈیل کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔
''تو اسی لیے تم نے ارسلان کو کم عمری میں باہر بھیج دیا خود سے جدا کر دیا۔ تاکہ وہ بہتر طریقے سے ڈیل کرے دنیا سے...... اتنی دور کر دیا اُسے؟''
''وہ رفیق کی خواہش تھی۔ میرا ارادہ تو نہیں تھا۔ لیکن وہ چلا گیا تو میں نے سوچا ٹھیک ہی کیا...... کچھ بن تو جائے گا۔ ہر مہینے اُس سے بات ہو جاتی ہے۔''
''اور وہ خوش ہے؟''
''شروع میں بہت ڈسٹرب رہا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ بہت رویا۔ رفیق کی منتیں بھی کیں، وہاں جا کر بھی روتا رہا۔ لیکن رفیق کا خیال تھا پاکستان کی تعلیم کچھ نہیں دے سکتی۔ پھر آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گیا۔''
ماہ رخ کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ پتھر کی طرح سخت اور کسی بھی احساس سے عاری فائقہ کا دل درد سے بھر گیا۔ وہ جانتی تھی ماہ رخ نے خود کو کتنے مضبوط خول میں قید کر رکھا ہے۔ صدوری کافی لے آئی تو ماہ رخ نے خاموشی سے پلیٹ میں رول رکھ کر دیا اور چائے بنانے لگی۔
''ایمی اتنی خاموش کیوں ہے؟ ہمیشہ سے ایسی ہی ہے؟''
''ارے نہیں......'' ماہ رخ مسکرائی۔
''ایمی بہت باتونی بچی تھی۔ بہت زندہ دل اور زندگی سے پور...... حالانکہ میں نے اِس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ لیکن وہ ارسلان کی کمپنی میں خوش تھی۔ اُسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔''
ان دنوں میں نے 'ماہ رخ ہیلپ' ابھی شروع

نہیں کیا تھا۔ وہ ہر وقت میرے کان کھانے کی کوشش کرتی اور میں تنگ آ کر اُسے ارسلان کی طرف بھیج دیتی۔ ارسلان بہت شوق سے اس کی باتیں سنتا۔ پھر وہ اسکول میں گئی تو گھر آ کر جب تک پوری رپورٹ نہیں سنا لیتی اُس کی زبان نہیں رُکتی تھی۔ میں تو مجبوراً سنتی تھی۔

ارسلان کے بعد وہ صدورن کو بھی نہیں چھوڑتی تھی۔ سب ملازمین سے دوستی تھی اُس کی اور وہ بھی اُس پر جان دیتے اُن کے لیے وہ ننھی پری تھی۔ لیکن مجھے اس کا ملازمین سے گھلنا ملنا پسند نہیں تھا۔ مگر اُسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی وہ پھر بھی محبت بانٹتی رہتی۔ وہ ایک چابی والی گڑیا کی مانند تھی جب تک ازجی رہتی بولتی رہتی۔

ماہ رخ جانے کہاں کھوگئی تھی۔ شاید گزرے وقت کی بھول بھلیوں میں...... اُس کی کافی بھی یونہی ٹھنڈی پڑی تھی۔ فائقہ نے ہمدرد نظروں سے اُسے دیکھا۔

''پھر اب کیا ہوگیا...... اتنی بدل کیوں گئی؟''

''وہ آٹھ سال کی تھی جب ارسلان کو باہر بھیج دیا۔ رفیق زیادہ تر باہر رہتے ہیں۔ میں نے باقی سب چیزوں سے اُکتا کر اپنی تنظیم 'ماہ رخ ہیلپ' قائم کر لی۔ پہلے ارسلان باہر گیا پھر میں بھی زیادہ تر آفس میں رہنے لگی۔ شاید ایمی اکیلی رہ گئی۔ یا پھر ارسلان کا چلے جانا اُس نے دل پر لے لیا۔''

''اور تم نے ان حالات میں اُسے اکیلے چھوڑ دیا؟''

''میں کیا کروں یار...... میری مصروفیات ہی اتنی زیادہ ہیں...... اور پھر ہمارے گھروں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماما اور پاپا نے بھی اسی طرح کا رویہ رکھا تھا ہمارے ساتھ...... پھر میرا کام بے حد اہم ہے۔''

''ایمی سے بھی زیادہ اہم ہے۔''

''یوتو......'' وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔

''ایک بار ایمی نے بھی یہی کہا تھا۔ مگر ایمی اب بچی نہیں ہے۔ بڑی ہوگئی ہے۔ میں اُسے گود میں لیے تو نہیں پھر سکتی۔'' وہ تھوڑا جھنجلائی تھوڑی مضطرب ہوئی۔

''آئی ونڈر ماہ رخ کہ تم نے کبھی بھی اُسے گود میں لیے لیے پھرا ہوگا۔ شاید تب بھی نہیں جب اُس کی عمر اس قابل تھی کہ گود میں لیا جائے۔''

''تم ٹھیک کہتی فائقہ میں نے تو جو ماں باپ سے سیکھا وہی کیا۔''

''انسان کو دبھی کچھ سیکھتا ہے۔ اُسے خدا نے دماغ دیا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ لکیر کا فقیر بنا رہے۔ وہ خود بھی تو سوچ سکتا ہے کہ غلط کیا ہے اور ٹھیک کیا؟''

''تمہیں پتہ ہے فائقہ اگر تم میری بیسٹ فرینڈ نہ ہوتی اور میں تم سے اتنی محبت نہ کرتی تو ان باتوں کو بہت مائنڈ کرتی؟'' پھر مسکرا کر سر جھٹک کر بولی۔

''بھئی اتنے سارے کھلونے ہیں موویز ہیں پھر رزاق اکثر آ جاتا ہے۔ اُسے کمپنی دیتا ہے۔ کبھی باہر لے جاتا ہے۔ تم تو جانتی ہو رفیق کی غیر موجودگی میں اُس نے سچا دوست ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ کوئی ضرورت ہو اشارہ کرو فوراً پہنچ جاتا ہے۔ ایمی سے بہت پیار کرتا ہے۔ اکثر اُسے گھمانے لے جاتا ہے۔ اُسے کمپنی دیتا ہے۔ لیکن ایمی کا تو مزاج ہی نہیں ملتا۔ ہر وقت روڈ ہوتی ہے اُس سے...... وہ بھی میرے سامنے......''

''تم نے کبھی سوچا ایسا کیوں ہے؟''

''ناٹ ریلی......'' ماہ رخ کنفیوژ ہوئی۔

''شی از جسٹ اَن گریٹ فل......''

''ماہ رخ تمہاری بیٹی ہے وہ...... تم ایسے بی ہیو کر رہی ہو جیسے کسی اور کے بارے میں بات کر رہی ہو تمہیں اس بات کی پریشانی نہیں ہے کہ اُس کی کوئی دوست نہیں ہے۔ اس عمر میں جبکہ بچوں کی ڈھیروں سہیلیاں ہوتی ہیں۔''

''چھوڑو بھی فائقہ...... تم کن باتوں میں اُلجھ رہی ہو۔ تم مجھ سے ملنے آئی ہو یا نفسیات کا کوئی کیس حل کرنے۔''

''ایمی تمہاری بیٹی ہے...... اِس لیے مجھے اولاد کی طرح عزیز ہے۔ میں اسے گتھی کو سلجھانا چاہتی ہوں۔ اپنی تعلیم کو عملی طور پر آزما کر دیکھنا چاہتی ہوں کہ آخر اُس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ تم خوش نہیں ہو گی اگر وہ دوبارہ پہلے والی ایمی بن جائے۔'' ماہ رخ خاموش رہی۔

''رزاق کب سے تمہارا فیملی فرینڈ ہے۔ اور ابھی تک شادی کیوں نہیں کی اُس نے۔''

''رفیق کا بچپن کا دوست ہے۔ نہایت مخلص اور محبت کرنے والا...... تھوڑا کھلنڈرا اور لاپرواہ ہے۔ رفیق تو اُسے فیملی ہی سمجھتے ہیں۔''

''اور تم؟''

''یار مجھے بھی بہت عزیز ہے۔ جولی ہے گڈ لکنگ ہے ہیلپ فل ہے اُس کی کمپنی میں کوئی بور نہیں ہو سکتا۔ اکثر ایمی کو اسکول بھی ڈراپ کر دیتا ہے۔''

''کیوں تمہارا ڈرائیور چھٹیاں زیادہ کرتا ہے؟''

''نہیں تو...... وہ یہ سب اپنی خوشی سے کرتا ہے۔ میں نے کہا نا ایمی سے بہت پیار کرتا ہے بے چارہ اکیلا ہے۔ ماں باپ ہیں نہیں۔ اس لیے اکثر اِدھر ہی آ جاتا ہے۔ کبھی ناشتہ بھی اِدھر ہی کر لیتا ہے۔ ہمارے سوا اِس شہر میں کوئی نہیں اُس کا...... اس لیے ہمیں ہی اپنی فیملی سمجھتا ہے۔ اسی لیے بلا تکلف جب دل چاہے آ جاتا ہے۔''

فائقہ خاموش ہو گئی۔ کوئی گڑبڑ تھی۔ کچھ غلط تھا، جس کا ماہ رخ کو احساس نہیں تھا۔ لیکن فائقہ کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ فائقہ کو رزاق پہلی نظر میں ہی پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن شاید فائقہ کی پرورش اس انداز سے ہوئی تھی کہ وہ مردوں سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ یا پھر اُس کے اضطراب اور بے چینی کی کوئی اور وجہ تھی۔ دوسری طرف ماہ رخ ایسی سوسائٹی کی پروردہ تھی جہاں مردوں اور عورتوں کا گھلنا ملنا ایک فطری بات سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ماہ رخ کو آنکھیں بند کر کے کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

''ماہ رخ...... تمہیں ایمی کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ اُسے یوں غیروں کے ساتھ اکیلا نہیں بھیجنا چاہیے۔''

''ریلیکس یار......'' ماہ رخ نے کندھے اُچکائے۔

''ہمارے گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اِف یو ڈونٹ مائنڈ یہ تمہاری مڈل کلاس سوچ ہے جو خوامخواہ تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو۔ ایمی سے بہت محبت کرتی ہوں میں اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ اُسے اسکول میں کوئی مسئلہ ہے جو وہ مجھ سے شیئر نہیں کر رہی۔ میں اُس کے اسکول جانے کا ارادہ رکھتی ہوں جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ کیا مسئلہ ہے۔''

فائقہ خاموش ہو گئی۔ وہ کسی اور ہی رخ سے سوچ رہی تھی۔ دماغ میں کئی سوچیں اپنی جگہ بنا رہی تھیں۔ اور وہ تنہائی میں یکسوئی سے سوچ کر کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی۔ اُس نے ماہ رخ سے

معذرت کرلی۔

''اگر تم مائنڈ نہ کرو تو میں تھوڑا آرام کرلوں۔ سر میں ہلکا ہلکا درد ہے۔''

''ناٹ ایٹ آل ڈیئر...... مجھے یوں بھی شام کو اپنی ورکرز سے رپورٹ لینے آفس جانا ہے میں بھی آرام کرلوں...... تم چلو گی؟''

''ہاں ضرور میں بھی تو دیکھوں تم آخر کتنی سنجیدگی سے کام کررہی ہو۔'' فائقہ مسکرائی۔

''تو ٹھیک ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بیل بجا دینا...... صدوری حاضر ہو جائے گی۔''

کاریڈور سے گزرتے ہوئے ایک کے کمرے سے تیز میوزک کی آواز سن کر وہ ایک لمحہ کو رک گئی ماہ رخ کا کمرہ دوسری جانب تھا اور وہ کمرے میں جا چکی تھی۔ فائقہ نے ذرا سے قدم بڑھا کر اندر جھانکا۔ ایک میوزک کی تال پر بہت تیزی سے اچھل کود کررہی تھی کبھی کونے میں لٹکے پنچنگ بیگ کی طرف جاتی اور پاگلوں کی طرح اس پر مکے برساتی...... جیسے وہ کوئی ایسی چیز ہو جسے وہ مار ہی ڈالنا چاہتی ہو...... اسے اپنے گرد و پیش کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ایک جنون تھا جس کے تحت وہ تیز رفتاری سے کبھی ایروبکس کرنے لگتی۔ اور کبھی دیوانگی میں پنچنگ بیگ کی طرف بڑھتی اور اس پر مکے برسانے لگتی۔ اس نے ہاتھوں میں اسی مقصد کے لیے دستانے پہن رکھے تھے اور اس وقت فائقہ حیران رہ گئی جب اس نے ایک اسٹک اٹھائی اور بیگ پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگی۔ پھر کچھ دیر بعد بے دم ہو کر وہیں قالین پر لیٹ گئی۔ فائقہ دم بخود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس لڑکی کے دل میں غصے اور نفرت کا اک طوفان مچل رہا ہے۔ فائقہ نے سوچا۔

☆......☆......☆

''میں بہت خوش ہوں تم لوگوں سے تم نے اپنا کام ذمہ داری سے نبھایا ہے۔ اور اسکولز کے بارے میں رپورٹس تو بہت حوصلہ افزا ہیں۔ اب میں ایک ٹیم تشکیل دوں گی جو ان ورکشاپس کی تیاری کرسکے۔ مختلف سی ڈیز اور موویز کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ تم لوگوں نے بالکل پروفیشنل انداز میں اپنا کام سرانجام دینا ہے...... کہ بچے بہت نازک ہوتے ہیں۔ انہیں صرف باہر کے لوگوں سے ہی جسمانی زیادتی کا خطرہ نہیں ہوتا بلکہ گھروں میں بھی ایسے خطرات ہوسکتے ہیں۔ اسی لیے بچوں میں ان پمفلٹس کی وجہ سے شعور پیدا کریں۔ تاکہ وہ خود ہی کوئی حادثہ نہ ہونے دیں۔ اگر ذرا سا بھی خطرہ محسوس کریں تو کسی بڑے کو بتائیں ماں باپ سے رجوع کریں۔''

ماہ رخ اپنی ورکرز سے نہایت سنجیدگی سے گفتگو کررہی تھی۔ اس نے سی گرین بلیک بارڈر والی ساڑھی زیب تن کی تھی۔ بلاؤز بلیک تھا۔ کانوں میں خوبصورت بلیک نگینوں والے نفیس آویزے جھول رہے تھے۔ ساتھ والی کرسی پر فائقہ جوگیا رنگ کے خوبصورت کڑھائی والے سوٹ میں سر پر اسکارف اوڑھے بیٹھی تھی۔ ماہ رخ کی سہیلیاں کیل کانٹے سے لیس بیٹھی تھیں۔ گاہے گاہے مضحکہ خیز نظروں سے اسے دیکھ کر ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے بھی کرلیتیں۔ فائقہ سب سمجھ رہی تھی۔ لیکن زیر لب مسکراتے ہوئے وقار، تمکنت اور خود اعتمادی سے بیٹھی تھی۔ اس نے انہیں مکمل طور پر نظر انداز کررکھا تھا۔ اور پورے انہماک سے ماہ رخ کی گفتگو سن رہی تھی۔

ماہ رخ کی ہدایات اور پروگرام ختم ہوا تو ریفریشمنٹ کے بعد دونوں گاڑی میں آبیٹھیں،

تبھی ماہ رخ بولی۔

''فائقہ تم بھی چند بروشر ساتھ لے جانا اور اپنے بچوں کو دے دینا۔''

''مجھے اِن کی ضرورت نہیں ہے ماہ رخ......''

''کیوں......تمہارے دونوں بیٹے ہیں اس لیے؟'' ماہ رخ نے تیکھی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تم سے یہ کس نے کہا کہ لڑکوں کو ایسا خطرہ نہیں ہے۔'' فائقہ سنجیدہ تھی۔

''میں اس لیے کہہ رہی تھی کہ میں نے اپنے بچوں کو پہلے ہی سب فراہم کر رکھا ہے۔ اور میرے شوہر اُن دونوں سے اس معاملے میں بات چیت بھی کرتے رہتے ہیں۔''

فائقہ اُس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا تم نے بھی کوئی ایسا قدم اٹھایا ہے۔ لیکن کچھ سوچ کر خاموش رہی۔ ابھی وہ مزید تحقیق کرنا چاہتی تھی۔ شیور ہونا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

فائقہ لاؤنج کی طرف جاتے جاتے ایمی کے کمرے کے پاس رُک گئی۔ اندر سے اُس کی آواز آرہی تھی۔ کمرہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ اس لیے اُس نے جھانک کر دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بد تہذیبی ہے۔ لیکن یہ بہت ضروری تھا۔

ایمی میز کے سامنے کارپٹ پر بیٹھی تھی۔ میز پر کیک رکھا تھا۔ جس کے وسط میں موم بتی جل رہی تھی۔ پاس ہی کھلونا ٹی سیٹ سجا تھا۔ اور اِرد گرد دائرے کی شکل میں ساری باربیز رکھی تھیں۔ ایمی آہستہ آہستہ گا رہی تھی۔

''ہپی برتھ ڈے ٹو می...... ہپی برتھ ڈے ٹو ی......''

فائقہ ناک کر کے اندر آگئی۔ ایمی اُسے دیکھ کر چونکی۔ فائقہ نے دیکھا اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اُس نے بے اختیار آگے بڑھ کر اُسے بازوؤں میں چھپا لیا۔ اُس کے جسم میں لحہ بھر لرزش ہوئی پھر آہستہ آہستہ ریلیکس ہوگئی۔

''بیٹا...... رو کیوں رہی ہو؟ آج تمہاری برتھ ڈے ہے؟''

''جی آنٹی......''

''ممی کو پتہ ہے؟''

''پتہ نہیں آنٹی۔''

''بھول گئی ہوں گی تم نے یاد کروا دینا تھا نا......''

''نہیں آنٹی...... میں نہیں چاہتی ممی کو پتہ چلے۔ وہ پارٹی ارینج کریں گی۔ لوگوں کو بلائیں گی۔ اور میں نہیں چاہتی کوئی بھی آئے۔ مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔ کوئی بھی نہیں۔'' وہ بے اختیار رو پڑی۔ فائقہ کا دل بے انتہا دکھا...... اُس کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

''میں بھی اچھی نہیں لگتی؟'' ایمی بے اختیار روتے روتے اُس سے لپٹ گئی۔

''آپ ہی تو اچھی لگتی ہیں بس...... کاش آپ میری ممی ہوتیں۔'' فائقہ دم بخود رہ گئی۔

''اچھا ایسا کرتے ہیں کہ برتھ ڈے تو سیلی بریٹ کرتی ہے نا...... ممی تو ہیں نہیں گھر میں...... وہ کوئی پارٹی اٹینڈ کرنے گئی ہیں...... رات دیر سے آئیں گی۔ پتہ ہے وہ مجھے بھی لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نہیں گئی شاید یہ وجہ تھی کہ میں نے ایک ننھی پری کی سالگرہ میں شرکت کرنی تھی۔ آپ اپنا بیسٹ ڈریس پہن کر آؤ ہم کہیں باہر جا کر آپ کی سالگرہ منائیں گے۔''

''رئیلی...... آنٹی آپ سچ کہہ رہی ہیں؟'' اُس کی آنکھوں میں ستارے اتر آئے پھر فائقہ

اُسے اُس کی پسندیدہ جگہ پر لے گئی۔ اُسے اُس کی پسند کا کھانا کھلایا..... اُس کی پسند کا گفٹ دلایا۔ ساری شام دونوں پیدل ہی مختلف جگہوں پر پھرتے رہے۔ کبھی سڑکوں پر کبھی پارک میں..... کبھی شاپنگ ایریا میں ونڈو شاپنگ کی۔

اُس دن ایمی نے ارسلان اور رفیق کے بارے میں فائقہ سے ڈھیروں باتیں کیں۔ فائقہ حیران تھی کہ اُس کی باتوں میں ماہ رخ اور رزاق کا نام کہیں نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا اُس نے اپنے دل کا اصلی دکھ ابھی بھی اُس سے شیئر نہیں کیا تھا۔ رات جب دونوں تھک کر لوٹیں تو ایمی نے حسرت سے کہا۔

''آنٹی میرا دل چاہتا ہے اسی طرح ممی کے ساتھ پھرا کروں، باتیں کیا کروں۔'' فائقہ نے زمین پر بیٹھ کر اُسے گلے سے لگالیا۔

''ایک دن آئے گا ایمی جب ایسا ہوگا..... یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔''

صدوری ایک بڑا سا گفٹ پیک لے آئی اور ایمی کی طرف بڑھایا۔

''رزاق صاحب آئے تھے ایمی بی بی..... آپ نہیں تھیں تو یہ گفٹ چھوڑ گئے۔'' ایمی نے جھپٹ کر وہ گفٹ پیک پکڑا اور پوری قوت سے زمین پر دے مارا۔ اندر کچھ ٹوٹا لیکن ایمی پرواہ کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ فائقہ ساکت کھڑی دیکھتی رہی۔ اگلی صبح فائقہ نے ایمی کی برتھ ڈے کا بتایا تو وہ افسوس کرنے لگی پھر نارمل ہوگئی۔

☆......☆......☆

ڈاک سے آیا ہوا رپورٹ کارڈ ماہ رخ کے ہاتھوں میں تھا۔ اور وہ غصے سے تنے چہرے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایمی اپنی کلاس میں فیل ہوگئی تھی۔ اور کلاس ٹیچر نے ماہ رخ کو میٹنگ کے لیے بلایا تھا۔ ساتھ ہی انفارم کیا تھا کہ وہ کئی بار ایمی سے کہہ چکی ہیں کہ اپنی مدد یا فادر کو لے کر آؤ۔ مگر وہ نہیں آئیں اس لیے ڈاک کے ذریعے بھیجنا پڑا۔ ماہ رخ کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

''یہ کم بخت ٹیوٹر..... اتنی بھاری فیس دیتی ہوں اُس کو..... اور یہ رزلٹ دکھایا اُس نے ہڈ حرام کہیں کی..... یہ لوئر کلاس کی لڑکیاں ایسی ہی کام چور ہوتی ہیں۔ انہیں بس پیسے سے غرض ہوتی ہے۔ ٹیوشن فیس تو پہلی تاریخ کو چاہیے ہوتی ہے اور کام سے غرض ہی نہیں۔ آج آتی ہے تو خبر لیتی ہوں۔''

فائقہ نے افسوس سے اُسے دیکھا۔ اُسے پکا یقین تھا کہ ماہ رخ نے ایمی کی اسٹڈیز میں ذرا برابر دلچسپی نہیں لی ہوگی۔ کبھی اُس کا بیگ چیک نہیں کیا ہوگا۔ کبھی اُس کے اسکول جا کر اُس کی پروگریس یا کسی پرابلم کو ڈسکس نہیں کیا ہوگا۔ اور آج وہ ٹیوٹر کو بلیم کر رہی تھی۔ وہ اُس کی خبر لینا چاہتی تھی لیکن شام کو جب وہ آئی تو ماہ رخ حسبِ معمول غائب تھی۔ اپنے آفس میں ورکرز سے میٹنگ چل رہی تھی۔ فائقہ نے ایمی کو کمرے میں بھیجا اور ٹیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''نائلہ میڈم۔''

''یہ کیا چکر ہے نائلہ؟ تم روز ایمی کو پڑھاتی ہو، پھر وہ فیل کیسے ہوگئی؟'' نائلہ رو پڑی۔

''میرا اس میں کوئی قصور نہیں میڈم میں تو بہت کوشش کرتی تھی کہ ایمی کو محنت سے پڑھاؤں لیکن وہ توجہ نہیں دیتی تھی۔ کتاب سامنے کھول کر پنسل ہاتھوں میں لیے جانے کیا سوچا کرتی۔ میرا تو خیال ہے وہ میرے منہ سے نکلا ایک لفظ نہیں

سنتی تھی۔ اسی لیے میں نے ایمی سے کئی بار کہا کہ میں اُس کی ممی سے ملنا چاہتی ہوں۔ بات کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن ایمی نے کبھی میرا پیغام نہیں دیا۔ وہ گھر میں ہوتی ہی نہیں تھیں۔ میں کئی بار ٹیوشن ٹائم کے بعد بھی رُکی رہی لیکن وہ نہیں آئیں۔ ایک دو بار میں اپنے ابو کے ساتھ رات میں بھی آئی لیکن وہ اُس وقت بھی گھر میں نہیں تھیں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟''

''ٹھیک ہے تم جاؤ...... میں ایمی کی ممی سے بات کروں گی۔''

ماہ رخ اسکول گئی تو ٹیچر نے بھی یہی بتایا کہ ایمی جو ایک برائٹ اسٹوڈنٹ تھی۔ اب بالکل بدل گئی ہے خاموش اور لاتعلق بیٹھی رہتی ہے۔ یا سوچوں میں ڈوبی خلاؤں میں گھورتی رہتی ہے۔

ماہ رخ کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ ایمی پر غصہ آنے لگا۔

''آخر اُس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے چاہتی کیا ہے وہ...... ہر چیز تو اُسے میسر ہے پھر کس بات سے وہ اتنی افسردہ رہتی ہے۔'' وہ اسی سلسلے میں فائقہ سے مصروفِ گفتگو تھی کہ رزاق آگیا۔

''ہیلو بھابی...... کچھ پریشان لگ رہی ہیں، کوئی مسئلہ ہے؟'' فائقہ پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر اُس نے ماہ رخ کی طرف دیکھا۔ ماہ رخ نے ساری بات اُسے بتائی اور پھر مشورہ مانگا۔

''نو پرابلم بھابی...... آپ ایمی ڈیئر کو ہمارے حوالے کردیں۔ آج سے ہم اُسے پڑھایا کریں گے۔'' فائقہ کے سینے میں ایک شارپ سانس رک گئی۔ اُس نے پریشانی سے ماہ رخ کی طرف دیکھا۔

''رفیق آئیں گے تو یقیناً مجھ پر ناراض ہوں گے۔'' ماہ رخ فکرمند تھی۔

''میں نے کہا نا آپ فکر نہ کریں میں ہوں نا۔''

''آپ تو لگتا ہے بالکل فارغ ہیں مسٹر رزاق؟'' فائقہ نے طنزیہ انداز سے کہا تو ماہ رخ اور رزاق نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''ہم دوستو کے دوست ہیں مس فائقہ...... اُن کے لیے وقت اور جان دونوں دے سکتے ہیں۔''

''خوب......'' فائقہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''گویا قربانی اور عظمت کا مینار ہیں آپ؟''

''آپ مجھ سے اتنی ناراض کیوں رہتی ہیں فائقہ...... میں نے آخر کیا بگاڑا ہے آپ کا...... یا پھر کسی وجہ سے جیلس ہیں مجھ سے۔'' اس بار اُس نے فائقہ کے ساتھ مس لگانا ضروری نہ سمجھا۔

''آپ میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ میں جیلس ہوں؟''

''کون سی خوبی نہیں ہے مجھ میں۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''آزمانا شرط ہے کبھی آزما کر تو دیکھیے۔''

''ضرور آزماؤں گی...... ہوشیار رہیے گا۔''

''چیلنج دے رہی ہیں؟''

''کیوں ڈرتے ہیں چیلنج سے؟''

''رزاق حیدر آج تک کسی سے نہیں ڈرا فائقہ۔'' اُس نے فائقہ کا لفظ چبا کر کہا۔

''میں وارن کردوں آپ کو......'' فائقہ نے انگلی اُس کی طرف اٹھائی۔

''یہ میں ہی ہوں جس سے ڈرنے کی ضرورت ہے آپ کو...... اشد ضرورت۔'' کچھ ایسا تھا ان نظروں میں کہ رزاق اندر سے کانپ گیا جبکہ ماہ رخ حیرت سے اپنے دو دوستوں کے

درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔
☆......☆......☆
فائقہ بے چینی سے کروٹ بدل رہی تھی۔ رات کا آخری پہر تھا اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی دماغ میں بے پناہ سوچیں اَن گنت خدشات اور خوف تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماہ رخ پر سخت غصہ آرہا تھا۔
اتنا لاپرواہ اور اتنا بے نیاز رویہ اور وہ بھی اپنی اولاد سے' اپنے جسم کے حصے سے' دل کے ٹکڑے سے' مانا کہ وہ سوسائٹی کے اُس طبقے سے تعلق رکھتی تھی جہاں اولاد پیدا کرتے ہی آیاؤں کے حوالے کردی جاتی ہے۔ مردوں سے میل جول پر پابندی نہیں ہوتی' گھر کی طرف عورتوں کی توجہ کم ہی ہوتی ہے۔ مردوں کا بھی یہی حال ہے۔ محفل کی رونقیں...... نت نئے فیشن زر و جواہر اور دوسری قیمتی چیزیں ہی دل و دماغ پر سوار ہوتی ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ اُن کی نمائش کرنا ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے۔
یہ ٹھیک ہے کہ سب گھرانوں میں ایسا نہیں ہوتا کچھ امیر و کبیر گھرانے اپنی روایات قائم رکھتے ہیں۔ دولت کا نشہ دماغ کو نہیں چڑھتا۔
لیکن ایمی ماہ رخ کی اولاد تھی۔ اُس نے 'ماہ رخ ہیلپ' میں خود کو یوں غرق کرلیا تھا کہ اُس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دوسروں کی مدد کرنے کی عیاشی میں اپنے گھر کو نظر انداز کیا ہوا تھا۔ نظر مین تو شاید اُس نے گھر کو کبھی رکھا ہی نہیں تھا۔ بچوں کو اپنے والدین کی طرح نوکروں کے حوالے کردیا تھا۔ اُن کے کیا مسائل ہیں کیا ضرورت ہیں اس بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اُس کی ساری توجہ اپنی تنظیم اور اُس کے زیر سایہ ہونے والی تقریبات پر تھی۔ فنڈ ریزنگ کی خاطر مختلف وفود سے بات چیت کرنا۔ اپنی تنظیم کے لیے پیسے جمع کرنا ہی کام رہ گیا۔
کیا واقعی ماہ رخ کو غریب عورتوں کی مدد کرنے کی آرزو تھی؟ کیا واقعی وہ بچوں کی تعلیم کے بارے میں فکر مند تھی۔
فائقہ کو شک نہیں یقین تھا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ یہ اُس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ وہ تو بس اُس گلیمر کا شکار ہوگئی تھی جو اُس کے بدلے اُس کی زندگی میں آیا تھا۔ ورنہ غریب خواتین کو ملنے وہ خود تو کبھی نہیں گئی۔ اُن کے لیے اُن جیسی خواتین کو تنخواہ پر رکھ لیا تھا۔ بالکل اُن حکمرانوں کی طرف جو اپنے محلوں میں بیٹھ کر غریبوں کی بات تو کرتے ہیں لیکن اُن کے اندر جانا پسند نہیں کرتے۔ اُن سے ہاتھ ملانے کو اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔
ماہ رخ نے بھی اس گلیمرس لائف میں اُلجھ کر اپنی انتہائی چیز کو فراموش کردیا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر اُٹھ بیٹھی۔ اندر کمرے میں گھٹن محسوس ہوئی تو سوچا تھوڑی دیر لان میں چہل قدمی کرلے۔ کاریڈور سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گئی۔ ایمی کے کمرے سے اُس کی ہیجانی آواز سن کر دوڑ کر اندر گئی۔ وہ بیڈ پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اور خواب میں جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔
''نہیں...... نہیں...... پلیز نہیں۔''
بار بار کروٹیں بدلتے ہوئے وہ یہی الفاظ دہرا رہی تھی۔ تھوڑی دیر اسی طرح بے چین رہنے کے بعد آہستہ آہستہ خاموش ہوگئی۔ اور دوبارہ نیند کی وادیوں میں گم ہوگئی۔
فائقہ کتنی دیر کھڑی اُس کے معصوم بے چین چہرے کو دیکھتی رہی۔ جس پر جانے کس بات کی

اذیت تھی۔ پھر لان میں نکل آئی۔ کافی دیر چہل قدمی کے دوران سوچتی رہی۔ کل اُسے واپس جانا تھا۔ لیکن اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ دو روز اور رُک جائے گی۔ ایمی کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ اُسے بے حد عزیز ہوگئی تھی۔ اور اُس پر اعتماد بھی کرنے لگی تھی۔ اُس سے باتیں بھی کرنے لگی تھی۔ اُس کے بارے میں سوچتے سوچتے نیند آنے لگی تو اندر آگئی۔ صبح دیر تک سوتی رہی لیکن پھر بھی ماہ رخ سے کافی پہلے اُٹھ گئی۔

صدوری اُسے چائے دینے آئی تو فائقہ نے اُسے روک لیا۔ صدوری سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ اس گھر میں کیا ہو رہا تھا اور ایمی کو کیا پریشانی ہے۔ نوکر ہی تو گھر کے بھیدی ہوتے ہیں۔ فائقہ نے اُس سے پوچھ گچھ کی پہلے تو وہ تھوڑا خوفزدہ ہوئی اور پھر بے دھڑک سب کچھ اُسے بتا دیا۔ ایمی سے اُسے بھی پیار تھا۔ وہ بھی اُسے خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ صدوری نے فائقہ کو جو بتایا اُس سے اُسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اُس نے خود بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ جانے سے پہلے اُس کے صدوری کو چند ہدایات دیں۔

☆......☆......☆

آج 'ماہ رخ بیلپ' کا سالانہ ڈنر تھا اور ماہ رخ کی سج دھج قابلِ دید تھی۔ بلیک شیفون کی سنہری نفیس بارڈر والی ساڑھی...... خوبصورت قیمتی آویزے بے حد اسٹائلش جڑاؤ نیکلس گلے میں ڈالے وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اُس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ میک اپ پارلر والی گھر آکر کر گئی تھی۔ پاؤں میں نفیس اور نازک سنہری سینڈل تھے۔ فائقہ بے حد سنجیدگی سے اُس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر گہرا تفکر تھا۔

ماہ رخ نے اُسے انوائٹ کیا تھا۔ لیکن فائقہ نے معذرت سے کہا تھا۔

''میں اتنی جلدی جا کر کیا کروں گی۔ تمہارا تو پہلے پہنچنا ضروری ہے۔ سب کچھ دیکھنا ہے میں بعد میں آجاؤں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے...... میں تمہاری شکر گزار ہوں فائقہ تم نے تین روز اور بڑھا لیے...... میں بہت خوش ہوں تمہارے ساتھ گزرا وقت میرے لیے قیمتی سرمائے سے کم نہیں ہے۔ لیکن وقت پر پہنچ جانا...... اور پلیز کوئی ڈھنگ کی ساڑھی پہن کر آنا...... تم چاہو تو میری وارڈ روب سے کوئی بھی چیز سلیکٹ کرسکتی ہو۔''

''کیوں...... میرے لباس سے تمہیں شرمندگی ہوتی ہے۔'' وہ فوراً سنجیدہ ہوگئی۔

''اگر ایسی بات ہے تو میں نہیں جاتی۔ لیکن میں آؤں گی تو اپنے ہی کپڑے پہن کر آؤں گی۔''

''ٹھیک ہے یار...... تم وہ واحد ہستی ہو جو کبھی مجھے شرمندہ نہیں کرسکتی...... لیکن خیر تم اور تمہاری سو کالڈ ایگو...... اب ناراض نہ ہو جانا...... اور ضرور آنا......''

''اچھا میں چلتی ہوں...... وقت پر پہنچ جانا اور یہ ایمی کدھر ہے؟''

''کمرے میں ہوگی؟''

''اُفوہ...... جانے کس کی بوڑھی روح گھس گئی ہے اس لڑکی میں...... خیر تم اُسے میری طرف سے بائے بول دینا۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''

فائقہ نے تاسف سے اُسے دیکھا۔ پھر آہستہ قدموں سے چلتی ایمی کے کمرے میں آگئی۔ ایمی نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور اُٹھ کر گریٹ کیا۔

فائقہ کے ہاتھ میں چند بروشر تھے۔
''ایمی بیٹا..... یہ چند بروشر میں تمہارے لیے لائی ہوں۔ تم تھوڑی دیر میں انہیں پڑھ لو..... اتنی دیر میں میں ایک چھوٹا سا کام کر کے آؤں..... پھر ہم مل کر یہ ڈی وی ڈیز دیکھیں گے۔''
''یہ کیا ہے آنٹی.....'' اُس نے تجسس ظاہر کیا۔
''تم پڑھو گی تو پتہ چل جائے گا۔'' وہ پیار سے اُس کے گال تھپتھپا کر باہر نکل گئی۔ بیس منٹ بعد واپس آئی تو ایمی کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی جان گئی کہ وہ کنفیوژ، حیران اور کچھ شرمندہ سی ہے۔ بروشر ہاتھ میں لیے وہ سکتے کی کیفیت میں انہیں گھور رہی تھی۔ وہ اُس کے پاس بیٹھ گئی اور ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنے قریب کیا۔ پھر ڈی وی ڈی اُس کے ہاتھ میں دی۔
''اب یہ ڈی وی ڈی پلیئر میں لگاؤ اور ٹی وی آن کر دو..... اور پھر میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔''
ایمی خواب کی سی کیفیت میں اٹھی اور سب کچھ کر کے اس کے پاس بیٹھ گئی فائقہ نے اُسے حوصلہ دینے کے لیے اپنے ساتھ لگالیا۔ اور دونوں نے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمادیں۔ اُس میں بچوں کو انتہائی سادہ اور موثر انداز میں احتیاط کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ کسی کے غیر معمولی طور پر چھونے یا غیر معمولی حرکت کو بھی ممی ڈیڈی کے ساتھ شیئر کرنے کو کہا گیا تھا۔
کھیل ہی کھیل میں سنجیدہ باتیں سمجھائی گئی تھیں۔ جوں جوں ایمی دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرتے جارہے تھے۔ رنگ فق ہو رہا تھا۔ جیسے ہی پروگرام ختم ہوا وہ ضبط نہ کر سکی اور فائقہ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فائقہ اُسے بازوؤں میں لیے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اُسے تسلی دیتی رہی۔ جب ایمی آنسوؤں کے راستے دل کا غبار نکال چکی تو سیدھی ہوگئی۔
''میں نے ممی کو کئی بار بتانے کی کوشش کی تھی آنٹی..... لیکن ممی نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ کبھی اُن کا فون آجاتا..... کبھی انہیں کہیں پہنچنے کی جلدی ہوتی۔ زیادہ وقت تو وہ گھر میں نہیں ہوتی تھیں۔'' فائقہ نے اِسے گلے سے لگالیا۔
''میں تمہاری دوست ہوں۔ تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے نا.....؟'' ایمی نے اثبات میں سر ہلایا۔
''تو پھر تم مجھے کچھ بھی بتا سکتی ہو..... تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''
''لیکن..... اُس نے کہا تھا اگر میں نے ہمارا سیکریٹ کسی کو بتایا تو وہ میرا گلا کاٹ دے گا۔'' ایمی کی آنکھوں میں خوف تھا۔
''میرے اور تمہاری ممی کے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ تمہیں ہاتھ بھی لگا سکے۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔''
پھر اُس خوفزدہ بچی نے اپنے دل کا سارا درد اُس کے سامنے انڈیل دیا۔

☆......☆......☆

پارٹی عروج پر تھی جب ماہ رخ کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ نمبر دیکھ کر اُس نے جلدی سے موبائل آن کر کے کان کے ساتھ لگایا۔
''بے مروت سہیلی..... نہیں آئیں نا تم..... میں تم سے سخت ناراض ہوں۔''
''گھر کب آرہی ہو؟'' کچھ ایسا تھا فائقہ کی

آواز میں کہ وہ ٹھٹک گئی۔
''ابھی تھوڑی دیر لگے گی فائقہ..... کچھ بہت اہم گیسٹ ہیں جن سے خاص ملاقات کرنی ہے۔ پھر فنڈ ریزنگ کے سلسلے میں ایک میٹنگ ہے۔''
''میرا خیال ہے ماہ رخ تم ابھی آجاؤ۔'' فائقہ کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی۔
''اوہ فائقہ.....میں تمہیں کیسے سمجھاؤں..... مجھے سمجھ نہیں آتی.....میں اس وقت کیسے آؤں؟''
''اور مجھے سمجھ نہیں آتی ماہ رخ کہ وہ بروشر جو تم ساری دنیا کے گھروں اور اسکولوں میں تقسیم کرتی پھر رہی ہو۔ اُن میں سے ایک اپنی بیٹی کو کیوں نہیں دے سکتی تھیں؟''
فون کب سے بند ہوگیا۔ ماہ رخ وہیں فریز ہوگئی دل ایک دم بیٹھ گیا۔
''ہیلو بیوٹی فل.....'' رزاق پیچھے سے اُس کے کان میں بولا۔
''زبردست پارٹی.....'' اُس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو جوڑ کر تعریف کی۔ لیکن ماہ رخ نے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھا۔
''یار ایک بات تو بتاؤ۔'' وہ زیادہ بے تکلف ہو رہا تھا۔
''تمہارے گھر میں سب کہیں گئے ہوئے ہیں۔ پچھلے تین روز سے جا رہا ہوں۔ کوئی دروازہ ہی نہیں کھول رہا.....اینی وے..... آئی وانٹ ٹو انجوائے۔'' وہ تھرکتا ہوا چلا گیا۔ ماہ رخ نے سراسیمگی سے فائقہ کا نمبر ملانا چاہا مگر وہ بند تھا۔
''کیا بات ہے ماہ رخ۔'' اُس کی دوست مسز کاشان اُس کا چہرہ دیکھ کر چونکی۔
''آئی ایم سوری شازیہ..... وہ ایمرجنسی میں بولی۔ فائقہ کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے میرا جانا اشد ضروری ہے۔ تم گیسٹس کو دیکھ لینا اور فنڈ ریزنگ والی میٹنگ کینسل کر دینا۔'' وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ آخر فائقہ کا مطلب کیا تھا۔
''کیا ہوا تھا گھر میں..... کیا ایمی.....؟''
آج پہلی بار اُس کا دل ایمی کے لیے خوف زدہ ہوا تھا۔ آج پہلی بار ایمی کے لیے پیار جاگا تھا دل میں..... آج پہلی بار اُسے لگا تھا کہ ایمی اُس کی اولاد ہے۔ اور آج پہلی ہی بار وہ اُس کی سیفٹی کے بارے میں پریشان ہوئی تھی۔
فائقہ نے اُسے ساری بات بتائی تو ہونقوں کی مانند اُسے دیکھتی رہ گئی۔
''نہیں.....'' وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔
''نہیں..... یہ نہیں ہوسکتا..... یہ کیسے ہوسکتا ہے فائقہ.....وہ تو ہمارا دوست ہے.....ہم نے تو آنکھیں بند کر کے بھروسہ کیا تھا۔''
''یہی تو تمہاری غلطی تھی فائقہ۔''
''نہیں..... میں نہیں مانتی..... تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے..... وہ تو..... وہ تو ایمی سے اتنا پیار کرتا ہے..... وہ تو.....''
''تو تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے؟''
فائقہ بے پناہ سنجیدہ تھی۔ اسی دوران باہر ڈرائیو وے پر کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ فائقہ نے ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا وہ رزاق تھا۔ اندر اندھیرا تھا اور باہر خوب تیز روشنی اس لیے رزاق اُسے جھانکتے نہ دیکھ سکا۔
''تمہیں یقین نہیں آرہا نا..... فکر نہ کرو ابھی آجائے گا۔ یہاں اندھیرا ہے..... تم اس پردے کے پیچھے چھپ کر باہر دیکھو۔ اور یہ بیرونی دروازہ تھوڑا سا کھول دو تاکہ میں جو گفتگو کروں باہر آسانی سے سنی جاسکے۔
ماہ رخ نے دیکھا وہ رزاق کی گاڑی تھی وہ

نکل کر تیز قدموں سے اُدھر آ رہا تھا۔
''ماہ رخ...... ایمی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اُس کے ساتھ کیسی زیادتی ہو رہی ہے۔ وہ کیوں چپ ہو کر رہ گئی ہے۔ کیوں اتنی اُداس رہتی ہے۔ اور تم فکر نہ کرو میں اُس سے بھی اگلوالوں گی جس کا نام اُس نے لیا ہے۔ مجھے تو پہلے ہی اُس پر شک ہوا تھا۔ تم لوگ ہی اُس پر اندھا اعتبار کرتے تھے۔ اب آنے دو اُسے پولیس کو فون کر کے اُسے جیل نہ بھیجا تو میرا نام بھی فائقہ نہیں۔'' فائقہ اونچی آواز میں بولی تا کہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھتا رزاق ایک ایک لفظ سن سکے۔
ماہ رخ نے دیکھا۔ اُس کے قدم ایک دم رُک گئے رنگ فق ہوا اور وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔ بھاگا اور گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے گاڑی بیک کی جلدی میں دو تین گملوں کو گرایا۔ گیٹ سے ٹکرایا اور زن سے نکل گیا۔
ماہ رخ سفید چہرہ لیے قالین پر بیٹھتی چلی گئی۔ فائقہ بھی اُس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور اُس کے شانوں پر بازو پھیلایا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔
''تم خدا کا شکر کرو...... میں نے بروقت مسئلے کو شناخت کر لیا...... مجرم کو پہچان لیا...... میری ایمی سے گفتگو ہوئی ہے...... بات دور تک نہیں گئی...... ہم نقصان سے بچ گئے ہیں...... خدا نے اپنا فضل کیا ہے ہم پر......''
''میں اُسے نہیں چھوڑوں گی۔ فائقہ میں اُسے جہنم تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ اُس نے اس طرح ہمارے اعتماد کا خون کیا۔ ہم نے اپنے گھر کے دروازے اُس کے لیے کھول دیے۔ اُسے گھر کے فرد کا درجہ دیا اور اُس نے ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔ میں اُسے نہیں چھوڑوں گی۔ میں اُسے قتل کر دوں گی۔''
''اب وہ کبھی اِدھر آنے کی جرأت ہی نہیں کرے گا۔'' فائقہ دھیمے لہجے میں بولی تو ماہ رخ اُس کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فائقہ نے اُسے رونے دیا دل کا غبار نکالنے دیا۔ وہ رو رو کر تھک گئی تو سیدھی ہوئی۔
''سارا قصور میرا ہے۔ میں جو ساری دنیا کو آگاہی کا سبق دینے نکلی تھی گاؤں گاؤں گھر گھر...... سارے اسکولوں میں بروشرز بھیج کر لوگوں کو اپنے بچوں کو خبردار کرنے کی تعلیم دے رہی تھی۔ اپنے گھر اور اپنی بچی کو بھول گئی۔ میں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ یہ سب باتیں تو بس دوسرے گھروں اور دوسروں کے بچوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ میری بیٹی کے ساتھ نہیں ہوں گی۔ لیکن میں نے اپنی بیٹی کے بارے میں سوچا ہی کب تھا؟ اُسے اتنی اہمیت ہی کب دی تھی۔ وہ میری ذمہ داری کبھی رہی نہیں۔ وہ تو ملازموں کے بل بوتے پر پل رہی تھی اور میں لوگوں کی تعریفوں اور خدائی فوجداروں کی قبولیت کے تمغے سینے پر سجانے کی کوشش میں دیوانی ہو رہی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ ایمی نے مجھ سے مدد نہیں مانگی۔
وہ پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ کوئی مسئلہ ہے۔ اُس کے اسکول کی کارکردگی چیخ رہی تھی کہ جلدی کرو کوئی بات غلط ہے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اُس کی خاموشی لاتعلقی اور بے نیازی مجھے کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ رزاق سے نفرت اُس کے ساتھ گستاخی سے پیش آنا۔ اُس کے ساتھ جانے یا اُسے کمپنی دینے سے انکار کرنا یہ سب علامتیں چیخ رہی تھیں۔ چلا رہی تھیں۔ اور میں نے اپنے کان بند کر رکھے تھے۔ آنکھیں بند کر رکھی

تھیں۔ میں سمجھی وہ ان گریٹ فل ہو رہی ہے۔ مجھے تو ساری خرابیاں اپنی بیٹی میں ہی نظر آتی تھیں۔ اور وہ...... وہ بدکردار بدنیت شخص فرشتہ لگتا تھا۔ کیسے اُس نے اپنی لچھے دار باتوں سے ہمیں رام کر رکھا تھا۔

''میں کتنی بے وقوف ہوں۔ اوہ گاڈ فائقہ میں کتنی بے وقوف ہوں۔'' وہ دوبارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''میری معصوم گڑیا سی بیٹی...... کیسے خوشی سے ناچتی پھرتی تھی۔ کوئل کی طرح کوکتی تھی۔ جیسے کسی کھلونے میں چابی بھر دی ہو۔ وہ خاموش ہوگئی تو مجھے کیوں سمجھ نہ آئی فائقہ۔''

''شاید تم نے سمجھا تھا ارسلان کے جانے کی وجہ سے چپ ہے۔'' فائقہ نے اُسے تسلی دی۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے...... اصل میں اچھی ماں نہیں ہوں۔ اپنے ماں باپ کے نقش قدم پر چلنا ہی مجھے ٹھیک لگا۔ اپنے دماغ سے نہیں سوچا کہ جب میں اپنے ماں باپ کے رویے سے دکھی تھی۔ میں نوکروں میں پل کر خوش نہیں تھی۔ تو میری بیٹی کیسے خوش ہو سکتی ہے۔ میں نے کوئی سبق نہیں سیکھا اپنی محرومیوں سے اپنی ناخوش زندگی سے۔

''میں کتنی بے وقوف ہوں۔ اپنی اولاد کو نظر انداز کر کے سمجھ رہی تھی کہ اپنے ماں باپ سے بدلہ لے رہی ہوں۔ لیکن بدلہ تو میں خود سے لے رہی تھی۔ اپنی اولاد سے لے رہی تھی۔ میں بہت بری ماں ہوں۔ بہت بری...... اپنی اولاد کو تحفظ نہیں دے سکی۔ میں اپنی سوسائٹی کے بارے میں جانتے ہوئے بھی ایسی سے اتنی لاپرواہ کیوں رہی...... میں کیا کر رہی ہوں فائقہ...... میں ایک عورت ہوں۔ ایک ماں ہوں۔ میں عورت ہو کر اپنا گھر نہیں سنبھال سکی۔ بچوں کو محبت اور تحفظ نہیں دے سکی اُن سے پیار نہیں کر سکی۔ اپنے شوہر کو خود سے دور کر دیا۔ وہ ملکوں ملکوں بھٹکتا ہے کیونکہ اُسے اپنے گھر میں بیوی کی محبت حاصل نہیں...... میری زندگی کا کیا مقصد ہے؟''

''ماہ رخ ایسے واقعات صرف تمہاری سوسائٹی میں نہیں ہوتے۔ ہر طبقے کے لوگ ان چیزوں کا شکار ہوتے ہیں۔ غریبوں میں بھی، امیروں میں بھی لڑکیاں بھی اور لڑکے بھی۔ ہمیں سب کو آگاہی کا درس دینا ہے اُن معصوم کانچ کی کلیوں کی حفاظت کرنی ہے۔''

''یہ سب تمہاری وجہ سے...... فائقہ...... میں نے زندگی میں بس ایک ہی تو اچھا کام کیا ہے کہ تمہیں دوست بنایا ہے۔ تمہیں یاد ہے جب تم نے یونیورسٹی میں سائیکو جی کا سبجیکٹ لیا تھا تو میں کتنے دن ناراض رہی تھی۔ آج سوچتی ہوں ہر کام میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے۔ آج تمہاری وجہ سے میری کانچ کی نازک کلی ٹوٹنے سے بچ گئی۔''

''خدا کا احسان ہے ماہ رخ......'' فائقہ نے بات کاٹی۔

''ورنہ میری کیا حقیقت ہے مجھے حقیقت کا پتہ چلا تو میں نے صدوری سے تمہاری اجازت کے بغیر ہی کہہ دیا کہ اگر رزاق آئے تو دروازہ ہی نہ کھولے۔ وہ یہ سمجھ کر لوٹ جائے گا کہ گھر میں کوئی نہیں۔''

''اوہ مائی گاڈ...... اسی لیے وہ کہہ رہا تھا وہ باتیں۔''

''وہ کہاں ملا تمہیں؟''

''میں نے سالانہ ڈنر میں اُسے بھی انوائٹ کیا تھا۔'' وہ غصے سے بولی۔

''میں اُس کم بخت کو نہیں چھوڑوں گی۔ اگر

کبھی وہ نظر آ گیا تو اُس کا منہ نوچ لوں گی۔
میں...... میں...... اوہ خدایا۔'' پھر وہ ایکدم چپ ہوگئی۔
''کہتے ہیں عورت کا اصل مقام گھر ہے ٹھیک ہی تو کہتے ہیں عورت کا اصل کام ہی یہی ہے کہ اپنے گھر اور اپنی اولاد کو تحفظ دے۔ لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ میں 'ماہ رخ ہیلپ' کو ختم کر دوں گی۔ اب تو مجھے اُس کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میں نے لوگوں کو یہ پیغام پہنچانا ہے...... ہر صورت پہنچانا ہے میں اپنا آفس گھر منتقل کرلوں گی۔ اتنے بے شمار کمرے آخر کس مرض کی دوا ہیں...... گھر رہ کر ہر چیز پر نظر رکھوں گی اور ساتھ ساتھ کام بھی کروں گی۔ میرا اسٹاف بہت اچھا ہے۔ چاروں عورتیں بہت اچھا کام کرتی ہیں...... وہ میرا پیغام پہنچائیں گی...... میری مدد کریں گی۔ اور رفیق...... تمہارا کیا خیال ہے...... وہ اتنا برا بھی نہیں ہے۔ اُس سے دوستی کروں گی۔ لیکن سب سے پہلے مجھے اپنی بیٹی سے دوستی کرنی ہے۔ اُسے سینے سے لگانا ہے۔''
وہ دھیرے دھیرے اٹھی اور آہستہ قدموں سے چلتی ایمی کے کمرے کی طرف گئی اس کے ہر اٹھتے قدم میں محبت اور جوش تھا جیسے وہ پہلی بار بیٹی کو دیکھنے جارہی ہو کمرے میں آئی تو ایمی افسردہ سی سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر چونکی ماہ رخ نے محبت سے بازو پھیلا دیے۔ ایمی کی آنکھوں میں حیرت سی نمودار ہوئی لیکن وہ کچھ سوچے بغیر بھاگ کر اُن بازوؤں میں سما گئی۔ دونو ماں بیٹیوں کے آنسو ایک دوسرے کو بھگونے لگے۔

☆......☆......☆

وہی پرانا منظر تھا ناشتے کی میز پر ارشد بھاگ بھاگ کر مختلف شے رکھ رہا تھا۔ رفیق اچانک ہی صبح صبح پہنچ گئے تھے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ پہلے ناشتہ کرلیں۔ پھر ذرا لمبی تان کر سوئیں گے۔ اتنے دنوں کی سفر اور مسلسل کام کی تھکن اتاریں گے۔
ساتھ والی کرسی پر ماہ رخ گلابی شلوار قمیض میں تر و تازہ چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی اور رفیق کے توسٹ پر مکھن لگا رہی تھی۔ رفیق نے کچھ چونک کر اُسے دیکھا یہ پہلی بار تھی کہ وہ اُس کے لیے یہ کام کر رہی تھی ورنہ وہ اپنے ہی ناشتے میں مصروف رہتی۔
''اب میں آپ کو اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی۔ آپ کچھ ایسا کریں کہ زیادہ تر ملک میں ہی رہیں ہمارے ساتھ ہی رہیں اور اگر آپ جائیں گے بھی تو میں اور ایمی ساتھ ہی جائیں گے۔''
رفیق کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ لیکن پھر اُس نے سنجیدگی سے ماہ رخ کی طرف دیکھا۔
''کیا بات ہے...... اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو میری بیوی میرے لیے اُداس لگ رہی ہے۔'' ماہ رخ بے اختیار جھینپ گئی۔
''تو کیا تم مجھے مس کر رہی تھیں؟'' وہ حیران ہوئے اور بے یقینی سے پوچھا۔ ماہ رخ کچھ لمحے بول ہی نہ سکی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔
''تو واقعی تم مجھے مس کر رہی تھیں؟'' وہ مسکرائے۔ لیکن ابھی بھی انداز غیر یقینی تھا۔
''کیا نہیں کرنا چاہیے تھا؟'' ماہ رخ نے تھوڑا خفت زدہ چہرے سے سوال کیا۔
اب رفیق کی باری تھی خاموش رہنے کی۔ چند لمحے دونوں کے درمیان اسی طرح خاموش گزر گئے رفیق نے غور سے ماہ رخ کے چہرے کی

طرف دیکھا۔

''تو کیا میں یقین کرلوں کہ تم 'اُسے' بھول کر مجھے دل سے قبول کر چکی ہو؟'' رفیق کو چونکہ سارے حالات کا پتہ تھا اس لیے سوال کر بیٹھا۔

''ہاں رفیق...... میں نے زندگی میں بے شمار غلطیاں کی ہیں۔ بہت سے لوگوں کی دل آزاری کا باعث بنی ہوں۔ جس میں میری عزیز ترین ہستیاں بھی ہیں۔ لیکن اب نہیں...... اب ازالے کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے بہت سے اہم کام کرنے ہیں۔ اُن کے لیے مجھے آپ کے مضبوط ساتھ کی ضرورت ہے۔ اپنے لیے مجھے آپ کی ضرورت ہے اور اپنے بچوں کے لیے بھی آپ کی موجودگی کی ضرورت ہے۔'' رفیق نے بے اختیار اُس کا ہاتھ تھام لیا اور پُر جوش جذباتی انداز میں دبایا اُسی وقت ایمی اسکول کے لیے تیار ہو کر آئی۔

رفیق کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی اور پھر بھاگتی ہوئی اُس سے لپٹ گئی۔

''اوہ ڈیڈی آئی مس یو سو مچ...... آئی لو یو...... اینڈ آئی لو ممی......'' وہ رفیق سے علیحدہ ہو کر ماہ رخ سے لپٹی اور اُس کے گال کو چوم لیا ماہ رخ نے بھی جواباً ایسا ہی کیا تو رفیق کے ہاتھ سے کانٹا میز پر گر گیا۔ آج بے شمار حیرتوں کا دن تھا۔ ماہ رخ میں آنے والی تبدیلی انتہائی خوشگوار تھی۔

''ڈیڈی آج آپ مجھے اسکول چھوڑنے جائیں گے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''ضرور ڈارلنگ...... میں اور ممی دونوں ساتھ جائیں گے۔''

''ریئلی...... اوہ آئی ایم سو ہیپی ڈیڈی۔'' اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''تم جلدی سے ناشتہ کرو...... پھر ایک اور سرپرائز ہے آپ دونوں کے لیے......''

''اوہ ڈیڈی...... ابھی بتائیں...... ابھی بتائیں۔'' وہ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

''او کے...... او کے...... دو تین روز میں تمہاری گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ ہم تینوں ارسلان سے ملنے جائیں گے۔ اور چاروں خوب گھومیں گے۔ مزے کریں گے۔'' انہوں نے بے حد پیار اور محبت سے اُسے دیکھا۔

''اوہ مائی گاڈ...... اِٹ اِز اَن بیلیو ایبل...... اوہ آئی ایم سو ہیپی' ممی آئی کانٹ ایٹ اینی تھنگ...... آئی کانٹ۔''

''بیٹا ناشتہ تو تمہیں کرنا پڑے گا...... آپ کی صحت کے معاملے میں نو کمپرومائز......''

''او کے...... او کے...... لیکن ڈیڈی آج چھٹی نہ کرلوں......؟''

''نہیں بیٹا...... آج تو ڈیڈی نے اپنی چھٹی منائی ہے۔ بہت سے کام ہیں جو بہت سالوں سے ادھورے پڑے ہیں انہیں مکمل کرنا ہے۔ لمبا حساب کتاب کرنا ہے۔ اس لیے ڈیڈی کو فرصت ہی نہیں ہوگی۔'' رفیق نے شرارت سے ماہ رخ کی طرف دیکھا وہ گلابی ہو گئی۔

''آپ اسکول سے آؤ گی تو پھر ہم خوب مزے کریں گے، او کے......؟''

''او کے ڈیڈی......'' وہ چمکتی آنکھوں سے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ماہ رخ کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیل گئے۔ کبھی تو رزاق کا ذکر آئے گا اور اُسے رفیق کو ساری حقیقت بتانی پڑے گی۔ رفیق کو کتنا دکھ ہوگا شاید ماہ رخ پر بھی غصہ آئے۔ وہ اُسے ہی قصوروار گردانیں...... لیکن اُسے بہر حال سچ بتانا ہوگا۔ اب وہ اپنی نئی زندگی کی بنیاد جھوٹ پر نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ سبق اُس نے سیکھ لیا تھا۔

☆☆......☆☆

اک اور جنم داتا

بازگشت کا آغاز ہم اپنی بہت عزیز اور اعلیٰ پائے کی قلم کار ساتھی طلعت اخلاق احمد کے ایک یادگار افسانے سے کررہے ہیں۔ ساتھیو! تحریر کی روانی اور گہرائی لیے یقیناً یہ یادگار افسانہ آپ کے دل کے تار جھنجوڑ کر رکھ دے گا

صبح اٹھ کر جاب پر جانے سے پہلے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے سہی مگر ضروری کام نمٹانے کے لیے سر جھاڑ منہ پہاڑ دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگتے دوڑتے اگر آپ کو محسوس ہو کہ کوئی راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے' کوئی توجہ چاہتا ہے' آپ سے بات کرنا چاہتا ہے' اس افراتفری میں بھی آپ کی توجہ خود کی طرف کرنا چاہتا ہے' جب آپ یہ محسوس کرنے لگیں کہ وہ جو کوئی بھی ہے' آپ کی رفتار میں رکاوٹ ڈال رہا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کون ہے؟ تو یہ تنگ کرنا نہیں تو کیا ہے؟ بقول غالب..... ستانا کس کو کہتے ہیں''

بیس بائیس سال سے زندگی کے اندھے کنویں میں گھومتے گھومتے اب اتنی تھکن ہوگئی ہے کہ نہ کسی کی طرف دیکھنے کو دل چاہتا ہے نہ بات کرنے کو' نہ رک کر کسی کی سننے کا وقت ملتا ہے حالانکہ میں نہ کسی کی بیوی ہوں نہ دو چار چھوٹے یا بڑے بچوں کی ماں ہوں بلکہ میں تو ان میں سے ہوں جو دنیا میں آتے ہوئے اپنے مقدر کے بند تالے کی چابی ساتھ لانا بھول جاتی ہیں لیکن پھر بھی میرے پاس کسی انتہائی وفا شعار بیوی' کسی انتہائی محبت کرنے والی ماں اور کسی بہت گرہستن عورت کی طرح کبھی وقت نہیں ہوتا۔ ایسے میں مجھے بیس بائیس سال گزرنے کے بعد اچانک محسوس ہونا شروع ہوا کہ کوئی مجھ سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ نہیں' نہیں' کوئی مجھے تنگ کررہا ہے یا کررہی ہے' کون؟

پھر ایک دن اچانک میری اُس سے ملاقات ہوگئی۔ ''تو یہ تم تھیں؟'' میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ ذرا نہیں بدلی تھی' ویسی کی ویسی تھی۔ بیس سال پہلے ہاسٹل کے کسی کمرے میں میرے ساتھ رہنے والی لڑکی' بیس سال پہلے کہیں بچھڑ جانے والی لڑکی۔ پہلی نظر میں مجھے یہی لگا کہ وہ ویسی کی ویسی ہے' چھوٹے چھوٹے خواب دیکھنے والی' چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہونے والی' چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اداس ہونے والی' دیوار کے سائے میں بیٹھے مزدور کو باسی روٹی اور پیاز کھاتے دیکھ کر دنوں کڑھنے والی' دہکتے کوئلوں میں سیب کے بیج ڈال کر محبوب کو خواب میں دیکھنے کا جاپانی ٹوٹکہ کرنے والی' سردیوں کی کہر میں ڈوبی شام میں اندھیرے کمرے میں ہیٹر کی روشنی اور حدت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

انجوائے کرنے والی وغیرہ وغیرہ۔

وہ مجھ سے کہاں بچھڑی تھی' شاید کسی ہاسٹل میں' بازار میں' شاپنگ کرتے' جاب کی مصروفیات میں' کسی ڈاکٹر کے کلینک میں' کسی ذمے داری کے بوجھ تلے...... خدا جانے' کہاں بچھڑی تھی؟ کچھ یاد نہ آیا مگر اس پرانی' صورت آشنا' زخم آشنا' درد آشنا اور خواب آشنا لڑکی کو دیکھ کر اچھا لگا۔ اس نے شکوہ کیا کہ میں اتنی مصروف ہوگئی ہوں کہ نہ کبھی اسے یاد کیا نہ بات کرنی چاہی؟

''تم بھی تو کہیں کھو گئی تھیں۔ میں تمہیں کہاں ڈھونڈتی؟ میرے پاس بڑا وقت ہے جیسے کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈنے کے لیے؟'' میں شاید اس وقت ڈائننگ ٹیبل کا بکھراؤ سمیٹ رہی تھی اور میں نے اتنی زحمت بھی نہ کی کہ کام روک کر' ہاتھ روک کر اس سے بات کرلوں' بس میرے پاس ان جھنجلوں کا وقت ہی نہیں ہوا کرتا۔

''کیا کرتی رہتی ہو؟'' وہ کہیں سے راستہ پاکر اندر آگئی تھی۔

''وقت سے لڑتی رہتی ہوں۔''

''کیوں لڑتی ہو؟''

''یہ مجھے روندتا ہوا گزر رہا ہے تو کیا اسے پیچھے نہ دھکیلوں؟'' میں نے بگڑ کر کہا مگر میں اسے یہ نہ بتا سکی کہ اس دیو سے لڑنے اور اسے پیچھے دھکیلتے رہنے کی مشقت سے میں کیسے ہانپ جاتی ہوں۔

اس نے میری طرف غور سے دیکھا' شاید اسے میرے نقوش میں جمی بے زاری' میرا تھکا تھکا جسم اور چہرہ اور میرے پورے سراپے پر چھائی وہ تھکن نظر آئی جو گھر میں کسی اور کو نظر نہیں آتی' نہ میری ماں کو نہ بہن بھائیوں کو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک مشین صبح اٹھ کر کام شروع کردیتی ہے جو نہ تھک سکتی ہے نہ رک سکتی ہے نہ

اسے کسی مشین کی طرح آرام کی ضرورت ہے نہ تیل کی نہ محبت کی نہ نرمی سے بات کرلینے کی نہ یہ احساس دلانے کی کہ وہ ہمارے لیے کوئی وقعت بھی رکھتی ہے۔

مگر میں نے کہا نا کہ یہ زخم آشنا' یہ درد آشنا لڑکی مجھے سب سے بڑھ کر جانتی تھی۔ میرے سراپے پر نظریں ڈال کر اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔

تو بھی زلفیں کبھی سجا مالن!

باغ میں کس قدر چنبیلی ہے

اس نے اداس اور مدہم آواز میں شعر پڑھا۔ میں اپنا کام کرتے کرتے رک سی گئی۔ یہ شعر' یہ شعر تو ہم دونوں کا فیورٹ ہوا کرتا تھا۔ میں اکثر دل میں کہا کرتی دہرایا کرتی مگر پھر خود کو یہ تلقین کرنے کی فرصت بھی نہ رہی۔ آج غور کیا تو چنبیلی تو تھی مگر زلفیں......

اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں' کبھی ہم نہیں

زندگی سفاکی سے اپنے پنجے میرے دل کی طرف بڑھا رہی تھی۔

یہ بھی غنیمت ہے' تھکی ہوئی' میلی روح کو اور بجھے ہوئے دل کو زمانے سے چھپانے کا اہتمام قدرت نے خود کر رکھا ہے۔ جسم کے گھور اندھیروں چھپی ہوئی روح کو کون دیکھ سکتا ہے کہ وہ کتنی نڈھال' پژمردہ اور تھکی ہوئی ہے۔ اندھیرے نہاں خانۂ وجود میں چھپے دل کی کس کو خبر ہے کہ وہ کتنا مایوس' اکیلا اور تھکا ہوا ہے۔ زمانہ تو آپ کے لباس کو دیکھتا ہے' چہرے اور بالوں کی چمک کو دیکھتا ہے' آپ کے لہجے کی جونچالی اور اعتماد پر غور کرتا ہے' آپ اپنی گفتگو میں کتنے مثبت اور امید افزاء الفاظ استعمال کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ...... ان ساری چیزوں کو ملا کر اس نے ایک نام دے رکھا ہے 'باڈی لینگویج' اور وہ اسی سے آپ کو' آپ کے روح اور دل کے معیار اور کوالٹی کو جج کرتا ہے۔

میں نے الماری کھول کر اس کو اپنے لباس دکھائے اس خواہش کے تحت کہ شاید اس کی بجھی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں۔ آخر ہے تو وہی لڑکی۔ اچھے لباس دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو چمک آئی۔

''میرے گھر والے سمجھتے ہیں کہ مجھے اچھے لباس کی ضرورت ہے' شاید وہ یہ کر کے سمجھتے ہوں کہ ان کا ذمہ ادا ہوگیا۔'' میں نے وارڈ روب میں لٹکے خوبصورت کپڑوں کی نرماہٹ محسوس کر کے خوش ہونا چاہا مگر ہمیشہ کی طرح ناکام رہی۔'' حالانکہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی ماں سے کہوں کہ وہ مجھے کسی بازار سے تازہ دم روح' تازہ دم جسم خرید دے تو اچھا کرے۔ ہو سکے تو مجھے ایک نہ کڑھنے والا دل لا دے۔ میں ان تھکے ہوئے جسم' اس افسردہ اور نڈھال روح پر اچھا لباس لاد کر کیا کروں گی مگر میری بات کوئی نہیں سمجھ سکتا۔''

''مگر میری ماں......! میری ماں ہی کہاں ہے' میری تو صرف ایک پیدا کرنے والی ہے۔ ماں ہونا' ماں ہونے کا احساس دلانا دونوں باتوں میں فرق ہے' بہت فرق ہے۔ بعض ایسے بدقسمت ہوتے ہیں جن کی قسمت میں صرف پیدا کرنے والی آتی ہے۔ ان کی ساری زندگی اس پیدا کرنے والی میں (اپنے لیے) ایک ''ماں'' کو تلاش کرنے میں گزر جاتی ہے۔ ایک دن ان کو احساس ہوتا ہے کہ ہم اب تک جن کے ساتھ رہتے آئے ہیں' وہ لوگ ہمارے کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں۔ ہم نے غلطی سے ان کو اپنا سمجھا۔

میرے جیسی جو ہوتی ہیں' وہ کسی کی کچھ نہیں ہوتیں۔ اگر مر جائیں تو نہ کسی کا گھر اجڑتا ہے نہ دل' سو جس کو تم میری ماں کہتی ہو' اس نے پانچ اولادیں پیدا کی ہیں جن میں سے میں شاید محض ایک فرد ہوں' ایک پانچواں فرد۔''

میری بدگمانیوں پر وہ کسی مدبر کی طرح مسکرائی اور کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اسے کسی کی کوئی صفائی نہیں پیش کرنے دی۔

''میں تنگ آ چکی ہوں یہ گھسے پٹے فارمولے سن کر۔ کیا اولاد ہونا ہی جرم ہے؟ اولاد ہی والدین کو تنہا کر دیتی ہے۔ بس یہ زمانے نے طے کر رکھا ہے سو روزِ قیامت تک یہی طے ہے مگر اولاد تنہا بھی ہو سکتی ہے' کوئی یہ سوچنے اور ماننے کو تیار نہیں کہ والدین بھی کسی بچے کو تنہا کر سکتے ہیں۔ یہاں کوئی نہیں سوچتا کہ نہ میری کوئی دوست ہے نہ سہیلی ہے نہ کہیں آنا جانا ہے نہ کچھ آؤٹنگ نہ کچھ نہ کچھ۔

ہم تو گھر میں ہی پڑے رہتے ہیں دفنائے سے مگر جہاں میری بات سننے سے پہلے ہی ماتھے پر بل پڑ جائیں' یہ طے کر لیا جائے کہ یہ جو کچھ کہے گی' وہ ہمارے فائدے کی بات نہیں ہوگی اور کوئی کچھ سننے کو تیار نہ ہو' وہاں تنہائی نہیں ہوگی کیا......؟ اور ایک بات تو مجھے بتا دو ذرا کہ یہ جو بیٹی بن بیاہی رہ جاتی ہے' یہ کیا آگے چل کر ماں کی سوت یا دیورانی یا نند' بھابی کا روپ دھار لیتی ہے کہ ماں یہ سمجھنا شروع کر دے کہ یہ تو میری باقی اولادوں کی دشمن ہے' یہ تو شاید اس گھر کی دشمن ہے' یہ تو بات کرے گی تو بس اس گھر کے نقصان کی ہی کرے گی۔ اس کے برعکس بیاہی بیٹی جب آئے گی تو سسرالیوں کے' شوہر کے دوستوں کے' ان کے گھر والوں کے' ملنے جلنے والوں' رشتے داروں کے بے معنی اور طویل واقعات سنائے گی تو وہ کس قدر شوق' تندہی سے سنے جاتے ہیں حالانکہ دیکھا جائے تو ان قصوں کا آپ کے گھر' آپ کے بچوں' ان کے مستقبل' اس گھر کی بھلائی' کسی چیز کا کوئی تعلق نہیں مگر وہ بہت دل لگا کر گھنٹوں سنے جاتے ہیں مگر میری جیسی کام کی بات بھی کرے گی تو سننی بوجھ محسوس ہوتی ہے۔''

''بیاہی کے کیا کہنے' اس کے تو عیب بھی ہنر بن جاتے ہیں۔'' وہ دکھ سے ہنس کر بولی۔

''اور ہم' اپنے مقدر پر تالا لیے مجرموں کی سی زندگی گزارنے والیاں' ہمارے تو ہنر بھی عیب شمار ہوتے ہیں' سب سے بڑا عیب تو یہی کہ ہم اپنے مقدر کے تالے کی چابی خالقِ کائنات سے لینا بھول جاتی ہیں اور چابی لینے کے لیے واپس تو جایا جا سکتا ہے مگر اِدھر واپسی کی گارنٹی نہیں۔''

''تمہیں تنہائی محسوس ہوتی ہے؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا کیونکہ وہ جانتی تھی' امیں خود کے ساتھ رہنے والوں میں سے ہوں اور شاید ایسے لوگ کبھی تنہا نہیں ہوتے مگر کبھی کبھی یہ سانحہ ہو بھی جاتا ہے۔ وہ 'خود' جس کے ساتھ آپ رہ رہے ہوتے ہیں' وہ ناراض ہو کر' دلبرداشتہ ہو کر کہیں اور جا نکلتا ہے۔ ایسے آپ کی بھاگ دوڑ سے پر زندگی تنگ کر رہی ہوتی ہے۔ آپ کے پاس اس کی بات سننے کے لیے دو گھڑی رک جانے کا وقت نہیں ہوتا۔ آپ سے اتنا نہیں ہوتا کہ باغ میں ڈھیروں ڈھیر چنبیلی میں سے دو پھول توڑ کر اس کی زلفوں میں سجا دیں۔ آپ کے پاس سارے زمانے کے لیے وقت ہوتا ہے اور اس انتہائی اپنے 'خود' کے لیے وقت نہیں ہوتا تو یہ ناراض سا ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے پھر آپ کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کب آپ کے قدم تیز ہوئے' کب آپ کی رفتار ہوئی؟ کب کون کتنا پیچھے رہ گیا؟ پھر یہ ہوتا ہے کہ اس پیچھے رہ جانے والے 'خود' سے آپ اتنے دور نکل جاتے ہیں کہ اس کی طرف واپس جانے کے لیے برسوں کا سفر درکار ہوتا ہے اور زندگی آپ کو انگلی سے پکڑ کر بے دردی سے آگے کی طرف گھسیٹے جاتی ہے' گھسیٹے جاتی ہے' کچھ دیر تو آپ پیچھے مڑ مڑ کر رہ جانے والے کو دیکھتے ہیں پھر فاصلہ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک نقطے کی طرح دور کھڑے نظر آتے ہیں پھر اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ اس اچانک مل جانے والی خواب آشنا' مزاج آشنا لڑکی نے سوال کیا تھا کہ تمہیں تنہائی محسوس

ہوتی ہے؟ زندگی میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے؟''

''مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ یہ کوئی کمی ہے بھی یا نہیں مگر یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز کی حاجت مند نہ ہو کر میری جیسی لڑکیاں' بن بیاہی بیٹی ایک جہیز کی حاجت مند ضرور ہوتی ہے' ایک محرم بھائی' بھتیجا' بھانجا' کوئی محرم ایسا جس کے ساتھ عزت آبرو سے زندگی کے دن پورے ہو سکیں تو کیا بہتر نہیں کہ وہ محرم عورت' کا اپنا تین بولوں کا محرم ہو اس لیے ایک دن ویسے ہی دل کی بات کہنے کو ماں سے کہا کہ ''میرا اور آپ کا تجربہ مختلف ہے' آپ نے اڑتالیس سال باپ کی چوکھٹ پر زندگی نہیں گزاری' سو آپ میرے احساسات اور جذبات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ میرا تجرد کا تجربہ مجھے سمجھاتا کہ عورت' مرد کے بغیر' سر کے سائیں کے بغیر' مدعی کے بغیر راستے کی گرد برابر ہے۔ معاشی اعتبار سے کتنی ہی قدآور مگر سماجی کسوٹی پر کھوٹی ہو جاتی ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ عورت کے سر پر سائیں ہونا ضروری ہے۔'' یہ میں نے ویسے ہی برائے بات کہا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ واقعی ان کے احساسات اور باپ کی چوکھٹ پر زندگی گزارنے والی بیٹی کے احساسات میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے' مجھے کیا سننے کو ملا؟'' میں ذرا دیر رکی رہی ان الفاظ کو دہرانے کی ہمت لانے کو۔ اس کی اداس آنکھیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ''بہت ہی بے نیازی سے' اخبار پڑھتے ہوئے کہا گیا۔ ''ہاں' یہ بہانہ بھی اچھا ہے۔'' یوں لگا جیسے کسی نے کپڑے اتار کر چوک میں کھڑا کر دیا ہے' یوں لگا جیسے اڑتالیس سال کی خاموشی اور صبر کی تپسیا ڈوب گئی' اس کے بعد کبھی خود سے بھی اعتراف کرنے کی ہمت نہ رہی۔''

وہ اچھی' درد آشنا' زندگی کی خوب صورتیوں پر آج تک یقین رکھنے والی لڑکی میرے قریب آئی۔ میری گیلی گیلی آنکھوں میں اپنی اداس ستاروں کی سی آنکھیں ڈالیں پھر مایوسی سے ہنس کر بولی۔

''تم کیا کسی کسی کی بانہہ پکڑ کر بھاگی بھاگی جا رہی تھیں' سب کچھ قدموں تلے روند کر' یہ کہہ کر عورت کے سر پر سائیں ضروری ہے پھر تو یہ کہنا بنتا تھا۔''

''اسی کا تو دکھ ہے' جب سب کچھ قدموں تلے روند ڈالنے کا وقت تھا تو اس وقت یہ خیال بھی دل میں نہ تھا۔ اب...... اب تو زندگی کی بساط لپیٹنے کا وقت ہے' دل کو مردہ کر لینے اور ہر خواب کا گلا گھونٹ کر کسی ویرانے میں بے گور و کفن پھینک دینے کا وقت ہے اور اب...... اب تو کوئی پرانے کھنڈروں کو دیکھتا بھی نہیں تو کسی خواہش' کسی امنگ کی دھوپ میں بھیگنے کی خواہش کیا معنی؟''

''تمہیں تو بہت رنج ہوا ہوگا؟ غصہ بھی بہت آیا ہوگا؟'' وہ مزاج آشنا لڑکی بولی۔

''بہت دکھ رہا' بہت دن رہا' بہت راتیں بغیر سوئے گزریں مگر غصہ نہیں آیا اور مزے کی بات بتاؤں تمہیں' اب مجھے غصہ نہیں آتا۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔ وہ میری پھٹ پڑنے کی عادت سے واقف تھی۔ ''غصہ نہیں آتا؟'' اس نے بے یقینی سے دہرایا۔

''اس لیے کہ میں غصہ کر ہی نہیں سکتی۔'' میں نے مزہ لے کر کہا۔ ''دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگتا ہے' ہاتھ پاؤں میں سے جان کھنچ جاتی ہے' الفاظ ٹوٹنے لگتے ہیں۔'' میں نے اسے اپنی تازہ کیفیت بتائی۔

''مگر تم تو شیر کی طرح دھاڑتی تھیں' وہ...... وہ کیا ہوا؟'' اسے سخت حیرت تھی۔

''وہ شیر بہت بزدل نکلا......'' میں نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔ ''اپنے ہی ہاتھ کے پالے ہوئے بچوں کو جوان ہوتے' شیر کی طرح غراتے دیکھا تو دم دبا کر بھاگ نکلا اور مجھے جس طرح ماں اور بہن

بھائیوں نے اکیلا چھوڑ دیا' بالکل اسی طرح یہ 'شیر خان' بھی مجھے چھوڑ گیا۔''

''تو پھر تم کیا کرتی ہو تمہیں غصہ آئے تو؟''

''میں روتی رہتی ہوں گھنٹوں' اکیلے کمرے میں پڑ کر بلکہ اکثر صبح انتہائی مصروفیت کے وقت ہاتھ پر کوئی گرم قطرہ ٹپک جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید اندر کوئی رو رہا ہے۔''

''تھک گئی ہو؟'' وہ پرانی ہمدرد لڑکی ہمدردی سے بولی۔

''بہت...... بہت' تم میری تھکن کا اندازہ لگاؤ اس بات سے کہ کبھی کبھی مجھے مر جانا بہت آسان' اچھا' خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔'' میری بات سن کر اس کے چہرے پر پھیلی استہزائیہ مسکراہٹ نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میرا یقین کرو' دنیا میں تم سے زیادہ مجھے کوئی نہیں جانتا' میں جو کہہ رہی ہوں بالکل سچ کہہ رہی ہوں کسی مبالغہ کے بغیر' کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ مر جانا بھی عیاشی ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو قیامت تک یوں تھکے ماندے' بے مقصد اور تنہا جیتے' جیتے خدا جانے کیا حال ہو جاتا؟ اس لیے کبھی کبھی قدرت کے اس انتظام کی داد دینے کو بے ساختہ جاں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے' اس کو مبالغہ نہ سمجھنا' اسے اس تھکن' احساسِ زیاں اور تنہائی کی معراج اور اس کی قدوقامت کی بلندی سمجھو جس کے سامنے مجھے قبر کی تنہائی اور اندھیرا اور خاموشی کبھی کبھی بہت خوشگوار محسوس ہوتی ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی' شاید میرے لہجے کی صداقت اور میرے الفاظ کی تلخی کو face کرنے' ہضم کرنے کے لیے پھر اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اور یہ بھی تو سوچو کہ......

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

اس نے لہجے میں زبردستی بشاشت اور شرارت سمو کر مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔

میرے منہ سے برجستہ شعر ادا ہوا۔

ہم ایک مرگِ مسلسل میں زیست کرتے ہیں
پھر اس کے بعد بھی ڈرتے ہیں' مر نہ جائیں کہیں
سو یہ کتنی زیادتی ہے کہ اس کے بعد بھی ہمیں مر جانے سے ڈرایا جائے۔''

میں تھک کر ڈائننگ چیئر پر بیٹھ گئی' اپنے کندھے اور بازو دبانے لگی۔ وہ سامنے دروازے کے ساتھ ٹکی کھڑی تھی۔ کھلنڈری' بے فکر سی بائیس سال پہلے بچھڑنے والی لڑکی۔

''کیا ہوا' کندھوں میں درد ہے' دبا دوں؟'' وہ دردمندی سے بولی۔

''یہ دبانے والا درد نہیں ہے۔'' میں نے زرد چہرے کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کی۔ ''تمام رات میرے دونوں بازوؤں میں درد رہتا ہے' سینے کی ہڈیوں میں درد' معدے میں دھن سی رہتی ہے' میں نے کسی سے سنا تھا کہ یہ انجائنا کے حملے کی علامت ہوتی ہیں' تمام رات دم سادھے کسی حملے کے ڈر سے کروٹ بدلے بغیر بستر پر پڑی رہتی ہوں۔ لگتا کہ انجائنا گھات لگائے' نشانہ باندھے سرہانے کھڑا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بستر پر کوئی ذی روح نہیں اور اگر میں نے کروٹ بدلی اور اسے اپنے ہونے کی نشانی' گواہی دے دی تو وہ مجھے دبوچ لے گا۔ بقول غالب

مرنے سے نہیں ڈرتا' فقدانِ راحت سے ڈرتا ہوں

''تو گھر میں کسی کو علم نہیں کہ تم پر کیا گزرتی ہے رات بھر؟''

اس کی سادگی پر مر جانے کو دل چاہا۔ ''تم رات کی بات کرتی ہو' یہاں دن میں کوئی گھٹنوں نہیں جھانکتا ہے کہ گھر میں جو ایک مشین کام کرتی ہے' وہ کیوں رک گئی ہے؟ نہ کبھی کوئی یہ دیکھتا ہے' سوچتا ہے کہ صبح اٹھتے ہی یہ چہرہ زرد اور مرجھایا ہوا

کیوں ہے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی کیوں ہیں؟ ابھی تو آغاز ہے' ابھی تو دن کا بوجھ اس کی پیٹھ نے نہیں اٹھایا' میرے اس بے رونق چہرے سے زیادہ اچھی اور دلچسپ مصروفیات ہیں گھر والوں کے پاس اور پھر یہ تو میرا فرض ہے کہ رات میں اگر میری ماں واش روم بھی جائے تو انھوں' دیکھوں' پوچھوں اور جب تک وہ واش روم سے نکل کر واپس اپنے بستر پر نہ پہنچ جائیں' میں موجود اور بیدار رہوں مگر میری جیسی بے مصرف بنی...... میں نے تم سے کہا نا کہ میرے نہ ہونے سے نہ کسی کا گھر اجڑتا ہے نہ دل۔ ایک بہن ہے نہ ہونے کے برابر' نہ اس قابل کہ اس سے دل شیئر کیا جاسکے اس لیے کہ مزاجوں کے بے تحاشہ فرق' سوچ کی خلیج' اندازِ فکر کے تضاد نے کبھی اس رشتے کو انجوائے نہ کرنے دیا۔ مجھے کبھی یہ احساس' یہ خوشی نہیں محسوس ہوئی کہ بہن کیا ہوتی ہے؟ بہت سے سال ملک سے باہر گزار کر پاکستان میں رہنے والی ایک معمولی سرکاری ملازمت کرنے والی بہن کو وہ زمین پر رینگنے والی حشرات الارض سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی' اسے اپنی ہائی فائی سوسائٹی موو کرنے والی کزنز سے زیادہ دلچسپی ہے اور شاید اسے بھی یہ محسوس ہوتا ہو کہ اس کی کوئی بہن نہیں' شاید وہ بھی اس رشتے' اس سے حاصل ہونے والے انوکھے' سچے کھرے ذائقے سے محروم ہو' شاید نہیں بلکہ یقیناً اسے محسوس ہوتا ہوگا مگر اس میں قصور نہ اس کا ہے نہ میرا' شاید قصور مزاجوں کے اس فرق کا ہے یا شاید بچپن کے ان چھوٹے چھوٹے ان گنت واقعات کا ہے جب اسے بلاضرورت میرے اوپر ترجیح دی گئی' جب میرے نام سے خریدے جانے والے خوبصورت کپڑے مجھے اس کے جسم پر نظر آئے اور میں گھر میں' اسکول میں' ہر جگہ چپکے چپکے رویا کرتی' ایسی بہت سی چیزیں اور باتیں جو ایک دن ایک دیوار کی صورت

مجھے اپنے اور اس کے بیچ میں کھڑی نظر آئی۔ بہرحال اس دیوار کو اٹھانے والے ہمارے ماں باپ تھے کہ قدرت مگر حقیقت یہ ہے' المیہ یہ ہے کہ اس دیوار کے نیچے دل ہم دونوں کے دبے پڑے ہیں۔ اس کا بلاوجہ کا احساسِ برتری' خود کو اچھی چیز کا' اچھی بات کا حقدار سمجھنا' خود کو صحیح اور خاص سمجھنا' خود کو ہر معاملے میں اہمیت' اولیت دینا اور اس سب پر تکلیف دہ ماں کا اس کو حق بجانب اور درست قرار دینا اور اس بڑھتے ہوئے فاصلے کی خوفناکی کو نہ سمجھنا' شاید یہ وہ دیوار ہے' جس کے نیچے آج تک میں اپنے کھوئے ہوئے رشتے ڈھونڈ رہی ہوں مگر نہ ماں ملی نہ بہن اور اب محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں' کوئی بھی نہیں۔''

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

میرے کندھوں میں درد بڑھتا جارہا تھا۔ صبح کے چھ بجے تھے' سب لوگ سو رہے تھے مگر میں جو دیر تک سونے کی عیاشی سے محروم ہوں اور اب تو اس عیاشی کا ذائقہ بھی معلوم نہیں' میں بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھا دیتیں؟'' شناسا لڑکی نے تشویش سے کہا۔

''ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے مجھے اسی گھر کے کسی فرد کے ساتھ جانا ہوگا یا ابھی سے کہہ سن کر ڈاکٹر کے پاس جانے کا پلان کرنا ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے' یہاں جن کے پاس ڈاکٹروں کے نسخے اور سرٹیفکیٹ ہوں' جن کے بلڈ پریشر ہائی ہوتے ہیں' جن کو سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی کے مراحل سے گزرنا پڑے' وہی بیمار گردانے جاتے ہیں' میرے جیسے تو ڈرامے کرتے ہیں' میرے جیسے لوگوں کی تکلیف بھی ڈرامہ سمجھی جاتی ہے۔''

اس کے چہرے پر پھر مدبرانہ سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ کچھ کہنے کو تھی' شاید میری بدگمانیوں پر کچھ کہنے کے لیے اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے

اسے خاموش کرادیا۔

''آج سے دو سال قبل کسی بات پر غصہ کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میرے کان میں سمندر ایسا شور مچ رہا ہے اور جسم سے جان کھنچ رہی ہے' لگا کہ میری ٹانگیں میرا بوجھ نہیں سہار سکیں گی' میرے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں' مجھے لگا' میں چیخنا چاہتی ہوں مگر نہیں چیخ پارہی' میری ماں نے کمرے کا پنکھا آف کیا' لائٹ آف کی اور وہ جگہ چھوڑ کر چلی گئی دوسرے کمرے میں یہ دیکھے بغیر کہ اس انسانی وجود پر کیا گزر رہی ہے؟''

اس کی بے ریا آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں' اسے میرے ایک لفظ کی صداقت پر یقین نہ تھا اور وہ یقین نہ کرنے میں حق بجانب تھی' شاید مجھے بھی کوئی یہ سب کچھ اسی طرح بتاتا تو میں بھی یقین نہ کرتی' کبھی نہ کرتی اس لیے کہ ہم نے یہ فرض کرلیا کہ جو ہمارے ساتھ نہیں بیتا' وہ جھوٹ ہے' جو ہم پہ نہیں گزرا' وہ غلط ہے' دھوکہ ہے اور جو ہمارے علم میں نہیں ہے' وہ ہو ہی نہیں سکتا۔

''مجھے اس دن معلوم ہوا کہ اس گھر میں ان نام نہاد اپنوں میں میری حیثیت ایک بلی کے بچے جتنی بھی نہ تھی جسے تکلیف میں دیکھ کر راہ گیر رک جاتا ہے۔ ایک مشین کی سی وقعت بھی نہ تھی کہ جسے رکتے اور گھرر گھرر کی آواز نکالتے دیکھ کر آدمی تیل کی کپی لے کر دوڑ پڑتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دنیا بہت بے حس اور سفاک ہے' چہروں پر پڑے نقاب بے دردی سے نوچ کر پھینک دیتی ہے' رشتوں کے دامن کیسے چاک کر کے رکھ دیتی ہے۔ سمجھ میں آیا کہ سچا رشتہ بس ایک ہی ہے' خالق سے اور باقی سارے ناتے مصلحتوں کے خنجر بغل میں چھپائے لٹیرے ہوتے ہیں۔ رشتے خون سے نہیں بنتے' احساس سے بنتے ہیں' کوئی مانے نہ مانے مگر میں بضد ہوں کہ رشتے احساس سے ہیں' خون سے نہیں' خون تو صرف وقت پڑنے پر زمانے کے کٹہرے میں کھڑے ہونے کو سرٹیفکیٹ ہے مگر ضروری نہیں کہ ہر پیدا کرنے والی' ماں بھی ہو' ضروری نہیں۔''

وہ میری لمبی تقریر پر خاموش تھی مگر مجھے معلوم تھا' وہ خوش گمان لڑکی' زندگی سے' لوگوں سے امیدیں رکھنے والی خوش گمان لڑکی بہت دلگرفتہ تھی۔ میں اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنسی۔ ''اوہ کم آن یار! اس دل میں بڑے بڑے گھاؤ ہیں۔ ابھی تو تمہیں کچھ نہیں دکھایا۔'' اس نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔

''اور وجہ یہ ہے کہ میں سہہ لیتی ہوں' کسی سے نہیں کہتی' خود سے بھی کوئی نظر اٹھا کر میرے چہرے پر نہیں کرتا' یہاں کوئی دل میرے لیے دکھنے والا نہیں ہے۔''

''حوصلہ کرو' ٹینشن نہ لیا کرو۔''

''تم مجھے میرے وجود میں چھپا وہ بٹن بھی دکھا دو جسے آف کرتے ہی ٹینشن ختم ہوجائے۔'' مجھے غصہ آنے لگا۔ ''یہ اسٹریس اور ٹینشن کوئی انعام ہے' کوئی تحفہ ہے جسے میں لینے کی شوقین ہوں' جھپٹ لینے کو تیار رہتی ہوں کہ کوئی دوسرا نہ لے لے اور میں محروم رہ جاؤں؟''

وہ نادم سی سر جھکائے کھڑی تھی۔

''اچھی لڑکی......!'' میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ ''دیکھو' میرا یقین کرو' میں جینا چاہتی ہوں' خوش رہنا چاہتی ہوں' میں رات دیر تک جاگ کر صبح دیر تک سونے کی عیاشی کر کے خوش رہ سکتی ہوں۔ اچھا تم مجھے بتاؤ کہ مجھے کوئی دوسرا جنم ملنے والا ہے جس میں مجھ پر ذمے واریوں کا بوجھ نہ ہوگا جس میں' میں بے حس ہوں گی' خودغرضی کی دولت سے مالا مال۔ کیا میرے اوپر بڑھاپے' ضعف کی بجائے جوانی آنے والی ہے؟ سو یہ دن میں جیسے کیسے کڑھ کڑھ کر' جل کر اپنی ذہنی اور روحانی تنہائی کے عذاب میں سلگ کر گزار

لوں کہ آ گئے اچھے دن آنے والے ہیں؟ نہیں میری اچھی سہیلی......! یہ میری زندگی کے سب سے اچھے خوبصورت اور نایاب، کبھی نہ لوٹ کر آنے والے دن ہیں اور بس اپنے آخری دموں پر ہیں۔ (زندگی کی نصف صدی گزر چکی ہے) پھر یہ کبھی نہ ہوں گے کہیں نہ ہوں گے، میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے ایک ایک لمحے کو جی لوں، امر کر لوں مگر

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غمِ روزگار کے

یہ لوگ، یہ زمانہ، یہ گھر والے جو ہماری زندگیوں کے سب سے خوبصورت اور کبھی نہ لوٹ کر آنے والے، بے فکری کے زمانوں کو کھا جاتے ہیں۔ خدا جانے، ان کو اس کا احساس بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ خدا جانے، قدرت کبھی ان سے احتساب بھی کرے گی یا نہیں؟ اور چلو، کر بھی لے احتساب تو کیا...... کیا گزرے زمانے پلٹ آئیں گے؟ مجھے اپنے جسم کے تھک جانے کا افسوس نہیں، مجھے اپنی روح کے تھک جانے کا دکھ اور دل کے بجھ جانے کا افسوس رہتا ہے۔ کیا ہم محبت کے دو بول کی بھی مستحق نہیں ہوتیں؟ کیا ہم تقدیر سے یہ کہہ کر دنیا میں آتی ہیں کہ ہمارے لیے کبھی دروازہ نہ کھولنا؟ زمانہ بہت بے حس ہے، یہ کبھی تمہیں شاباشی نہیں دے گا کہ تم نے عزت و آبرو سے وقت گزار دیا۔ ارے، زمانے کو کون پوچھتا ہے، یہ اپنے گھر والے، یہ کبھی حرفِ تحسین نہ کہیں گے کہ چلو، اس بے راہ رو زمانے میں تم نے اچھی نبھا دی۔ لوگ تو یہ سوچتے ہیں کہ اسی کم بخت میں کشش ہوتے، کوئی کرج ہوتی، ہاتھ پاؤں ہلانے کی صلاحیت ہوتی تو اپنی نیا نکال لے جاتی۔ میں نے تم سے کہا نا کہ میری جیسی باپ کی چوکھٹ پر پڑی ہوئی کے تو ہنر بھی عیب ہوتے ہیں اس لیے کہ ہمیں قدرت نے وہ چادر نہیں دی ہوتی کہ جس کے نیچے عیب بھی ہنر دکھتے ہیں۔"

"دیکھو، جب کوئی قدر نہیں کرتا تو خود اپنی قدر کروائی جاتی ہے۔ تم خود اپنی قدر نہیں کرتیں۔" اس نے شکوہ سا کیا۔ "جب تم بیک وقت مرد اور عورت کا روپ دھار لو گی تو نہ مردوں والی مراعات لے سکتی ہو اور عورت پن سے بھی گئیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو، شاید زندگی کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر دوڑنے کی کوشش کرتے کرتے یہ بھی یاد نہ رہا کہ...... کچھ بھی یاد نہ رہا، کبھی کبھی دل چاہتا ہے......" میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کہوں، کس طرح اسے سمجھاؤں کہ مجھے بے حس نہ سمجھو، مجھے زندگی کی خوب صورتیوں کا احساس ہے، ان کے اوجھل ہونے کا، شام کے سائے گہرے ہونے کا احساس ہے۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ بہت بے فکری ہو، اوڑھنے، پہننے، جینے اور ہنسنے کی خواہش کہیں دبی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی سسک کر کروٹ لیتی ہے، اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے مگر میں اس بجھے ہوئے انسانوں سے، رشتوں سے مایوس دل کو کیسے آمادہ کروں، کیسے باور کراؤں کہ دیکھو، زندگی بہت خوب صورت اور نایاب ہے، جب بھی میں اسے یہ کہتی ہوں یہ ایسی نظروں سے مجھے دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو 'زندگی خوبصورت ہے، نایاب! تمہارے لیے......' مجھے اپنے دل سے، اپنی روح سے شرمندگی ہوتی ہے کہ میں ان کا حق ادا نہ کر سکی۔ ان کے حصے کی زندگی دوسرے لوگ جی رہے ہیں اور وہ منہ دیکھتے ہیں۔"

"تمہیں کبھی اپنا خیال آتا ہے؟"

وہ بیس بائیس سال کے بعد اچانک ملی تھی اور یہ بچھڑ کر ملنے والے بڑے سفاک ہوتے ہیں، اپنی غیر موجودگی میں لگنے والے ہر زخم، ہر گھاؤ کی تفصیل مانگتے ہیں، ہر زخم کی گہرائی کا جائزہ لینے کے لیے قدرت کے لگائے ہوئے پھائے اتار پھینکتے ہیں اور یوں اپنے "ہمدم دیرینہ" ہونے کا خراج وصول کرتے ہیں۔

"تمہیں کبھی اپنا خیال آتا ہے؟" مجھے کام میں

مگن دیکھ کر اس نے سوال دہرایا۔

عشق نے سیکھ لی ہے وقت کی تقسیم کہ اب
تو مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

میں پرانی' بدرنگ ڈائننگ چیئرز کی ڈسٹنگ کر رہی تھی۔ ''ساری زندگی باپ کے منہ سے سنا کہ یہ میرا گھر ہے' یہاں وہ ہوگا جو میں چاہوں گا' سو کبھی اپنی خواہش' اپنی مرضی سے اپنے گھر میں کچھ نہ کر پائی۔ اب کہتی ہوں تو ماں کہتی ہے کہ میرے مرنے کے بعد جو دل چاہے کرنا' جس پرانی چیز کو پھینکنا چاہو' پھینک دینا۔ انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ اُس وقت جب زندگی کی بساط لپیٹنے کا وقت ہوگا' شام کے سائے گہرے ہو کر اور جھک آئیں گے' اس وقت ایک ٹوٹی پھوٹی بوڑھی روح نئی چیزیں لے کر کیا کرے گی؟ کسی کو اس حقیقت کا ادراک نہیں کہ جب میری زندگی اسی گھر میں گزر رہی ہے اور کوئی change نہیں اور ایک نام نہاد' سو کالڈ جوانی کا بوجھ میری پیٹھ پر لدا ہوا ہے تو دل کے خوش کرنے کو اسی ماحول میں تبدیلیاں کر کے خوش ہو جانا کوئی ایسی بری بات تو نہیں مگر وہ میری جیسی بیٹی کو کچھ سمجھیں تب نا' زندگی پر ہمارے جیسوں کا کوئی حق سمجھا جائے تب نا' باغ چنبیلی سے اٹا پڑا ہو بھلے مگر مالن کی اوقات کیا ہے کہ بالوں میں سجا لے۔''

''تم بات کہاں سے کہاں لے جا رہی ہو۔ میری بات کا جواب یہ نہیں۔''

وقت کے لگائے ہوئے پھاہوں کو اکھاڑنے کا سفاک عمل جاری تھا۔ وہ جواب کی منتظر تھی۔ اس کی آنکھوں میں خدا جانے' کتنی پرانی شناسائی اپنا مان لیے' سب کچھ پوچھنے کا استحقاق لیے' سب کچھ جان لینے کا دعویٰ لیے پرانی شناسائی کھڑی نظر آئی۔

''ہم فقط بیس بائیس سال ہی تو جدا رہے ایک دوسرے سے ورنہ یہ تو کب کی شناسا ہے۔ میں دل نہ بھی کھولوں تو بھی کم از کم اس کے سامنے میرا دل کسی جوہری کی لٹی ہوئی دکان کی طرح بکھرا پڑا ہے۔ نہ کوئی تالا نہ کوئی چابی' کیسے کیسے نادر و نایاب ہیرے جواہرات اس کے سامنے بکھرے پڑے ہیں' سو کیا فائدہ اس سے کچھ چھپانے کا؟

''مجھے اپنا خیال تو نہیں آتا مگر مجھے ایک زندگی سے بھرپور' خوش و خرم رہنے والی' چھوٹے چھوٹے خواب دیکھنے والی لڑکی کا خیال ضرور آتا ہے کہ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکی' وہ ہمیشہ اپنی امید بھری آنکھیں اٹھائے میری طرف دیکھتی تو میں مسکرا کر اس سے کہتی۔ ''تھوڑا صبر اور میری جان......! یہ بکھراؤ سمٹ جائے' زندگی کا یہ کٹھن فیز ہے' یہ گزرنے دو' یہ ہو جائے' وہ ہو جائے' بس تھوڑا صبر' تھوڑا انتظار پھر ہم مزے کریں گے' ہماری زندگی میں فراغت کے دن آئیں گے' ہم ہر خواب پورا کریں گے' ہری بھری بیلوں کے سبز پتوں میں چھپے انگور کے پہلے خوشے کو ڈھونڈ نکالنے کے خواب اور بہت سی حسرتیں' خواہشیں اور بہت سے خواب' تھوڑا سا انتظار اچھی لڑکی......! ایک دن ضرور ہم خواب اوڑھ کر اور تمنائیں بچھا کر سوئیں گے' بھولے بسرے خواب سنبھال کر رکھ لیے میں نے کہ فراغت کے وقت میں' میں اور وہ خوش فکر لڑکی مل کر ان میں رنگ بھریں گے۔ خدا جانے' اس نے کتنے صبر سے انتظار کیا ہوگا کہ وہ کبھی پھر مجھ سے ملے گی مگر ہر آنے والا دن مجھے مزید دو قدم گھسیٹ کر آگے لے جاتا رہا' زندگی مصروف سے مصروف تر' ذہنی جسمانی اور قلبی صلاحیتیں کمزور تر ہو گئیں۔ مضمحل قویٰ غالب ہو گئے۔ ''اب تو اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے' نظر ملانے سے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ وہ کیا سوچتی ہوگی' ہماری زندگی میں کیوں ہمارے دن نہیں آئے؟ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکی' سو وہ بھی ہاتھ چھڑا کر کہیں چل دی یا خدا جانے' ناراض

ہو کر کہیں جا چھپی۔"

وقت' منظر' دل' سراپے' چہرے' خدوخال' مقام' ٹھکانے' سب کچھ آخر کار بدل جاتا ہے اور انسان اس تبدیلی کو بے جگہ اور بے ٹھکانہ ہو جانے کے عمل کو 'ترقی' کا نام دیتا' خوش رہتا ہے حالانکہ وہ محسوس کرے تو وہ اس کی بہت بھاری قیمت چکائے بیٹھا ہوتا ہے۔ لوگوں' منظر' چہرے' دل' سراپے' جذبات' خدوخال کے بدل جانے' بے جگہ اور بے ٹھکانہ ہو جانے کی صورت میں بھاری قیمت' بیس بائیس برس پہلے بچھڑ جانے والی خوابی کے اولین شگوفے کی سی اجلی اور نازک لڑکی ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی' اس کی آنکھیں' مجھے گمان گزرا جیسے دو ستارے اوس میں بھیگے ہوئے ہیں۔

پانی آ گیا تھا' آج کل ہر جگہ پانی کی کمی کا رونا تھا۔ جب پانی آتا ہے تو بجلی چلی جاتی' موٹر نہیں چلائی جا سکتی' پانی تو اسٹور کرنا ہوتا ہے' سو نیچے نلکے سے بھر کر غسل خانوں میں' باورچی خانے میں پہنچانا شروع کیا۔ تین مہینے سے یہ مشقت صبح دوپہر اٹھاتے اٹھاتے میں بہت تھک گئی تھی۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ مجھے اپنے قدم اپنے پیچھے گھسیٹنے پڑتے۔

اس نے تاسف سے میرے تھکے ہوئے قدموں کو دیکھا۔ "باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"باقی لوگوں کا پانی سے کام اس کے بعد شروع ہوتا ہے اور یوں بھی وہ سو رہے ہیں سب۔"

وہ چپ چاپ مجھے یہ مشقت کرتے دیکھتی رہی۔ "اور تمہارے کندھوں میں جو درد تھا اور بازوؤں میں؟" اسے اچانک خیال آیا۔

"مجھے عادت ہو گئی ہے' اب درد کا احساس بھی درد کے جانے کے بعد ہوتا ہے کہ اس جگہ کچھ تھا جو کہ اب نہیں ہے۔"

"تمہیں کچھ احساس ہے' تم' تمہارے آنے والے دن' آنے والے دنوں میں تم کیا کرو گی؟ تمہیں اپنے مستقبل کو سوچ کر خوف نہیں آتا؟" خدا جانے' وہ کیوں مجھے ڈرانے پر تلی ہوئی تھی؟

"میرے آنے والے کوئی دن ہیں بھی یا نہیں...... اور میرے آنے والے دن' اول تو اس کی کچھ ضمانت نہیں کہ آنے والے دن میری نظروں کے سامنے ہیں' مجھے کسی نہ کسی بھائی کے در پر بیٹھنا ہوگا اور وہاں بھی کڑھتی رہوں گی' جب ان کے بچے وقت بے وقت ٹی وی دیکھیں گے' بے حساب پیسہ خرچ کریں گے' جب ان کی ہر فرمائش بلا سوچے پوری کی جائے گی اور ایسی بہت سی باتیں جن پر میں کڑھوں گی' کچھ بولوں گی تو ہر بہن بھائی یہی کہے گا کہ ہماری زندگیوں میں دخل نہ دو' ہمارے بچوں کا جینا عذاب مت بناؤ' انہیں اپنی مرضی سے ان کی زندگی جینے دو۔ کوئی زبان سے کہے گا' کوئی نگاہوں اور کوئی باڈی لینگویج سے۔ ہمارا یہی احسان کیا کم ہے کہ ہماری چھت کے نیچے بیٹھی ہو' کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہو تو کیا؟ اپنے لیے اس چھت کے نیچے پڑے رہنے کے لیے۔"

"وہ تو اب بھی چھت کے نیچے پڑے رہنے کے جتی رہتی ہو۔" اس نے سفاکانہ انکشاف کیا' جس کا کبھی مجھے احساس نہ تھا' جس لاشعوری کوشش کا مجھے کبھی ادراک نہ تھا' کبھی کبھی شدت سے دل چاہتا ہے کہ کسی ایسی جگہ چلی جاؤں کہ نہ کسی کو میری خبر آئے نہ میں ملوں۔ لوگوں کو میرے خدوخال تک بھول جائیں' انہیں اپنی یادداشت پر زور دے کر میری صورت یاد کرنی پڑے اور سماعت کے حافظے پر زور ڈال کر میری آواز یاد کرنی پڑے مگر کہاں؟ ہر طرف بے بسی سے دیکھا' کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں کہ وہاں جا بسوں' شاید منظر سے اوجھل ہو کر اپنی جگہ خالی کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلا سکوں۔

"تمہارے رشتے تو آتے رہتے ہیں' شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

کم بخت زمانے کا پسندیدہ سوال اور پسندیدہ

دکھتی رگ جسے دوسروں کی کلائی میں محسوس کرتے ہی جھپٹ کر پکڑ لیا جاتا ہے اور پھر اسے پکڑے پکڑے دیر تک اپنی دکھتی رگیں بھلانے کی خوبصورت اور خوش وقت کوشش کی جاتی ہے۔ آلوچے کے شگوفوں جیسی اجلی' آڑو کے نیم گلابی شگوفوں کی سی شگفتہ لڑکی کو بھی یہ فن آ گیا تھا۔ رگ ڈھونڈ کر پکڑ ہی لی حالانکہ یہ رگ اب مجھے ذرا نہیں دکھاتی مگر لوگوں کا تو پسندیدہ مشغلہ ہے ہی' کیا کیا جائے؟

''شادی کرنے کی نہیں' ہو جانے کی چیز ہے۔ کرتے نہیں' ہو جاتی ہے' ہو جانے میں آپ کا کمال نہیں' نہ ہونے میں ہمارا قصور نہیں مگر لوگ نہیں سمجھتے' وہ تو ہمی کو بھالے مارتے ہیں۔''

''تمہیں نہیں لگتا' دیر ہو گئی ہے؟''

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
اسی باعث کو تو جاننے کی دھن ہے لوگوں کو

جس باعث کو میں نہیں جانتی' اسے کیسے لوگوں کو پکڑا دوں؟'' میں نے اپنے انداز میں لاپروائی سمونے کی وہی کوشش کی جو ایسے موقعوں پر میں اختیار کرتی ہوں حالانکہ کبھی کسی پروپوزل پر اعتراض نہیں کیا تھا' ناک نہیں چڑھائی یہ سوچ کر کہ یہی ماں اور بہن بھائی آپس میں کہیں گے کہ یہ خود کہاں کی مہارانی ہے کہ اسے مہاراجہ چاہیے۔ اس الزام سے بچنے کے لیے چپ سادھ رکھی ورنہ ہر ایسے پروپوزل پر دل ڈوب جاتا ہے' دکھ ہوتا ہے کہ قدرت بس مجھے اسی قابل جانتی ہے' کبھی تکبر نہیں کیا' ہر آنے والے رشتے کا دل سے احترام کیا کہ اگر قدرت کی نگاہ میں' خالق کی نگاہ میں یہی میرے لیے مناسب ہے' میں بس اتنے کے ہی قابل ہوں تو ٹھیک ہے مگر ہوا کیا'

لوگ میرے خلوص کو اکثر
میرا احساسِ کمتری سمجھے
لوگ سمجھے کہ شاید میں بہت حاجت مند ہوں۔

لوگوں سے کیا گلہ' یہی اپنے گھر کے لوگ' ایک پروپوزل پر ایک بھائی صاحب نے کہا۔ ''چھوڑیں' وہ اپنی زندگی میں سیٹ ہے۔''

''تو کیا برا کہا' تم سیٹ تو ہو' نہیں ہو کیا؟'' دیرینہ شناسا لڑکی بولی۔

''الحمدللہ بالکل ہوں' ضرورت سے زیادہ لیکن اگر زندگی صبح سے شام اور شام سے صبح کر لینے کا نام ہے' صرف جسم کے تقاضوں سے عبارت ہے اور رُوح اور دل کی پکار کوئی معنی نہیں رکھتی تو پھر ٹھیک ہے۔''

دراصل مجھے اس بیان سے قطعی اختلاف نہ تھا' مجھے اس سوچ سے اختلاف تھا' ہوتا تو وہی ہے جو مقدر میں ہو مگر دوسروں کے اس قسم کے بیان یہ سمجھا دیتے ہیں کہ وہ آپ کے بارے میں کتنے concern ہیں اور بس یہ نان کنسرن ہونا تکلیف دیتا ہے' یہ معمولی سی بات نہ کسی کو سمجھا سکتی ہوں نہ منوا سکتی ہوں۔

''مجھے خود اس بات سے تکلیف ہوتی ہے' کفرانِ نعمت کے خوف سے رونا آتا ہے کہ مجھے بیش قیمت لباس' چمکتے دمکتے زیورات' روپے پیسے کے ڈھیر دنیاوی آسائشیں' خوشی اور آسودگی کیوں نہیں دیتیں؟ گھر میں ماں جیسی نعمت کے ہوتے میں اس نعمت سے محروم کیوں ہوں؟ کون سی دیوار ہے جسے میں ڈھانے سے قاصر ہوں؟ کون سا فاصلہ ہے جسے میں نہیں پاٹ سکی؟ مگر نہیں' شاید ایسا نہیں' شاید تمہاری بات صحیح ہے' میں نے خود اپنی قدر نہیں کی اس لیے دوسروں سے نہیں کروا سکی' اس لیے زمانے نے ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ میری کولیگ کہتی ہیں۔'' ہم تو خود اپنی قدر کرتے ہیں' قدر سے رہتے ہیں' دنیا جائے بھاڑ میں' ہم تو آرام میں ہیں کی پالیسی اپنا کر لیکن اگر یہ آرٹ ہے تو مجھے نہیں آتا۔ اگر یہ حق ہے تو مجھ سے دور ہے۔ اس کے لیے مجھے اپنی روح کچلنی ہوگی' دل کو قدموں تلے روندنا ہوگا' تب مجھ سے یہ پالیسی چل سکے گی۔ مجھ سے تو یہی

کمال ہوسکا کہ جھٹ دوسروں کی تکلیف اٹھائی دوسرے کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔"

بہت پہلے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا کو جیب میں رکھو دل میں نہیں۔ یہ بہت سے تشنہ سوالوں کا جواب لگا۔ دنیاداری اور دین داری کے بیچ کھلنے والے دروازے کی کنجی لگی۔ اس کنجی سے دروازہ کھولا ایک پاؤں دہلیز کے اس پار دوسرا اس پار رکھا۔ دنیا کو جیب میں لیے پھرتی ہوں مگر دل بھی تو خالی ہے۔"
اوس میں بھیگے ستارے میرے چہرے پر ٹکے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ میری باتوں سے دکھی ہورہی تھی۔

"ہونا تو یہ چاہیے کہ میرے جیسی چوکھٹ پر پڑی بنی جتنی قدر کسی کی نہ ہو ہم تو دکھ کی ساتھی ہوتی ہیں۔ سکھ میں تو سکھی اولاد یاد رہتی ہے۔ میری ماں جب بیمار ہوتی ہے تو میری ماں ہوتی ہے میں اس کی سب کچھ ہوتی ہوں مگر ٹھیک ہوتے ہی لہجہ بدل جاتا ہے نظریں بدل جاتی ہیں تعلق بدل جاتا ہے ترجیحات بدل جاتی ہیں تیور بدل جاتے ہیں دکھ کے ساتھی کبھی سکھ کے ساتھی نہیں بنائے جاتے۔ ہمارا تو کوئی نہیں ہوتا۔ ماضی ڈوب جاتا ہے حال گزر جاتا ہے اور مستقبل کم از کم ہماری جیسیوں کا کوئی نہیں ہوتا۔ مجھے قیمتی لباسوں کی ضرورت نہیں میرا تھکا ہوا جسم ان کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔ اس کی ضرورت ہے کہ کسی کو میری زندگی میں پھیلی اس تنہائی کا احساس ہو صبح اٹھ کر فرش رگڑتی پانی بھرتی بے شمار چھوٹے چھوٹے کام کرنے والی مشین کبھی کبھی تھک کر گھرر گھرر کرنے لگتی ہے یہ آواز کوئی سن سکو تو سنو محبت کے دو بول نرمی سے بات کرنے توجہ سے سنی جانے کی ضرورت ہے گھروں کو ہمارے لیے قفس نہ بناؤ اپنی بے رخی اور بے زاری سے ہم نے اپنی مرضی سے یہ زندگی نہیں چنی ہم اپنی مرضی سے بیٹی نہیں بنے۔"

بیس بائیس برس بعد ملنے والی بچھڑی ہوئی شناسا لڑکی وہ لگ تھی اتنے گھاؤ اتنی شکستیں۔

"مگر مجھے بہترین اداکارہ ہونے کا ایوارڈ پھر بھی کوئی نہیں دے گا۔" میں نے ماحول پر چھایا دکھ کم کرنے کو کہا۔ "بہار میں کھلنے والے گلابی شگوفوں کا غلاف اوڑھے اوڑھے تھک چکی ہوں۔"

"تم وقت سے لڑنا چھوڑ دو نہیں تھکو گی اس دیو سے ہار مان لو۔" اس نے خلوص دل سے مشورہ دیا۔

"اب آہستہ آہستہ میں نے ہتھیار پھینکنے شروع کردیئے ہیں۔"

"اچھا مثلاً......؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ دھاڑنے والا شیر پنجرے میں نیم جاں پڑا ہے اور ایک دل ہوا کرتا تھا مرحوم کو پورے اعزازات کے ساتھ دفنا دیا ہے۔"

اس نے یوں تاسف اور دکھ سے مجھے دیکھا جیسے میں نے وقت کے دوڑتے قدموں کے نیچے روندے جانے والے مرے ہوئے دل کی بات نہیں کی بلکہ کسی جیتے جاگتے ہنستے کھیلتے خواب دیکھتے وجود کو دفنا دینے کی بات کردی ہو۔

"اچھا تم بتاؤ تم کہاں ہوتی ہو؟" مجھے بڑی دیر سے خیال آیا۔

وہ خاموش رہی اس کی پلکیں اس کی اداس آنکھوں پر لرزتی رہیں۔ "قبر میں......" وہ دھیرے سے بولی۔

"کس کے دل کی......؟" شاید میرے کندھوں کے درد میں افاقہ ہوچکا تھا۔

"ہماری قسمت میں کسی کے دل نہیں ہوا کرتے ہم اپنی اپنے وجود کی تاریک قبر میں رہتے ہیں اپنے ہی من کے اندھیروں میں۔"

"اچھا تو تم بھی......" وہ میری چھوٹی سی 'بھی' میں چھپے گہرے معنی محسوس کرکے مسکرائی۔

"سنو بہار کبھی پھر آئے گی؟" اس نے بہت امید بہت آس کے ساتھ سوال کیا۔

''بہار اب نہیں آئے گی' کبھی نہیں آئے گی۔''
میں نے سفاکی سے بتایا۔ اوس میں بھیگے ستارے پانیوں میں ڈوب گئے۔

''دیکھو! اگر بہار پھر آئے تو میری قبر پر بہار میں کھلنے والا پہلا کاسنی پھول ضرور رکھنا' انگور کی بیل کا پہلا خوشہ رکھنا' خزاں میں شاخ سے گرنے والا پہلا زرد پتہ میری قبر پر رکھنا اور دل میں ملال رکھنا' صبح کی اوس میں بھیگے پھول اور تارے رکھنا' کسی خوش رنگ لہجے کی خوشبو رکھنا' بہار کی نرم دھوپ کا سا لمس رکھنا' تمہیں معلوم ہے' ہم دونوں زندگی بھر دھوپ سے نرم لمس' خوشبو دیتے لہجے' گھنے پتوں کے نیچے چھپے انگور کے پہلے خوشے کو دیکھ لینے کی خوشی تلاش کرتے رہے ہیں مگر یہ چھوٹی چھوٹی بے ضرر خوشیاں ڈھونڈنے میں بھی ہمارے گریبان تارتار ہوگئے ہیں' ہمارے پاؤں زخمی ہوگئے' ہمارے خوشبو دیتے نرم بال دھول میں اٹ گئے' ہمارے دل ہم سے ناراض ہوگئے روح ناخوش اور من بوجھل ہوگئے اور ہم پھر بھی سبز پتوں میں چھپے انگور کے پہلے خوشے کو دیکھ لینے کی جیسی سچی' سستی خوشی تک نہ پہنچ سکے' نہ صبح کی اوس میں بھیگے سحر کے کاسنی آنچل کو پکڑ کر ہوا میں اڑا سکے نہ ہوا سے پیراہنِ یوسف کی بو پا سکے۔ ہم کتنے بدقسمت لوگ ہیں' کتنے بدقسمت' دنیا جیب میں لے کر گھومے مگر دل میں نہ اتار سکے۔ ہم نے دنیا کو دل میں جگہ نہ دی اس لیے اس نے بھی ہمیں کہیں جگہ نہ دی۔''

مجھے لگا' میرا دل جیسے یخ پانی کے تالاب میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ بیس بائیس برس پہلے بچھڑ جانے والی' خوبصورت خواب دیکھنے والی' تیز بارش میں ناچنے والی' ہوا کی دھن پہ ناچتے شگوفہ کی سی لڑکی مجھ سے زیادہ دکھی' اکیلی اور مایوس تھی۔

''بہار کی نرم دھوپ کے خوش کن لمس سے کہنا' میری قبر کو ضرور چھونے آئے' اسے بتانا کہ ہم دونوں اس نرم لمس کو کتنا ترستے ہیں' ہمیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں چھوا۔ صبح سے کہنا کہ اپنا کاسنی آنچل میری قبر پر ضرور پھیلائے۔ ہم نے اس اجلے نرم کاسنی آنچل کو چھونے' اس کی نرماہٹ محسوس کرنے کے لیے اس کا بہت انتظار کیا' نرگس کے پہلے کھلنے والے پھول سے کہنا کہ وہ میری قبر پر ضرور کھلنے کے لیے آئے کیونکہ موسم بدلنے کے انتظار نے ہم سے ہمارے اچھے اور نایاب دن خراج میں وصول کرلیے' ہمارے دل تاوان میں وصول کرلیے۔''

مجھے یوں لگا جیسے یہ اس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ اداس ستارے چھما چھم برستی بارش میں بھیگ رہے تھے' دھیرے دھیرے ٹمٹما رہے تھے۔ میرا دل گہرے پانیوں میں ڈوب رہا تھا' میں سناٹے میں بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

''وہ لڑکی جسے میں نے سینت سینت کر رکھا تھا اچھے وقتوں کے انتظار میں' وہ یوں دھیرے دھیرے سلگ کر ختم ہوجائے گی۔ خدا جانے' مجھے کبھی یہ خیال کیوں نہ آیا؟ میں نے کیوں سمجھ لیا کہ چہرے' خدوخال' سراپے' دل' مقام اور ٹھکانے نہیں بدلیں گے۔ پلوں کے نیچے سے اتنا زیادہ پانی نہیں گزرے گا۔ میں نے کیوں یہ سمجھ لیا تھا؟ شاید خواب سینت کر رکھے جاسکتے ہیں مگر خواب دیکھنے والی آنکھیں نہیں۔ وہ وقت کی دھند سے ضرور دھندلا جاتی ہیں۔ اپنے اپنے مقام پر کبھی ہم نہیں' کبھی تم نہیں۔''

''میں چلتی ہوں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔
''اور تم' تمہیں فرصت ملے تو باغ میں سے چنبیلی لاکر زلفیں ضرور سجانا' ہوا چنبیلی کی مہک اور بالوں میں سج جانے کی خبر لے کر میری قبر تک ضرور آئے گی۔ میں جا رہی ہوں' قبروں کو زیادہ دیر خالی نہیں رہنے دیتے۔''
شاید وہ کسی آئینے میں تحلیل ہوگئی تھی۔

☆☆☆☆

ناول

زمر نعیم

ابھی امکان باقی ہے

اُن کرداروں کی کہانی، جو ہر معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر
جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے

قسط نمبر 6

''افوہ اس وقت کو...... ن آ گیا؟ ضرور آپ کی لاڈلی بادلوں کو دیکھتے ہی کالج سے بھاگی آئی ہے۔''
اُس کی اور وردہ کی بنتی نہیں تھی۔

''ہاں تو اچھا ہے پہلے ہی آ گئی۔ بارش ہو جاتی تو تمہیں ہی لانے کے لیے جانا پڑتا۔'' زہرا نے بیٹے کو سرزنش کرتے ہوئے گھورا اور پھر چند قدم بڑھ کر جیسے ہی دروازہ کھولا۔

انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

''ار...... وی...... تم......؟'' زہیر بھی اروئی کے نام پر چونک کر پلٹ کر نیچے آ گیا۔

''السلام علیکم امی...... اتنی حیران کیوں ہیں...... میں ہی ہوں۔'' اروئی کی خوشی بھی چھلکی پڑ رہی تھی۔

''اتنی اچانک...... بتا تو دیتیں...... کس کے ساتھ آئی ہو۔'' زہرا نے یکدم بڑھ کر اِسے گلے لگا کر چوما۔ تو اروئی کو بھی احساس ہوا کہ اصم گاڑی پارک کرنے کے لیے پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

''وہ...... اصم آئے ہیں میرے ساتھ...... السلام علیکم بھائی۔ آپ پلیز ذرا دیکھیے گا اصم گاڑی پارک کر رہے ہیں۔''

''ہا...... ں...... ہاں...... زہیر جلدی جاؤ...... اور دیکھو منع کر دینا بچوں کو کوئی توڑ پھوڑ نہ کریں۔''

''جا رہا ہوں۔ تم سے آ کر بات کرتا ہوں۔'' زہیر نے بھی اُسے مصنوعی طور پر دھمکایا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔ شادی کے بعد لڑکی کی میکے میں اہمیت کس قدر بڑھ جاتی ہے اُسے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ جو کہ اُسے نئی سرشاری بخش رہا تھا۔

زہرا نے دوبارہ شکوہ کیا تو وہ بیٹھک کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''امی بس اچانک بی بی جان نے کہا کہ سب سے مل آؤ پھر اصم کہنے لگے سرپرائز دیتے ہیں تو۔''

''پھر بھی بیٹا بتا دیتیں...... تین گھنٹے کا سفر تھا...... میں کچھ انتظام کرتی...... داماد پہلی بار گھر آیا ہے اور......

تمہارے ابو بھی آفس گئے ہوئے ہیں۔ پہلے بتا تیں تو کھانے پینے کا اہتمام کرتی۔''
''نہیں آنٹی...... آپ کو کسی تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے آپ جو زمین سے بنا رہی ہیں ہم وہی کھائیں گے۔'' اصم زہیر کے ساتھ بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ تو زہرا قدرے خجالت سے مڑیں۔
''السلام علیکم! اصولاً مجھے پہلے سلام کرنا چاہیے تھا مگر آپ کی فکر مندی نے مجھے مداخلت پر مجبور کیا تھا۔'' اصم نے قریب آ کر سر جھکا کر زہرا سے پیار لیا۔
''وعلیکم السلام! جیتے رہو۔ آؤ بیٹھو۔ میں پانی تو لے آؤں تم دونوں کے لیے یا نہیں۔'' زہرا نے مسکرا کر دیکھا تو اصم بھی مسکرا دیا۔
زہرا زہیر کو اشارہ کرتیں باہر نکل گئیں۔
''اصم آپ نے بی بی جان کو کال کر دی ہے ناں کہ ہم خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔'' زہرا کے جاتے ہی اروی نے بے چینی سے پوچھا۔
''ہاں...... بالکل...... اُن سے بات کر کے ہی اندر آیا ہوں۔ تم بھی تھوڑی دیر میں بات کر لینا اور سنو! جاؤ آنٹی کو منع کر دو وہ بیں زہیر کو بازار نہ بھیج دیں۔ ہم وہی کھائیں گے جو گھر میں پکا ہوگا۔'' اصم نے بلامروت سادگی سے کہا۔
اروی کو اصم کی یہ بات ہی تو متاثر کر گئی تھی کہ اُس میں اپنی حیثیت و امارت کا زعم نہیں تھا نخرہ نہیں تھا۔
''جی میں کہتی ہوں امی سے اگر وہ مان گئیں تو......'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کچن میں آ گئی۔
زہرا ڈبہ بند جوس گلاسوں میں انڈیل رہی تھیں۔ پاس ہی زہیر کھڑا آرڈر کا منتظر تھا۔ ''امی بتایئے بھی کیا؟ کیا لاؤں؟'' اروی نے دروازے میں کھڑے ہو کر پکار کر منع کیا۔
''امی......! اصم منع کر رہے ہیں وہ بازار کا کچھ نہیں کھائیں گے گھر میں جو پکا ہے وہی کھائیں گے۔''
''تم تو بات نہیں کرو...... پتہ ہے امی نے دوپہر کے لیے دال چاول پکانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ اصم بھائی کیا دال چاول کھائیں گے؟'' زہیر بھی جھنجلایا ہوا تھا۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ اور اصم کو دال چاول کھلانے کا سوچ کر دونوں ماں بیٹے کو اختلاج ہونے لگا تھا کہ داماد کی خاطر داری کیسے کریں۔
''امی آپ دونوں کیوں پریشان ہیں۔ اصم کھا لیں گے دال چاول' آپ کباب فرائی کر لیجیے گا ساتھ میں۔''
''اچھا اچھا...... تم تو جا کر اندر بیٹھو۔ یہ لے جاؤ...... اصم کیا سوچے گا ہم سب باہر کانفرنس کرنے کھڑے ہو گئے؟'' زہرا نے نرمی و تحمل کا مظاہرہ کیا اور پھر ٹرے میں جوس کے گلاس رکھ کر اروی کو دے کر روانہ کیا۔
زہرا کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سلیقہ مند تھیں جھٹ سے فریج کھول کر فریزر سے کباب اور مرغی کے گوشت کے پیکٹ نکالے۔ ایک گھنٹے میں وہ کافی چیزیں بنا سکتی تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی عمل درآمد شروع کر دیا۔

☆......☆......☆

کھانا سرو کرنے میں کچھ وقت تھا۔ اس لیے سبرینہ کچن سے نکل کر انعم کے کمرے میں آ گئی۔ انعم کا موڈ پھر خراب تھا۔

''دیکھیے نا بھابی...... بی بی جان نے پھر مجھے اُن لوگوں کے سامنے ہلکا کر دیا ہے۔'' وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

''اب کیا ہوا ہے؟ کیوں اپ سیٹ رہتی ہو۔''

''آپ کو نہیں پتہ کیا ہوا ہے۔ میں جن بھائی بھابی سے ملنے کے لیے فائق سے اُلجھ کر یہاں آئی ہوں۔ بی بی جان نے انہیں ہی یہاں سے چلتا کر دیا۔ اوپر سے صالحہ آنٹی کو شام کی چائے کی بھی دعوت دے دی ہے۔ اب وہ آئیں گی تو کہیں گی نہیں کہ کہاں ہیں وہ دونوں جس کے ساتھ رہنے کے لیے میں اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔'' وہ قدرے غصے سے بولتی سبرینہ کو بھی حیران کر رہی تھی۔

''تو...... کیا...... ؟ تم گھر چھوڑ کر آ گئی ہو؟'' سبرینہ بے یقین بھی تھی۔

''یہی سمجھ لیں...... فائق نے خود کہا ہے کہ میں اب اُس کے گھر نہ آؤں مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے اس قید خانے میں جانے کا...... پلیز آپ بی بی جان کو سمجھائیں۔ مجھے واپس جانے پر مجبور نہ کریں۔'' انعم کا رویہ دوٹوک اور فیصلہ کن تھا۔ سبرینہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں سکی۔

☆......☆......☆

کھانے پر اہتمام دیکھ کر اصم نے شکایتی نظروں سے دیکھتے ہوئے زہرا کو مخاطب کیا۔

''آنٹی آپ مجھے مہمان ہی سمجھتی ہیں۔ گھر کا فرد نہیں۔'' وردہ بھی کالج سے آ کر شکوے شکایتیں کرنے کے بعد ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ میز پر دال چاول کے ساتھ چکن کڑاہی رائتہ کباب نان چٹنی سلاد کے علاوہ کولڈ ڈرنک بھی پڑی تھیں۔ احمد حسن بھی چھٹی لے کر آ گئے تھے۔

اُس کی شکایت پر اپنائیت سے بولے۔ ''بیٹا کیا اہتمام سے کھانے کا حق گھر کے افراد کو نہیں ہوتا۔ بھئی ہم بھی کبھار ہی تو اکٹھے ہوتے ہیں۔ اور یہ اتنا اہتمام بھی نہیں ہے۔ جو تم ہمیں شرمندہ کرنے لگو۔''

''انکل شرمندہ تو میں ہو رہا ہوں میری وجہ سے آنٹی کو اتنی محنت کرنی پڑی۔''

''اُفوہ اصم بھائی اب اس بحث کو چھوڑیں۔ ورنہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' وردہ نے پانی کا جگ اور گلاس سائیڈ پر چھوٹی سی تپائی پر رکھتے ہوئے اُسے کھانے کی طرف متوجہ کیا۔ تو احمد حسن نے بھی شفقت سے کہا۔

''ہا...... ں بیٹا...... بسم اللہ کرو۔''

کھانے کے بعد آئس کریم کھائی گئی۔ اور پھر اصم زہیر کو لے کر باہر نکل گیا۔ وہ چاہتا تھا اروی اپنی امی اور بہن کے ساتھ کھل کر بات چیت کر سکے۔ اروی کو اگرچہ برا لگ رہا تھا کہ وہ اجنبی شہر میں صرف اُس کی خاطر بھٹکنے نکل کھڑا ہوا ہے۔

☆......☆......☆

موسم کے تیور بدلتے دیکھ کر بی بی جان کو بھی تشویش ہو رہی تھی کہ اصم بارش میں ہی واپسی کے لیے نکل کھڑا ہو گا۔ وہ کئی بار رابطہ کرنے کی کوشش کر چکی تھیں مگر سگنل کا مسئلہ تھا۔ اس لیے ٹھیک طرح بات نہیں ہو سکی تھی۔ صالحہ درانی (انعم کی ساس) نے بھی موسم کی وجہ سے آنے سے معذرت کر لی تھی۔

ثمن بار بار انہیں تسلی دے رہی تھی۔
''بی بی جان! اصم نا سمجھ نہیں ہے۔ موسم دیکھ کر ہی نکلے گا۔ دیکھ لیجیے گا۔ اُس کے سسر ہی انہیں آنے نہیں دیں گے۔''
''اُس کی عادت تو معلوم ہے سب کو...... اپنے گھر کے علاوہ کہیں وقت گزارنا کس قدر دشوار ہے اس کے لیے۔ دوپہر میں پہنچتے ہی کہہ رہا تھا کہ شام سے پہلے نکل آئیں گے۔ اب آندھی کے ساتھ بارش کا طوفان سا ہے۔ اللہ خیر کرے بس، بچے خیریت سے لوٹ آئیں۔'' بی بی جان نے برملا پریشانی کا اظہار کیا۔
''آمین...... بھائی کو تو راستے سے پلٹ آنا چاہیے تھا۔'' نیلم کو بھی تشویش ہو رہی تھی۔ سبھی شام کی چائے کے لیے لاؤنج میں جمع تھے۔ انعم کو ویسے ہی اُن کے جانے پر غصہ تھا۔ ذرا تلخی سے بولی۔
''میری تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ میں تو چاہ رہی تھی کہ وہ دونوں آج نہ جائیں مگر آج ہی اُن کی میکے اور سسرال میں حاضری ضروری تھی۔ اب پریشان ہونے کا فائدہ! وہ تو اب اپنے حساب سے واپس آئیں گے۔ کیا پتہ سسرال والے موسم کا بہانہ بنا کر روک ہی لیں۔''
''نہیں خیر اصم وہاں رُکے گا تو نہیں۔ چھوٹا سا تو گھر ہے اُن کا...... چند گھنٹے ہی مشکل ہو رہے ہوں گے اُس کے لیے...... اچھا ہوتا بی بی جان آپ اروی کو ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیتیں۔''
سبرینہ نے بھی اپنی رائے دی تو بی بی جان نے بس ایک نظر اُسے دیکھا تھا کہا کچھ نہیں۔
''میں تو آپ کی پریشانی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں بی بی جان۔'' سبرینہ نے جلد ہی صفائی دینے کی کوشش کی۔
''میں چاہتی ہوں سبھی اروی کے میکے یا چھوٹے گھر کو بھول کر صرف یہ یاد رکھا کریں کہ وہ اصم کی بیوی اور اس گھر کی عزت ہے۔'' وہ یکدم اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔
''ثمن میرے لیے چائے کمرے میں بھجوا دو۔'' یہ اُن کی خفگی کا اظہار تھا۔ سبرینہ جیسے چور سی بن کر بیٹھ گئی۔ گھر کے باقی مرد بھی آنے والے تھے۔ بی بی جان کی غیر موجودگی سبھی کو متوجہ کر سکتی تھی۔
ثمن نے اُٹھتے ہوئے سبرینہ کو تنبیہی انداز میں ٹوکا۔
''سبرینہ تمہیں اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔ تمہیں معلوم تو ہے بی بی جان کو اس طرح بات کرنا پسند نہیں ہے۔''
''میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی تھی۔ سبھی جانتے ہیں اصم کا مزاج کیسا ہے۔'' سبرینہ بھی اپنی بات کہہ کر اُٹھ گئی۔
''ہاں...... یہی بات تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر اصم بھائی کمپرومائز کرنے پر مجبور کیوں ہیں۔ وہ معمولی حیثیت کی عام سی لڑکی ہے۔ اُس کا اصم بھائی کے ساتھ کیا جوڑ...... اچھا بھلا میری سسرال میں بھائی کا رشتہ ہونے جا رہا تھا مگر...... سچ پوچھیں تو فائق کا موڈ بھی میرے ساتھ اسی لیے خراب ہے۔'' انعم کو ایک بار پھر موقع مل گیا تھا۔
ثمن اس موضوع میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی سو وہاں سے ہٹ گئی۔ ویسے بھی اُسے بی بی جان کی

چائے کمرے میں پہنچائی تھی۔ باہر گاڑیاں رُکنے کی آواز میں اندر سنائی دی تھی۔ بارش کی وجہ سے وہ لوگ بھی جلدی آ گئے تھے۔ سبرینہ بھی انعم کو کریدنا تو چاہتی تھی مگر مردوں کی آمد نے اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اصم مسلسل ہوتی بارش میں بھی واپس جانے پر بضد تھا۔ جبکہ احمد احسن اور باقی سب بھی انہیں بار بار روک رہے تھے۔

''بیٹا میں تو ابھی بھی یہی کہوں گا کہ تم دونوں آج رات یہیں ٹھہر جاؤ...... صبح تک موسم بہتر ہو جائے گا تو چلے جانا۔''

''انکل بی بی جان پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اُن سے دوپہر کے بعد رابطہ بھی نہیں ہو سکا۔ ہم رات تک نہ پہنچے تو اُن کی پریشانی بڑھ جائے گی۔ موسم اتنا خراب نہیں ہے۔ میں ڈرائیونگ کر لوں گا۔'' اصم نے اُن کے اصرار کو پھر سے رد کیا تو اروی نے بھی تائید کی۔

''ابو ہمیں جانا ہی چاہیے۔ گھر میں واقعی سب کو پریشانی ہو رہی ہو گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تم دونوں کی مرضی......'' احمد حسن نے بھی بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ زہرا نے دونوں کو سوٹ دیتے ہوئے پھر آنے کی دعوت دی تو وردہ بھی فوراً بولی۔

''بالکل...... اس بار تو آپی کو ہم تین چار دن ضرور رکھیں گے۔ آج تو پتہ بھی نہیں چلا اور سارا دن گزر گیا۔''

''تو ابھی رکھ لو اپنی آپی کو...... تین چار دن بعد لینے آ جاؤں گا۔'' اصم نے بھی جواباً مذاق میں کہا تو زہرا نے وردہ کو گھور کر دیکھا۔

''یہ تو فضول میں بولتی رہتی ہے۔ ہمیں تم سب کی خیریت ملتی رہتی ہے۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے۔ خیریت سے جاؤ۔'' انہوں نے بڑھ کر دونوں کو گلے لگایا اور پھر وہ دونوں رخصت ہو کر گاڑی میں آ بیٹھے۔

شام ڈھل رہی تھی۔ بارش کی رفتار میں کافی کمی آ چکی تھی۔ اس لیے اصم کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔

زبدہ خان کافی سنجیدگی سے بیٹھی تھیں۔ چہرے پر گہری سوچ کی چھاپ نظر آ رہی تھی۔ شریح خان بھی انہیں لاؤنج میں نہ پا کر سیدھے اپنے کمرے میں چلے آئے تھے۔

''خیریت ہے...... آپ آج کمرے میں تنہا بیٹھی ہیں۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی شریح خان نے انہیں مخاطب کر کے چونکایا تو وہ یکدم چونک کر متوجہ ہوئیں۔

''آ...... پ؟ سب آ گئے؟ موسم کیسا ہے باہر؟''

''موسم تو سہ پہر سے ہی خاصا خراب ہے اور تیز بارش ہونے کا اندیشہ ہے مگر آپ کے موڈ کا موسم آج کیوں خراب ہے؟'' اُن کی سنجیدگی میں اصرار تھا۔

زبدہ نے پہلے انہیں ایک نظر دیکھا پھر گہری سانس کھینچ کر بتانے لگیں۔

''میرا موڈ خراب نہیں ہے۔ بس اصم اور اروی کے لیے فکر مند ہوں۔ دوپہر کے بعد سے اُن سے رابطہ نہیں ہو پایا۔'' وہ سر ہلا کر سمجھنے کا اشارہ کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں

سمجھانے لگے۔
''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ حسن احمد یقیناً انہیں روک لے گا یا پھر موسم کے بہتر ہونے تک انہیں روکے رکھے گا۔''
''اصم رکنے والا ہے؟ یاد نہیں کالج کے دنوں میں دوستوں کے ساتھ برفباری دیکھنے سوات کالام وغیرہ گیا تھا اور پھر اُسے جس دن آنا تھا کس قدر طوفانی بارش ہو رہی تھی۔ دوسرے لڑکے اسلام آباد ہی رہ گئے تھے اور وہ چلا آیا تھا اور پھر آ کر کیسا بیمار پڑا تھا۔''
زبدہ خان کی فکرمندی میں ممتا بھری ہوئی تھی۔ شریح خان زیرِ لب مسکرا دیے۔
''وہ کالج کا لااُبالی دور تھا اب وہ ذمہ دار انسان ہے اُسے معلوم ہے کہ حالات کے مطابق کیسے چلنا چاہیے اور پھر تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ اب وہ شادی شدہ ہو چکا ہے۔''
''میرے لیے تو وہ ابھی بھی بچہ ہی ہے۔ اتنی سمجھ بوجھ عقل ہوتی تو آدھے راستے سے ہی پلٹ آتا...... خیر اب آپ رابطہ کرنے کی کوشش کریں۔ رابطہ ہو جائے تو اُسے رُکنے کے لیے کہیں...... کاٹ لے کسی طرح ایک رات وہاں۔'' زبدہ کے لہجے میں فکرمندی کے ساتھ جھنجلاہٹ بھی اتر آئی تھی۔
اُسی لمحے شمن دروازہ بجا کر اُن دونوں کے لیے چائے لے آئی۔ شریح خان اپنا سیل فون جیب سے نکال کر اصم سے رابطے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ اُن کی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ باہر سے بادلوں کے گرجنے کی آواز میں جو شدت تھی وہ زبدہ کے چہرے کی پریشانی مزید بڑھا رہی تھی۔

☆......☆......☆

بارش کی رفتار میں کمی آئی تھی تبھی اصم نے واپسی کا قصد کیا تھا۔ اروی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایسے حالات میں وہ واپس جانے کو ترجیح دے یا پھر اپنے گھر والوں کا بہ اصرار رو کنا قبول کرے۔ بہر حال اُس نے اصم کے فیصلے کو مان دے کر واپسی کے فیصلے کو مانا تھا۔ مگر شہر کی حدود سے نکلتے ہی بارش کی رفتار بتدریج بڑھتے بڑھتے پھر موسلادھار ہو گئی تھی۔ نظر کے سامنے پانی کی چادر کے ہونے کا گمان سا تھا۔ اصم نے گاڑی کی رفتار معمول سے کم کر دی تھی۔ اُس کے باوجود محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے گاڑی چلاتے ہوئے دشواری ہو رہی تھی۔
''اصم میری بات مانیں تو واپس چلتے ہیں...... موسم بے حد خراب ہو رہا ہے ایسا نہ ہو کہ......'' وہ اپنے اندیشے اپنی زبان پر لانے سے پہلے ہی بات روک گئی۔
اصم نے اپنی توجہ سامنے سے ہٹا کر ذرا کی ذرا اُس کے خوفزدہ چہرے پر نظر ڈالی تھی۔ وہ اندر سے خود بھی پریشان تھا۔ مگر اروی کو اطمینان دلانے کی خاطر ہلکے پھلکے انداز میں اُس کا خوف زائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔
''یا...... ر...... اتنا خوبصورت موسم انجوائے کرنے کا موقع ملا ہے اور تم ہو کہ واپس چلنے کی بات کر رہی ہو...... یہ وقت دوبارہ زندگی میں نہیں آئے گا۔''
''خو...... ب...... صورت موسم...... بوجہ حیرت اروی کی آواز گھٹ سی گئی تھی۔
''ایسی طوفانی بارش ہو رہی ہے کہ میری تو جان نکلی جا رہی ہے کہ خدانخواستہ کچھ ہو نہ جائے...... کاش

ہم گھر سے ہی نہ نکلتے۔"

"اللہ سے دعا کرو...... بارش تھم جائے...... مجھے بھی اتنی کم اسپیڈ میں کار بند ہونے کا اندیشہ ہے۔" اصم کا انداز سرسری تھا مگر آنکھوں میں فکر و پریشانی سی در آئی تھی۔ سڑک پر پھسلن سی ہو رہی تھی۔ گاڑی کو بہت مہارت اور محتاط ہو کر چلاتے ہوئے بھی اُسے کئی خدشے لاحق تھے۔ اروی بھی اُس کے پہلو میں سہمی سی بیٹھی تھی۔ اصم اس وقت دوہری پریشانی میں تھا۔ ایک تو گھر والوں سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ دوسرے بارش میں گاڑی چلانا مشکل ہو رہی تھی۔ راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر کہیں ٹھہرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ سو وہ گاڑی آگے بڑھانے پر مجبور تھا۔ گاڑی نے مزید کچھ فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک وہ اصم کے قابو سے باہر ہوگئی۔

بارش کی تیزی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اصم کی گاڑی بھی زوردار آواز و چرچراہٹ سے سڑک پر لہراتی اُلٹ کر سائیڈ پول سے ٹکرا گئی تھی۔ اروی کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرانے کے بعد کھڑکی سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا اور وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

اصم بھی ونڈ اسکرین کے ٹوٹنے سے بری طرح زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اُس کے بعد دونوں کو ہوش نہیں تھا کہ اُن کے ساتھ کیا ہوا۔ کتنے زخم آئے کہاں کہاں سے ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ دونوں بے یارو مددگار برستی بارش میں اُلٹی ہوئی گاڑی میں پڑے تھے۔ گاڑی کی ٹنکی سے پیٹرول رس رس کر پھیلنے لگا تھا۔ اُن کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اللہ ہی جانتا تھا۔

☆......☆......☆

"یا اللہ میرے بچوں کی حفاظت فرما...... انہیں اپنی امان میں رکھنا پروردگار۔" زبیدہ کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ اصم اور اروی شام ڈھلے وہاں سے نکل گئے تھے۔ تب سے اُن کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔

احمد حسن سے فون پر رابطہ ہوا تھا۔ انہوں نے اطلاع دے دی تھی اُس وقت سے وہ جائے نماز بچھائے اللہ کے حضور دعا گو تھیں۔ شریح خان بار بار انہیں سمجھا رہے تھے۔ اب بھی اُن کی گریہ زاری و بے قراری دیکھ کر تسلی آمیز انداز میں انہیں مخاطب کیا۔ "بس زبیدہ...... اللہ بہتر کرے گا۔ اس طرح پریشان ہو کر خود کو نڈھال مت کرو۔ آجائیں گے بچے...... موسم تو بدلنے دو۔"

"موسم نے ہی تو پریشان کر دیا ہے۔ پچھتا رہی ہوں کہ کیوں میں نے انہیں بھیجا تھا۔ نہ میں بھیجتی اور نہ وہ اس طرح پھنستے۔" زبیدہ کو پہلی بار اس طرح بے حوصلہ سا دیکھ کر شریح خان کو تشویش ہو رہی تھی۔

"اُن کا جانا مقرر تھا۔ تم کیوں پچھتا رہی ہو۔"

"وہ پتہ نہیں کہاں ہوں گے کس حال میں ہوں گے۔ میرے دل کو قرار نہیں آرہا۔" وہ جائے نماز سے اُٹھ کر اُسی تڑپ سے گویا ہوئیں تو شریح خان نے انہیں تھام کر بستر پر بیٹھا کر پھر سے تلقین کی۔

"آجائے گا قرار بھی آپ کچھ دیر کے لیے سو جائیں...... اس طرح جاگنے سے ٹینشن بڑھے گی کم نہیں ہوگی میں آپ کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہا ہوں۔" نہایت نرمی اور محبت کے عالم میں وہ بی بی جان کو 'آپ' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

زبیدہ کو بھی ایکدم احساس ہوا تھا کہ وہ اپنی پریشانی میں اُن کی ذات کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔ شام

سے وہ مسلسل بے آرام و مضطرب اُن کی دلجوئی میں لگے ہوئے تھے۔
''ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں سونے کی..... آپ بھی سو جایئے۔'' شریح خان انہیں سنبھلتے دیکھ کر مطمئن ہو کر لیٹ گئے تھے۔

☆......☆......☆

نجانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ وہ دونوں برستی بارش میں ہوش و خرد سے بیگانہ موت و زیست کی کشمکش میں پڑے تھے۔ بارش کی رفتار دھیمی ہو چکی تھی۔ دو موٹر سائیکل سوار وہاں سے گزرے تو الٹی ہوئی گاڑی دیکھ کر انہوں نے پولیس کو فون کر کے حادثے کے متعلق اطلاع دی۔ پولیس اور ایمبولینس آنے تک ایک گھنٹہ مزید گزر چکا تھا۔
زخموں سے چور اصم کے جسم سے خون کافی بہہ چکا تھا۔ اروی کو سر کے علاوہ بھی چوٹیں آئیں تھیں۔ جبکہ اسپتال میں ابتدائی طبی امداد کے دوران ہی ایکسرے اور اسکیننگ سے اصم کے دائیں بازو اور دائیں ٹانگ ٹوٹنے کا بھی پتہ چل گیا تھا۔ گاڑی سے ملنے والے سامان (کاغذات) سے اصم کے گھر رابطہ کیا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

شارم، ضیغم بھی ٹی وی سے ملنے والی موسمی اطلاعات پر فکرمند اور پریشان تھے۔ گھر کے کسی فرد نے بھی ٹھیک طرح کھانا نہیں کھایا تھا۔ بی بی جان تو کمرے سے ہی نہیں نکلیں تھیں۔ اُن کے حوالے سے بھی سب کو تشویش تھی۔ مگر کیا کیا جاتا سبھی مجبور و بے بس تھے۔ رات گئے تک انتظار کے بعد سبھی اپنے اپنے کمروں میں بند ہو گئے تھے۔
ضیغم ابھی سویا ہی تھا کہ اُس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ثمن کے ساتھ ضیغم بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رات کے بارہ بجے اُس کے سیل فون پر کال آنا ناممکن سا تھا۔ کیونکہ سبھی کو اُن کی روٹین کا علم تھا۔ ضیغم کے چہرے پر پریشانی اور ثمن کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ہونے لگی تھی۔
''ضیغم کال ریسیو کریں..... شاید اصم ہی کی کال ہو۔'' ثمن نے بالآخر اپنے حواس قابو کرتے ہوئے شوہر کو متوجہ کیا تو ضیغم نے بھی چونکتے ہوئے سرہانے پڑا اپنا موبائل فون اٹھا کر نا آشنا سا نمبر دیکھ کر تشویش سے کال ریسیو کی۔ فون کال اسپتال کی ایمرجنسی سے تھی۔ ضیغم کو ملنے والی اطلاع نے بے یقین و حواس باختہ سا کر دیا تھا۔ وہ رابطہ منقطع ہونے کے باوجود بھی کان موبائل لگائے بیٹھا تھا۔
''ضیغم..... کس..... کا فون تھا..... کیا..... با..... ت ہے؟'' ثمن کو بھی کسی انہونی کا اندیشہ سا ہوا۔ تبھی اُس کی آواز بھی گھٹ رہی تھی۔
''وہ..... اصم..... ایکسیڈنٹ.....''
''کیا کہہ رہے ہیں؟'' ثمن بھی بے یقین ہوئی۔ ضیغم کو آخر خود کو سنبھالنا ہی پڑا۔
''ہاسپٹل سے کال تھی۔ اصم کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں..... شارم کو لے کر ہاسپٹل جا رہا ہوں۔ پلیز بی بی جان یا بابا جان کو ابھی خبر نہ ہو۔'' بات کرتے کرتے ضیغم نے اپنی قمیض کی جیب میں فون، بٹوہ اور کریڈٹ کارڈز وغیرہ رکھے۔ گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے ثمن کو پھر سے مخاطب کیا۔

''دعا کرنا کہ وہ دونوں خیریت سے ہوں۔''

''اسی بات کا ڈر تھا۔ کاش وہ وہیں ٹھہر جاتے...... ضیغم...... میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ نجانے کتنی چوٹیں آئی ہوں گی دونوں کو۔'' ثمن آبدیدہ ہوگئی۔ اصم سے محبت وانس بھی تو بے حد تھا۔

''پہلے ہمیں جا کر صورت حال دیکھنے دو...... خواہ مخواہ پریشانی نہ بڑھاؤ...... کہہ رہا ہوں نا بی بی جان کو ابھی معلوم نہیں ہونا چاہیے۔'' ضیغم چڑ کر بولتے ہوئے کمرے سے باہر نکل کر شارم کے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہلکی ہلکی دستک کے جواب میں شارم مندھی مندھی آنکھوں کے ساتھ کمرے سے برآمد ہوا اور پھر ملنے والی اطلاع پر وہ بھی پریشان ہو اٹھا۔ یہ پہلا موقع تھا وہ دونوں بی بی جان یا بابا جان کو مطلع کیے بغیر گھر سے نکل کر آئے تھے۔

☆......☆......☆

اصم کے بازو اور ٹانگ پر پلاسٹر چڑھ چکا تھا۔ سر پر لگنے والے کانچ کی وجہ سے اُس کی حالت تشویشناک تھی۔ اروی کو بھی سر میں ہی چوٹ لگی تھی۔ وہ بھی فی الحال بے ہوش تھی اور آئی سی یو میں تھی۔ ضیغم اور شارم کے لیے دونوں کی حالت تکلیف دہ تھی۔

یہ شکر تھا کہ انہیں اپنے ہی شہر میں لایا گیا تھا۔ وہ انہیں فوری طور پر پرائیویٹ اسپتال میں منتقل کرانے کے انتظامات میں لگ گئے تھے۔ ثمن بھی مسلسل اُن سے رابطے میں تھی۔ سبرینہ اور ثمن بھی بے چین و بے کل سی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔

سبرینہ اس حادثے کا ذمہ دار اروی کو ٹھہراتی اپنے موقف پر قائم تھی۔

''ثمن بھابی آپ مانیں یا نہ مانیں اروی نے اپنے شوق میں اصم کو ایسے خطرناک موسم میں نکلنے پر مجبور کیا ہوگا اور دیکھ لیں نتیجہ......'' ثمن نے فوراً تردید کی۔

''اصم کو ہم جانتے ہیں...... اپنی من مانی میں نکلا ہوگا۔ اُس کے سسر نے بابا جان کو بتایا ہے اُن کے روکنے پر بھی نہیں رُکا۔''

''اتنا بے لحاظ بھی نہیں ہے کہ کسی کی بھی نہ مانے۔'' سبرینہ کی اپنی ہی سوچ تھی۔ ثمن نے اُسے قدرے افسوس سے دیکھا۔ پھر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگی۔

''اب اِن باتوں کا کیا ذکر، مقدر میں یہ ایکسیڈنٹ ہونا لکھا تھا ورنہ تو وہ آج جانے والے ہی نہیں تھے۔''

''مجھے تو یہ پریشانی ہے بی بی جان اور بابا جان کو یہ اطلاع کیسے دیں گے کہ......'' اُس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ بی بی جان لاؤنج میں اُن کی باتیں سنتی داخل ہوئی تھیں۔ دراصل پریشانی میں نیند تو انہیں بھی نہیں آرہی تھی۔ اور شریح خان بھی کروٹیں بدل رہے تھے۔

''کیس...... ی...... اطلاع......؟ کیا ہوا ہے ثمن...... بتاؤ مجھے۔'' بی بی جان کی پریشانی وحیرانی دیدنی تھی۔

''میر...... ا...... اصم...... تو...... ٹھیک...... ہے...... نا؟''

''بی بی جا...... ن آپ؟'' دونوں ہی چونک کر متوجہ ہوئی تھیں۔

''آپ جاگ رہی ہیں اب تک؟'' ثمن سے اپنے تاثرات سنبھالنے مشکل ہو رہے تھے۔
''تم دونوں کیوں جاگ رہی ہو...... سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے، اصم کی کیا خبر ہے۔'' بی بی جان کو اپنے خدشات سچ ہونے کا یقین سا ہوا۔
''وہ...... بی بی...... جان...... گاڑی...... کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ دونوں ٹھیک ہیں...... اور......''
''ایکسیڈنٹ...... ہائے میرا بچہ...... کہاں ہے کدھر ہے...... مجھے اُس کے پاس لے چلو...... ضیغم...... اُسے بلاؤ جلدی۔'' بی بی جان کے حواس جیسے قابو میں نہیں تھے۔ شریح خان بھی ساری باتیں سن کر آ گئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ اُن کی طرف لپکیں اور پھر صدمے سے چکرا کر گر پڑیں۔
ثمن اور سبرینہ کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ انعم اور نیلم بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل کر آ گئی تھیں۔ سبھی دوہری پریشانی سے دوچار تھے۔ شریح خان ضیغم سے رابطے کے بعد ساری صورتِ حال جان کر بی بی جان سمیت (اُن کی بے ہوشی میں ہی) سبھی کو لے کر ہاسپٹل پہنچے۔
اصم اور اردئی کے ساتھ بی بی جان کی ٹریٹمنٹ بھی ہو رہی تھی۔
وہ شاک میں تھیں اور سب گھر والے پریشان و بے قرار اِدھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ کیونکہ اصم کا دوبارہ آپریشن ہو رہا تھا۔ انعم کے لیے یہ صورتِ حال ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ اصم پر اُس کا دعویٰ جو بہت تھا۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ اپنا غبار بھی نکال رہی تھی۔
سبھی خواتین بی بی جان کے کمرے میں موجود تھیں۔
''اصم بھائی کی زندگی تو اُسی دن نحوست کی نذر ہو گئی تھی جس دن وہ منحوس لڑکی اُن کی زندگی میں آئی تھی۔'' وہ اپنی سوچوں کا با آوازِ بلند اظہار کر کے اٹھی تو سبھی نے اُسے چونک کر دیکھا۔
نیلم تو اپنی حیرانگی میں اُسے ٹوک بھی گئی۔
''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں انعم آپی......''
''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں وہ ایسی ہی قسمت والی ہوتی تو اُس کی بارات نہ واپس چلی جاتی۔ خواہ مخواہ میں ہمارے بھائی کی زندگی خراب کرنے چلی آئی۔ بیٹھے بٹھائے انہیں مصیبت میں ڈال دیا بلکہ......''
انعم نے سسکی روکتے ہوئے بات مکمل کی۔
''بلکہ...... ہم سب کو بھی۔''
''انعم...... یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے، خود کو سنبھالو۔'' ثمن بھابی نے مصلحتاً نرمی سے ٹوکا تو وہ سر جھٹک کر مزید بھڑاس نکالنے لگی۔
''بھابی جان میں کیسے خود کو سنبھالوں؟ اصم بھائی زخمی پڑے ہیں۔ صرف ار...... دئی کے میکے جانے کے شوق کی وجہ سے...... خدانخواستہ میر...... ے بھائی کو کچھ ہو گیا تو...... میں......''
''خدا کے لیے انعم آپی...... اس وقت چپ ہو جائیں بی بی جان کی حالت دیکھیں۔ وہ صدمے سے دوچار ہیں۔ بھائی کا آپریشن ہو رہا ہے، ہمیں اُن کے لیے دعائیں کرنی چاہئیں۔ یہ بحث بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔'' نیلم خود بھی دلبرداشتہ تھی۔ روتے روتے انعم سے منت سی کرنے لگی۔
سبرینہ نے بھی اپنے طور پر انعم کی تائید کرتے ہوئے اپنا فرض ادا کیا۔

''انعم تم اپنی جگہ پر ٹھیک ہو گڑیا۔ جس دن سے اصم کی شادی ہوئی ہے۔ تمہارے ساتھ مسئلے ہو رہے ہیں۔ اصم کی اپنی زندگی خطرے میں ہے اب، اور آئندہ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے وہ ہمارے ساتھ جڑ گئی ہے ہمیں برداشت تو کرنا پڑے گا۔'' سبرینہ کا لہجہ دبا ہوا تھا جسے صرف انعم ہی سن رہی تھی۔

ثمن ویسے بھی صوفے سے اٹھ کر بی بی جان کے قریب جا کھڑی ہوئی تھی اُن کی بند آنکھوں میں جنبش سی ہو رہی تھی۔ اور اُن کے لب بھی حرکت میں تھے۔

''میر...... ا...... اصم...... میرا بچہ......'' بے آواز بات کو بھی ثمن نے سمجھ کر سبرینہ کو پکارا۔

''سبرینہ...... جاؤ ڈاکٹر کو بلاؤ بی بی جان کو شاید ہوش آ رہا ہے۔'' سبرینہ بھی فوراً کمرے سے باہر لپک گئی۔ انعم اور نیلم بھی اُٹھ کر اُن کے بستر کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔

☆......☆......☆

شریح خان، ضیغم اور شارم پریشانی کے عالم میں آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑے تھے۔ شریح خان اپنے دکھ اپنی تکلیف کو دبانے کی کوشش میں ناکام ہو کر آخر اشک چھلکانے پر مجبور ہو گئے۔ اصم کی تکلیف کا احساس ہی سب کے لیے سوہانِ روح تھا۔ ضیغم اور شارم نے بابا جان کے آنسو رواں دیکھے تو وہ دونوں انہیں حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگے۔

''بابا جان...... آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ اللہ نے کرم کیا ہے دونوں کی جان بچ گئی او...... ر!'' ضیغم کی بات اُن کا حوصلہ بڑھانے کے بجائے تڑپا گئی۔

''جا...... ن تو بچ گئی ہے بیٹا مگر خطرہ تو ابھی...... بھی ہے نا...... سنا نہیں ڈاکٹر نے کیا کہا ہے...... ٹانگ کے حوالے سے...... تین جگہ سے ہڈی ٹوٹی ہے۔ خدانخواستہ ڈاکٹرز کی کوشش میں کمی رہ گئی تو میرا بچہ تو محتا...... ج...... !''

شارم نے اُن کے خدشات پر فوراً تڑپ کر انہیں ٹوکا۔

''خدا نہ کرے بابا جان...... اللہ سے اچھی امید رکھیں۔ سب سے بڑا سرجن آپریشن کر رہا ہے انشاء اللہ رزلٹ اچھا ہی آئے گا۔ آپ بس دعا کریں۔ سارے مرحلے خیریت سے طے ہوں۔''

''آمین...... اصم جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔'' ضیغم نے بھی تائیداً اُن کا کندھا سہلا کر اظہار کیا تو وہ بھی سر ہلا کر بولے۔

''میرا تو رواں رواں اپنے بچوں کے لیے دعا گو ہے۔ اروی کی کنڈیشن کیسی ہے۔ اُس کے بارے میں کیا کہتے ہیں ڈاکٹر۔'' آخر شریح خان نے خود کو سنبھال لیا۔

''اُسے سر میں چوٹ لگی ہے بابا جان۔ بہتر ٹریٹمنٹ سے وہ بھی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔'' باپ کو سنبھلتے دیکھ کر ضیغم نے بھی قدرے اطمینان کا سانس لیا۔

''احمد حسن کو بھی اطلاع کر دو۔ وہ لوگ بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' شریح خان نے ضیغم کو ذمہ داری سونپی۔ خود کو وہ احمد حسن سے بات کرنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے۔

☆......☆......☆

بی بی جان کوڈاکٹرز دیکھ کر چلا گیا تھا۔ وہ اب اپنے حواسوں میں تھیں۔ البتہ اصم کے لیے بیقراری سے روئے جارہی تھیں۔ انہیں اندر ہی اندر یہ پچھتاوا تھا کہ اصم کوانہوں نے ہی بے موقع دوسرے شہر جانے پر مجبور کیا تھا۔

ثمن بار باراُن کی دلجوئی کر کے انہیں بہلانے کی کوشش کررہی تھی۔

''بی بی جان آپ اس طرح روتی رہیں گی تو آپ کی طبیعت پھر خراب ہو جائے گی۔ آپ حوصلہ رکھیں وہ دونوں جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''کیسے حوصلہ کروں ثمن...... میرے بچے تکلیف میں ہیں۔ اور وہ بھی میر...... کی وجہ سے...... مجھے سکون آسکتا ہے؟'' بی بی جان کواس طرح ٹوٹتے پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ نیلم فوراً اُن سے لپٹ سی گئی۔

''آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں بی بی جان آپ کی غلطی...... آپ ہی تو بتاتی ہیں کہ ہر عمل مقدر کا محتاج ہے۔ شکر کریں بھائی اور بھابی کی جان بچ گئی۔ وہ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے۔''

''تو اور کیا...... آپ نے تو بھلائی کے لیے ہی انہیں بھیجا تھا۔ غلطی تو اروی کی ہوئی یا اُس کے گھر والوں کی...... کیا تھا وہ ایک رات بیٹی داماد کو اپنے گھر روک لیتے۔'' انعم کو پھر سے بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا انہوں نے روکا نہ ہو۔ بس نصیب میں یہ حادثہ لکھا تھا تبھی تو۔'' بی بی جان نے سنجیدگی سے تردید کرتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔

''بی بی جان...... اصم بھائی کے ساتھ ہی نصیب سارے کھیل کھیل رہا ہے۔ خدا خیر کرے۔'' انعم کی کھولن کم نہیں ہو رہی تھی۔ اروی اگر سامنے موجود ہوتی تو وہ نجانے کیا کر جاتی۔

''انعم...... م تم اتنی ٹینشن مت لو...... تمہاری خود کی حالت ایسی نہیں ہے کہ...... میری مانو تو ڈرائیور کے ساتھ گھر جا کر آرام کرو۔'' ثمن نے بہت نرمی و مصلحانہ انداز میں انعم کو چپ کروانے کی کوشش کی تو بی بی جان کو بھی اُس کی فکر ہونے لگی۔

''ثمن ٹھیک کہہ رہی ہے انعم...... تم گھر جا کر آرام کرو۔ تمہارے سسرال والے تو پہلے ہی تم سے شاکی ہیں۔ انہیں مزید کوئی موقع نہ دو۔''

''میں اصم بھائی کے ہوش میں آنے سے پہلے ہرگز گھر نہیں جاؤں گی اور رہی میرے سسرال والوں کی بات تو وہ خود موقع نکال لیتے ہیں۔ انہیں میری پرواہ نہیں ہے بی بی جان...... آپ اُن کی فکر نہ کیا کریں۔'' بے موقع موضوع تھا۔ بی بی جان نے اُسے بے بسی سے دیکھا اور پھر سبھی خاموش ہو گئے۔

آخر کوئی کیا کہتا۔ کوئی بھی تو واپس جانے کو تیار نہیں تھا جب تک کوئی خیر کی خبر نہ مل جاتی۔ شدید بارش کے بعد خوشگوار تبدیلی تو آئی تھی۔ مگر بہت سے لوگوں کے لیے یہ تبدیلی وخوش گواریت بے معنی اور بے اثر ہی ثابت ہوئی تھی۔ شریح خان اوراُن جیسے نجانے کتنے لوگ حادثوں کا شکار ہوئے اپنے پیاروں کو دیکھ کر زندگی کے موسم سے نالاں وشاکی سے ہوئے بیٹھے تھے۔

احمد حسن اور زہرا کی نیند بھی روٹھی ہوئی تھی۔ بجلی کا نظام معطل تھا۔ ایسے میں نظام زندگی بھی جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ نہ رات بھر نیند آئی تھی نہ ہی وقت کٹ رہا تھا دونوں کی سوچیں موسم کی خرابی سے پیدا ہونے والی ناخوشگواریت کے علاوہ گھر سے جانے والے بیٹی داماد میں بھی اٹکی ہوئی تھیں۔ جن کی خیر خبر تھی نہ کوئی اطلاع۔

آخر صبح صادق زہرا سے نہ رہا گیا تو لاچاری سے احمد حسن کو مخاطب کیا۔
''احمد حسن...... اب تو غیر مناسب وقت نہیں ہے۔ اُدھر رابطہ کر کے اصم اور اروئی کا تو پتہ کریں خیریت سے پہنچ گئے تھے ناں۔''
''افوہ...... کر لیتا ہوں پتہ...... دن تو چڑھنے دو۔ پتہ نہیں کب پہنچے ہوں گے بچے...... تمہیں بتایا تو تھا دس گیارہ بجے خان صاحب (شریح خان) کا فون آیا تھا۔ تب تک نہیں پہنچے تھے۔''
''اب تو صبح ہوگئی ہے۔ پتہ تو کرو۔ میں تو ساری رات ہولتی رہی ہوں کہ کہیں کچھ ہو نہ گیا ہو...... جو......'' زہرا نے احمد حسن کی جھنجلاہٹ کی پرواہ نہ کی تو وہ مزید زچ سا ہوا۔
''ایک تو تم اور تمہارا دل بلاوجہ ہولتے اور ہولاتے رہتے ہیں۔ خیر مانگو اللہ سے۔''
''خیر ہی مانگتی ہوں پر دل میں جو متا ہے اُس کا کیا کروں...... مجھے کچھ وہم سا ہو رہا ہے احمد حسن کہ اروئی......'' صحن میں بچھی چار پائی پر بیٹھی زہرا احمد کا چہرہ کسی انہونی کے خوف سے پھیکا سا تھا۔
اُس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ احمد حسن کے موبائل فون کی گھنٹی بجی تھی اور ماحول میں ارتعاش وسراسیمگی پھیل گئی تھی۔ دونوں ہی ایسے چونکے تھے جیسے کوئی ہنگامی بگل بجا ہو۔ زہرا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ احمد حسن نے تیسری گھنٹی پر ڈرتے ڈرتے سرہانے پڑا سیل فون اُٹھا کر دیکھا تو ضیغم کے موبائل نمبر سے کال آرہی تھی۔ ضیغم کا نام پڑھتے ہی احمد حسن کا ماتھا بھی ٹھنکا تھا اور پھر ضیغم سے بات کر کے جو خبر انہیں موصول ہوئی تھی وہ حواس گم کر دینے والی ہی تھی۔
خدشے سچ ثابت ہو جائیں تو اشک تھمتے ہیں نہ قدم...... زہیر اور وردہ بھی جاگ گئے تھے۔ زہرا کا رونا بلکنا بند نہیں ہو رہا تھا۔ احمد حسن اور زہیر بمشکل انہیں سنبھالتے، بہلاتے قدرے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں بھی ضبط کی تلقین کے ساتھ لے کر نکلے۔ آخر بیٹی کا معاملہ تھا وہ کیسے خود کو رد کتے، وردہ بھی گم صم سی ہوگئی تھی۔ اسپتال پہنچ کر انہیں مزید دھچکا لگا تھا۔ معمولی حادثے کی خبر پر ہی وہ ہلکان سے تھے اصم اور اروئی کی حالتیں دیکھ کر تو زہرا کا ضبط ہی جواب دے گیا۔ اصم پلاسٹر اور پٹیوں میں جکڑا ہوا اپنی مخدوش حالت میں سبھی کے لیے باعث تکلیف تھا۔ جبکہ اروئی کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ سر کی واضح چوٹوں کے علاوہ اُسے اندرونی چوٹیں بھی آئی تھیں اور وہ بھی مسلسل بے ہوش تھی۔
زہرا مسلسل روئے جارہی تھی۔ وردہ اُن سب سے مرعوب سی ماں کو سنبھالنے کی کوشش میں تھی۔
''امی...... اب چپ ہو جائیں۔ آپ کا اس طرح رونا انہیں برا نہ لگ جائے۔'' دبے دبے لہجے میں وردہ نے ماں کو ایک بار پھر ٹوکا تو وہ برا مان گئیں۔
''برا لگتا ہے تو لگے...... میں اپنی بچی کے لیے رو رہی ہوں...... حالت دیکھو اُس کی، اکیلی پڑی ہے کمرے میں، کسی نے اُدھر جھانکا تک نہیں۔'' سسکتے ہوئے ذرا آواز بھی اونچی ہوگئی۔
''امی آئی سی یو میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اصم بھائی کے لیے بھی تو سبھی باہر کھڑے ہیں۔ آپ فضول میں محسوس کر رہی ہیں، چلیں اِدھر کرسی پر چل کر بیٹھیں۔''
وردہ انہیں زبردستی آئی سی یو کے دروازے سے کھینچ کر کرسیوں کی قطار کی طرف لے آئی۔ اُسے کسی بدمزگی کا احتمال تھا۔ کیونکہ اسپتال کے عملے کے لوگ کئی بار انہیں وہاں سے ہٹنے کا کہہ چکے تھے۔

اروی کو آئندہ چوبیس گھنٹوں میں ہوش میں آنے کی اطلاع ڈاکٹر نے دے کر اُس کے حوالے سے کچھ اطمینان تو انہیں فراہم کر دیا تھا۔ البتہ اصم کو ابھی بھی آئندہ چوبیس گھنٹے تک بے ہوش رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ سب لوگ ہنوز اسپتال میں موجود تھے۔ فائق' بلال' صالحہ اور بلال ورانی بھی خبر ہوتے ہی اسپتال چلے آئے تھے اور اپنے اپنے طور پر انہیں تسلیاں دلاسے دے رہے تھے۔

اصم کا دوست فیصل اپنے گھر سے سبھی کے لیے چائے اور کھانا بنوا کر لایا تھا مگر باوجود اصرار کے سوائے چائے کے کسی کے حلق سے ایک نوالہ تک نہ اترا تھا۔

بی بی جان اور زہرا تو جائے نماز بچھائے بیٹھی تھیں۔ انعم کو زہرا کا یہ عمل بھی دکھاوا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی پریشانی کے باوجود سبرینہ سے سرگوشی میں باتیں کرتے ہوئے قدرے تلخی سے بولی۔

''اب اس دکھاوے کی عبادت کا فائدہ؟ اچھا ہوتا کل ہی اصم بھائی اور اپنی بیٹی کو روک لیتے۔ اونہہ جیسے انہیں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔''

سبرینہ نے اُسے اشارے سے چپ کرایا کیونکہ وردہ اُن کے قریب کچھ کہنے آئی تھی اور اُس کے چہرے کا اڑا رنگ اور آنکھوں میں دکھ کی نمی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ انعم کی بات سن چکی ہے۔ لمحہ بھر کو انعم کے چہرے کا رنگ بھی بدلا تھا لیکن پھر اُس نے سر جھٹک کر اپنے لحاتی احساسِ شرمندگی کو بھی جھٹک دیا تھا کہ اگر وردہ نے اُس کا تبصرہ سن بھی لیا تھا تو اُس کی بلا سے۔

''ک...... کیا...... بات ہے؟'' سبرینہ نے جلد ہی خود کو سنبھال کر مروت بھرے لہجے و چہرے کے ساتھ بات سنبھالی۔

''کچھ چاہیے۔'' وردہ کا سر میکانکی انداز میں نفی میں ہلا۔

''نہ...... وہ...... آ...... نٹی...... بلا رہی ہیں...... کسی کو بھی۔'' وردہ کی آواز بمشکل حلق سے برآمد ہوئی تھی اور پھر وہ فوراً ہی واپس پلٹ گئی۔ سبرینہ نے کچھ گھبرا کر انعم کو باور کرایا۔

''انعم...... تمہاری بے سوچے سمجھے بولنے کی عادت اچھی نہیں ہے۔ کسی دن بہت برا ہو سکتا ہے۔ یقیناً اُس نے تمہاری بات سن لی تھی۔'' انعم سبرینہ کی گھبراہٹ پر اُسے حیرانگی سے دیکھنے لگی۔

''میں نے کچھ غلط کہا ہے؟ سن لیا ہے تو اچھا ہے ناں اپنی غلطی کا احساس تو ہو۔'' انعم کے لیے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے دلائل تھے۔

سبرینہ اُسے دیکھ کر آخر خاموش ہو گئی اور پھر اُٹھ کر بی بی جان کے پاس آ گئی۔ زہرا اُس وقت اُن کے پاس سے اُٹھ کر اروی کو دیکھنے آئی سی یو کی طرف گئی تھی۔

بی بی جان کی بے قراری کو کچھ قرار آیا تھا' اللہ کے سامنے گڑگڑانے کے بعد' سب اچھا' ہونے کا یقین سا دل میں اُترا تھا تبھی اُن کی توجہ باقی لوگوں کی طرف بھی بٹ گئی تھی۔ سبھی اس ناگہانی افتاد پر پریشان و بے حال نظر آ رہے تھے۔

اروی کے گھر والے تو اُن سے زیادہ تکلیف میں تھے۔ بے بس سے گھٹے گھٹے شرمندہ شرمندہ سے' جیسے اس سارے معاملے میں اُن کا ہی قصور رہا تھا۔ زہرا کا بار بار اظہارِ ملال اور برستے آنسو بی بی جان پر اُن کی اندرونی کیفیات عیاں کرنے کے لیے کافی تھے۔ انہیں اس احساس سے نکالنے کے لیے ہی بی بی

جان نے خود کو سنبھالا تھا اور سبرینہ کو بلوایا تھا۔
"جی بی بی جان...... آپ نے بلوایا تھا...... کچھ چاہیے آپ کو؟" سبرینہ اُن کے پاس کرسی پر ٹک کر پوچھنے لگی تو انہوں نے ہنکارا سا بھرا۔
"ہونہہ...... ہاں...... مجھے تو فی الحال کچھ نہیں چاہیے۔ میں چاہ رہی تھی تم اروی کی امی اور بہن کو بلکہ اُس کے ابو اور بھائی کو بھی شارم کے ساتھ گھر لے جاؤ۔ بے چارے صبح کے آئے ہوئے ہیں۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے اور......"
"تو...... وہ اپنی مرضی سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم سے زیادہ دکھ تو نہیں ہے انہیں۔" انعم بھی سبرینہ کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔
"اں...... عم......" بی بی جان نے اُسے فہمائشی انداز میں پکارا۔
"میں دیکھ رہی ہوں تمہارا رویہ کچھ اچھا نہیں ہے اروی کے گھر والوں کے ساتھ۔"
"میں نے کیا کہا ہے انہیں...... مجھے کوئی شوق نہیں ہے اُن سے بات کرنے کا۔" انعم کی تلخی اُس کے لہجے میں بھی اُتر آئی تھی۔ بی بی جان نے کافی دکھ آمیز نظروں سے اُسے دیکھا۔
"پتہ نہیں تم کب خود کو بدلو گی...... بہر حال تم بھی اب گھر جا کر آرام کرو۔ تمہارے لیے بھی یہ بے آرامی اچھی نہیں ہے۔ ڈرائیور کے ساتھ ان لوگوں کو بھیج دو اور سبرینہ تم شارم کے ساتھ انعم کو بھی گھر لے کر جاؤ۔ خدانخواستہ اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔" بی بی جان نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو سبرینہ نے تائید اً سر ہلایا مگر انعم مزاحمتی لہجے میں بولی۔
"میں کیوں جاؤں...... اصم بھائی کو ابھی ہوش ہی نہیں آیا۔ میں نہیں جاؤں گی۔"
"اللہ بہتر کرے گا بس تم جاؤ' ہمیں دوہری پریشانی نہ دو۔" بی بی جان نے اُسے سنجیدگی سے دیکھ کر کہا تو وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ بس جھنجلاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ سبرینہ نے جا کر زہرا کو گھر چلنے کی پیش کش کی جسے انہوں نے بھی بڑے سبھاؤ سے رد کر دیا۔
"بیٹا ہمارے بچے ابھی تک بے ہوش ہیں۔ اُن کی تکلیف کے آگے ہماری یہ ذرا سی بے آرامی کیا معنی رکھتی ہے۔ ہم یہاں سے تبھی جائیں گے جب اصم اور اروی کو ہوش آ جائے گا۔"
سبرینہ اُن سے مزید کیا کہتی بی بی جان کو اُن کی بات پہنچا کر وہ تو ایک بڑی ذمہ داری کی کوفت سے بچ گئی تھی ورنہ وہ تو سوچ رہی تھی اروی کے گھر والے اگر اُس کے ساتھ گھر چلے جاتے تو اُسے ناچار اُن کی آؤ بھگت کرنا پڑ جاتی۔
ثمن اور عظیم بی بی جان کی ہدایت کے مطابق صدقات کے طور پر بکرے ذبح کروا کر رفاعی اداروں میں دے کر بھی کے لیے گھر سے چائے اور سینڈوچز بنوا کر لائے تھے۔ ثمن کے اصرار پر زہرا نے تو ایک کپ چائے اور ایک ٹکڑا سینڈوچ تو لے لیا تھا مگر وہ نے سنجیدگی سے منع کر دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ مجھے طلب نہیں ہے بھابی جان۔" زہرا کو بیٹی کا انکار کھٹک گیا تھا۔
گو کہ سبرینہ انعم اور شارم جا چکے تھے پھر بھی وہ وہ بہت خاموشی سے ماں کے ساتھ تقریباً لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

شمن کے وہاں سے فاصلے پر جانے کے بعد زہرا نے وردہ کو سرگوشیانہ مخاطب کیا۔
''کیا بات ہے وردہ...... تم نے چائے کیوں نہیں پی۔ وہ اتنا اصرار کر رہی تھی۔'' وردہ نے ماں کو نم آنکھوں سے دیکھا۔
''امی...... اُن کا اصرار بھی دکھاوا تھا۔''
''کیا مطلب...... ؟ کیسا دکھاوا؟'' زہرا کی حیرت واضح تھی۔
''امی...... یہ لوگ جیسے نظر آ رہے ہیں دراصل ایسے ہیں نہیں۔'' وردہ انعم کی باتوں سے دلبرداشتہ سی رُندھے گلے سے بولی تو زہرا پریشان سی ہوگئی۔
''کیا بول رہی ہو تم...... سبھی کتنا پیار اور خلوص سے مل رہے ہیں' اپنی پریشانی میں بھی کتنا خیال کر رہے ہیں ہمارا...... ہمارا احساس ہے انہیں اور تم......'' وردہ نے نفی میں گردن ہلا کر تردید کی۔
''نہیں امی! انہیں ہمارا یہاں آنا پسند نہیں ہے۔ انہیں ہماری پریشانی ڈرامہ لگ رہی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ......'' وردہ کی بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ نرس نے آ کر اروٰی کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی تھی۔ زہرا بے تابانہ آئی سی یو کی جانب لپک کر چلی گئیں۔ جبکہ وردہ کچھ لمحے تک تو اپنے احساسات سے نکلنے کی کوشش میں رہی۔ آخر بہن کی محبت اُس کے ہر احساس پر غلبہ پا گئی تو وہ بھی ماں کے پیچھے جا پہنچی۔
اروٰی کو ہوش تو آ گیا تھا۔ مگر زخموں اور چوٹوں کے باعث نقاہت ' کمزوری بے حد تھی اسی لیے اُس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ہوش آتے ہی اُسے پہلا خیال اصم اور اُس طوفانی رات کا آیا تھا۔ برستی بارش اور گاڑی کا بے قابو ہونا تک اُسے یاد تھا۔ اُس کے بعد اپنی ہی چیخوں کی بازگشت کے ساتھ تکلیف کا بے پناہ احساس پورے وجود میں پھیل کر خوف و ہراس سے ذہن کو بھی ماؤف کر گیا تھا۔ نجانے اصم کس حال میں تھا۔
یہ اذیت بھی ناقابلِ فراموش تھی۔ وہ اندر سے بے چین و مضطرب تھی لیکن اپنے اظہار کے لیے خود کو بے بس پا رہی تھی۔ ڈاکٹر اور نرس اُس کے پاس کھڑے تھے اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر تسلی آمیز انداز میں بولے۔
''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے مسز اصم! آپ کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جائیں گی۔''
''ا...... و...... ر...... اص...... م؟'' بمشکل ادا ہوئے لفظوں میں اُس کی اندرونی کیفیات کی جھلک نمایاں تھی۔
''وہ بھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ Dont Wory۔'' ڈاکٹر کا انداز و لہجہ پیشہ وارانہ تھا۔ اروٰی کی بے کلی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اصم کو دیکھنا چاہتی تھی مگر اس کی بے بسی ابھی اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اروٰی نے دوبارہ سے آنکھیں موند کر اپنی سوچوں کو معمول پر لانے کی کوشش کی۔
کتنی خوش تھی وہ...... زندگی نے یکدم اُسے کتنی انمول نعمتوں اور محبتوں سے آشنا کروایا تھا۔ نصیب کی نوازش تھی جو اصم جیسا شریکِ سفر' اُس کے گھر والوں جیسے ہمدرد و غم گسار لوگ اُس کے ساتھ اُس کے پاس تھے۔ اُس کے ہوش میں آنے پر سبھی خوش اور مطمئن اُسے دیکھنے، ملنے آئے تھے۔
بی بی جان کا شفیق لمس اُس کی پیشانی پر ثبت ہو کر اُسے نئی توانائی فراہم کر گیا تھا۔ امی' ابو زہیر اور وردہ کی آمد نے اُسے احساسِ گراں سے نکلنے میں مدد دی تھی۔ سبھی شکر ادا کر رہے تھے کہ وہ لوگ زندہ تھے

اور آئندہ اپنی صحت یابی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے تھے۔
بی بی جان نے بڑے سلیقے سے زہرا احمد کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
''زہرا بہن اللہ کا شکر ہے ہمارے بچوں کی جان بچ گئی۔ انشاء اللہ وہ جلد صحت یاب بھی ہو جائیں گے۔ میں دیکھ رہی ہوں احمد بھائی بھی کافی تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ بہتر ہوگا آپ اُن کے ساتھ گھر جا کر کچھ دیر آرام کر لیں۔ پھر آ جائیے گا۔'' زہرا کے چہرے پر اُلجھن اور ناسمجھی دیکھ کر انہوں نے وضاحت دی۔ تو وہ بھی گہری سانس لے کر بولیں۔
''آپ پریشان نہ ہوں زبیدہ بہن...... ہمیں جب آرام کی حاجت ہوگی تو ہم چلے جائیں گے۔''
زہرا مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ نہ آپ لوگ کچھ کھا رہے ہو...... نہ ہی گھر جا کر آرام کرنے پر راضی ہو۔ آپ نہیں جانا چاہتیں تو بچوں کو بھیج دیں۔'' بی بی جان اپنی جانب سے اخلاقیات نبھانے کی کوشش میں تھیں۔ زہرا ان کی بات سمجھ رہی تھیں اُن کے اطمینان کے لیے مسکرا کر بولیں۔
''آپ ہمیں غیر کیوں سمجھ رہی ہیں بھابی جان...... آپ بھی تو یہاں موجود ہیں اور پھر اروی کی نسبت سے ہمارا بھی کوئی فرض بنتا ہے۔ اس وقت ہمارے بچوں کو ہماری ضرورت ہے۔'' زہرا کے لہجے میں ممتا کی شدت بھی تھی۔ بی بی جان متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکیں۔ تائید اً سر ہلا کر رہ گئیں۔

☆......☆......☆

انعم اور نیلم سبرینہ کے ساتھ بیت الجنت میں واپس آ گئی تھیں۔ شارم انہیں چھوڑ کے کچھ دیر ٹھہر کر واپس چلا گیا۔ گھر میں بچوں نے الگ اودھم مچا رکھا تھا۔ سبرینہ نے آ کر ہی انہیں سنبھالا تھا۔ جبکہ انعم کا مزاج بھی بگڑا ہوا تھا۔ اروی کے گھر والوں کی وجہ سے بی بی جان نے اُسے واپس بھجوایا تھا۔ اس بات کا اُسے قلق تھا۔ اس لیے اُس نے کمرے میں آتے ہی فائق کو کال کی تھی۔ پہلے تو فائق نے اُس کی کال ریسیو ہی نہیں کی تھی مگر انعم بھی اس وقت اُسے مسلسل اُکسا رہی تھی۔ بار بار کی کوشش سے آخر فائق کی جھنجلاہٹ سی بھرپور آواز جوابی طور پر موصول ہوئی تھی۔
''انعم...... اب کیا مصیبت آ گئی ہے جو تم مجھے پریشان کر رہی ہو؟'' اُس کا لہجہ بھی بگڑا ہوا تھا۔
''کہاں...... ہیں آپ؟ مجھے گھر آنا ہے۔''
''اِس وقت......؟'' فائق نے یکدم وال کلاک کی طرف نگاہ اٹھائی۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ آفس سے آ کر سونے کے لیے لیٹا ہوا تھا اور ساتھ ہی کرکٹ میچ بھی دیکھ رہا تھا۔ اُسے انعم کی فرمائش عجیب لگ رہی تھی۔ حالانکہ وہ انعم کی ایسی فرمائشوں اور رویے کا اب عادی ہو چکا تھا۔ پھر بھی اُسے ہر بار جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔
''کیا ہوا ہے وقت کو؟ بس مجھے ابھی لینے آ جائیں۔'' انعم کی اپنی منوانے والی خو ہر وقت اُس پر حاوی رہتی تھی۔
''ابھی میں تمہیں لینے آ جاؤں' صبح پھر تمہیں چھوڑنے جاؤں۔ دماغ خراب نہیں ہے میرا...... آرام سے رہو جتنے دن رہنا چاہتی ہو۔ دل بھر جائے گا جب تو آ جاؤں گا تمہیں لینے فی الحال مجھے آرام کرنے دو۔'' فائق کے لہجے میں غصہ تھا بے زاری تھی اور یہ سب رفتہ رفتہ فائق کے لہجے میں سرایت ہوا تھا۔ اُس

کے رویے میں رچا بسا تھا۔

''اچھا......! آپ کو میری پروا نہیں ہے۔ صرف اپنے آرام کا احساس ہے۔ میرا بھائی ابھی تک ہوش میں نہیں آیا اور آپ وہاں آرام کر رہے ہیں۔''

''تو کیا چاہتی ہو تم...... تمہارے بھائی کی طرح میں بھی ہاتھ پاؤں تڑوا کر ہاسپٹل میں لیٹ جاؤں؟'' فائق کے مزاج میں تڑداہٹ در آئی تھی۔

''خدا کا خوف کریں فائق آپ...... میرے بھائی کی تکلیف کا آپ کو احساس نہیں ہے۔ اپنے یاروں دوستوں کے سر درد کی اطلاع پر بھی رات کو ہی آپ بھاگے چلے جاتے ہیں اور یہاں رسماً ایک بار آ کر فرض پورا کر دیا۔ آپ کو تو میرا بھی خیال نہیں آیا۔ دو حرف تسلی کے نہیں کہے کہ میری دلجوئی ہو جاتی...... اُلٹا مجھے باتیں سنا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے اب میں بھی جب تک نہیں آؤں گی جب تک اصم بھائی مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتے۔''

انعم نازک مزاج تھی فائق کا سرد و سپاٹ کڑوا کسیلا رویہ اکثر اُسے زچ کر دیتا تھا۔ اب بھی وہ بے بسی سے رو پڑی تھی۔

''یہی بہتر ہوگا۔'' فائق نے جلتی پر تیل چھڑک کر فون آف کر کے سرہانے پر اچھال دیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی ذات کے زعم میں اپنے آپ کو درست اور دوسروں کو غلط سمجھتے تھے۔ اسی لیے اُن میں تناؤ تھا۔ انعم نے بھی غصے میں سیل فون دیوار پر دے مارا تھا۔ شوہر سے جس قسم کی توجہ اور التفات وہ چاہتی تھی فائق نے اُس کا مظاہرہ کبھی بھی نہیں کیا تھا۔ دیوار سے ٹکرا کر پرزہ پرزہ ہوا سیل فون انعم کا منہ چڑا رہا تھا۔

☆......☆......☆

وقت کٹھن اور صبر آزما تھا مگر کٹ ہی گیا تھا۔ اصم کو ہوش بھی آ گیا تھا اور ڈاکٹرز نے اُس کی طرف سے اطمینان بھی دلا دیا تھا کہ چند مہینوں میں اُس کے بازو اور ٹانگ کے فریکچر ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر وہ نارمل زندگی گزار سکے گا۔ فی الحال وہ درد و تکلیف میں مبتلا دہری اذیت میں تھا۔

اروی بھی زخمی تھی اُس کے حوالے سے اُس کی سوچیں منتشر تھیں۔ سبھی نے اُس کے حوالے سے اطمینان دلایا تھا مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ اُس رات کی بھیانک یادیں اُس کی روح سے لپٹ گئی تھیں۔ اگر اُس کے مضبوط وجود میں اتنی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی تو نجانے اروی کس حال میں تھی۔

اروی کو پرائیویٹ کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ البتہ اصم ابھی نگہداشت میں تھا۔ سو ضیغم نے بہت اصرار سے سبھی کو گھر روانہ کیا تھا۔ زہرا اروی کے پاس ٹھہر گئی تھی۔ جبکہ احمد حسن زہیر اور روہ واپس لوٹ گئے تھے۔ آخر وہ مزید یہاں ٹھہر کر کیا کرتے۔ بیٹی کے گھر میں رکنا احمد حسن کے لیے تو مشکل تھا ہی ورنہ وہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ اروی کی غیر موجودگی میں اُس کے سسرال میں رہے۔

اصم کے پاس شارم اور ضیغم باری باری چکر لگا لیتے تھے۔ جبکہ رات کو فیصل اُس کی تیمارداری پر مامور تھا۔ فائق بھی مجبوراً رسماً ایک دو بار آیا تھا۔ یہ بات بی بی جان نے بھی محسوس کی تھی۔ تبھی وہ انعم کی جھنجلاہٹ و بیزاری بھی سمجھ گئی تھیں۔ شوہر کی عدم توجہی نے اُسے چڑچڑا کر دیا تھا۔ اب بھی وہ نیا سیل فون لینے کے لیے کہہ رہی تھی۔ بی بی جان کی پوتی پوچھنے پر جھنجلا اٹھی تھی۔

''بی بی جان کیا آپ مجھے ایک موبائل فون بھی نہیں لے کر دے سکتیں۔'' انعم بچوں کی طرح ٹھنک کر بولی تو بی بی جان نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس وقت وہ دونوں تنہا لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔

''اصم نے کچھ مہینے پہلے تمہاری سالگرہ کے موقع پر ہی تو تمہیں اتنا مہنگا آئی فون تحفے میں دیا تھا۔ اُس کا کیا کیا؟'' زبیدہ سنجیدگی سے اُس کا چہرہ بھی دیکھ رہی تھیں۔

''بتا تو رہی ہوں وہی تو ٹوٹا ہے مجھ سے...... آپ بابا جان سے کہیں نا کسی کے ہاتھ بھیج دیں، وہیں مارکیٹ میں ہی تو ہے اُن کا آفس۔'' انعم نے بنا جھجک فرمائش کی تو وہ اُسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''شاباش ہے انعم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کوئی کھلونا ٹوٹ گیا تھا۔ بھائی نے اتنا مہنگا تحفہ دیا اور تم نے چٹکی میں اڑا دیا۔ کچھ اندازہ ہے گھر میں کتنی پریشانی ہے۔''

''تو کیا میری وجہ سے ہے یہ پریشانی؟'' انعم یکدم بھڑک سی گئی تھی۔

''انعم خدا کے واسطے یوں بات بات پر الجھنا چھوڑ دو۔ میں فی الحال تمہارے بابا سے کوئی فرمائش نہیں کر رہی۔ تم فائق سے کہو وہ تمہیں موبائل دلا دے گا۔ آخر یہ اُسی کا فرض ہے۔'' بی بی جان نے مصالحانہ انداز میں نرمی سے سمجھایا۔

''ہونہہ...... وہ تو ضرور ہی اپنے فرائض پورے کرے گا۔'' انعم اُن کی بات پر استہزائیہ مسکرا کر بولی تو بی بی جان کے چہرے پر تفکر سا نظر آنے لگا۔

''تم دونوں کا پھر جھگڑا ہوا ہے کیا؟'' اُن کے لہجے میں تشویش بھی تھی اور پریشانی بھی۔

''ہا...... ں...... اُس نے مجھے کہہ دیا ہے کہ میں جی بھر کے یہاں رہوں...... مجھے بھی اُس کے گھر میں قید ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے...... اور آپ بھی اب مجھے مجبور مت کیجیے گا بی بی جان۔'' انعم بی بی جان کے علاوہ اپنے دل کی بات کسی سے کہتی بھی تو نہیں تھی۔

''ایسا نہیں کہتے انعم...... وہ تمہارا گھر ہے۔ آخر تمہیں وہیں جانا ہے۔'' بی بی جان نے اُس کے بازو پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''میں تنگ آ گئی ہوں بی بی جان...... نہ وہ مجھے سمجھتا ہے اور نہ میں اُسے سمجھ پا رہی ہوں کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟''

''ایسے پریشان نہیں ہوتے...... مسئلے کا حل نکالتے ہیں۔ وہ جن باتوں سے چڑتا ہے مت کیا کرو۔''

''مطلب ہے میں آپ لوگوں کو چھوڑ دوں؟ اپنے میکے کو بھلا دوں؟ یہ...... مجھ سے نہیں ہوگا۔'' وہ یکدم اُن کے پہلو سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

بی بی جان کے اندر اک نیا دکھ سا اُترنے لگا۔ عجب پریشانی نے گھیر لیا تھا۔ فائق اور انعم کے مزاج نہیں ملتے تھے۔ دونوں کے تناؤ کا سبب یہی تھا۔ وہ بے بسی سے سوچ کر رہ گئیں۔ بہر حال انہیں اس حوالے سے کوئی حل تو نکالنا تھا۔ وہ صالحہ درانی سے بات کرنے کا سوچ رہی تھیں مگر ارویٰ اور اصم کی صحت یابی کے لیے بے شمار سوچیں اور خیالات بھی انہیں پریشان کر رہے تھے۔ پہلے تو وہ انہی کے لیے فکر مند تھیں کہ نجانے کتنا وقت لگنا تھا دونوں کو صحت یاب ہونے کے لیے۔

(اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہ فروری میں ملاحظہ فرمائیں)

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

بہترین دوست

انسان کا سب سے بہترین دوست اللہ ہے۔
بہت جلدی مان جاتا ہے۔
پرانی باتیں یاد نہیں کرتا۔

............*

ارشاد نبویؐ

نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اے ابنِ آدم! جب تک تُو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ ہی سے امیدیں وابستہ رکھے گا میں تجھے معاف کرتا رہوں گا۔ خواہ تیرے اعمال جیسے بھی ہوں اور میں (بخشتے ہوئے) پرواہ تک نہ کروں گا۔

............*

فرمانِ حضرت علیؓ

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کسی کا ظرف دیکھنا ہو تو اُسے عزت دو۔
فطرت دیکھنی ہو تو آزادی دو۔
نیت دیکھنی ہو تو قرض دے دو۔
خصلت دیکھنی ہو تو اُس کے ساتھ کھانا کھاؤ۔
صبر دیکھنا ہو تو تنقید کر کے دیکھو۔
خلوص دیکھنا ہو تو اس سے مشورہ کرلو۔

رفعت۔ کراچی

دعا

نصیب سے زیادہ قیمتی دعا ہوتی ہے
کیونکہ
جب زندگی میں سب کچھ بدل جائے تب انسان کے پاس دعا ہی بچتی ہے جو نصیب بدل دیتی ہے۔

راحیلہ۔ لاہور

لطیفہ

گرل فرینڈ: ''ہیلو جانو آج تمہاری بہت یاد آرہی تھی اور میں فری بھی تھی سوچا کال کرلوں۔ کیسے ہو کافی دن ہوگئے ملے نہیں۔''
لڑکا: ''ابھی مجھے تنخواہ نہیں ملی۔''
گرل فرینڈ: ''اچھا چلو ماما آ گئیں ابھی بات نہیں کرسکتی۔''

............*

شعر

حالات پریشاں تو گزر جائیں گے اک روز
احباب کے ہونٹوں کی ہنسی یاد رہے گی

............*

دل کرتا تھا

کسی نے ایک شادی شدہ شخص سے پوچھا۔
''آپ شادی سے پہلے کیا کرتے تھے؟''

اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بولا۔
''جو میرا دل کرتا تھا۔''

سیما رضا۔ کراچی

ٹیلی فون

ٹیلی فون جوائنٹ فیملی تھی۔
موبائل فون نے گھر کے ایک ایک فرد کو الگ کر دیا۔

............*

بات جو دل میں اُتر جائے

کبھی کبھی ہم تھک جاتے ہیں یہ ثابت کرتے کرتے کہ بے شک ہمارا طریقہ غلط تھا پر ارادہ نہیں۔

غزالہ رشید۔ کراچی

قطعہ

جب جان پیاری تھی تو دشمن ہزاروں تھے
اب مرنے کا شوق ہے تو قاتل نہیں ملتا

پروین شروانی۔ کراچی

رضوانہ پرنس کی ڈائری سے

غم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں
تو نے مجھے تو کھو دیا' میں نے تجھے کھویا نہیں
نیند کا ہلکا گلابی سا خمار آنکھوں میں تھا
یوں لگا جیسے وہ شب کو دیر تک سویا نہیں

............*

پیار بھرے میسج

2011ء سے یونیورسٹی میں ہوں اور یونیورسٹی کی زندگی میں کسی لڑکی کا اچھا لگ جانا کوئی انہونی چیز نہیں۔ میری زندگی میں بھی ایسے مواقع آئے کہ دل نے کہا کہ اس لڑکی سے بات کرنی چاہیے لیکن کبھی اتنی ہمت نہیں جتا پایا۔ کچھ دن پہلے ایک لڑکی کو دیکھا تو اُن کو 100 روپے والے نوٹ پر اپنا نمبر لکھ کر دے دیا اور کہا کہ آپ کے روپے گر گئے تھے اس نے وہ نوٹ رکھ لیا اور سیدھا ڈھابے پر پہنچی اور ملک شیک کا آرڈر کر دیا اور وہی نوٹ ڈھابے والے کو دے دیا۔ اب وہ دن سے ڈھابے والا مجھے میسج کر رہا ہے کہ ''آپ بہت پیاری ہیں۔ میں کافی عرصے سے آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ میں اُس کو کال کر کے بتایا کہ میں لڑکا ہوں مگر وہ ماننے کو تیار نہیں دن میں دو تین پیار بھرے میسجز آ جاتے ہیں۔

غزالہ۔ بحرین

خوبصورت باتیں

☆...... قدر آتی ہے اس وقت جب لوگ نوٹ کر واپس نہیں آتے۔

☆...... فرقہ پرستی آدمی کو ضدی اور احمق بنا دیتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ سورج صرف اُس کی کھڑکی سے ہی نظر آتا ہے۔

☆...... شکر کرنے والے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔

☆...... ماں ایک ایسا بینک ہے جہاں آپ ہر احساس اور دکھ جمع کروا سکتے ہیں۔

افشاں۔ لندن

واٹر واٹر

ایک اَن پڑھ لڑکی کی شادی پڑھے لکھے لڑکے سے ہوگئی۔ ایک دن لڑکا کھانا کھاتے ہوئے گلے میں نوالہ پھنسنے سے مر گیا۔
لڑکی اُس کی موت پر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔
''ہائے وے پانی وی نئی منگیا بس واٹر واٹر

کرد امر گیا۔"
سنٹی۔ بحرین

محبت اور احترام

رشتوں کو ایسی محبت اور احترام سے نبھایا کرو۔ جیسے شہد کی مکھی پھولوں سے اگر رس نکال بھی لے تب بھی پھولوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتی۔ دو دن کی زندگی ہے ایسے ہی گزارو۔ ملو تو پھول بن کر، بکھرو تو خوشبو بن کر۔

طاہرہ۔ فیصل آباد

ہائے رے حکمران

اس نے اپنی سائیکل پارلیمنٹ ہاؤس کے جنگلے کے ساتھ پارک کی اور پیدل چل پڑا۔ پولیس والے نے آواز دی۔

''اوئے پاگل! تم نے یہاں سائیکل کیوں کھڑی کی ہے؟ یہ وی آئی پی روڈ ہے یہاں سے ایم این اے گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی وزیر اعظم اور صدر صاحب بھی...... '' وہ معصومیت سے بولا۔

''بھائی میں نے سائیکل کو تالا لگا دیا ہے۔''

تحسین۔ ریاض

کب سمجھیں گے

پتہ نہیں گھر والے کب سمجھیں گے کہ صبح ہونے اور نیند پوری ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

امبرین۔ ڈنمارک

نکتہ نظر

ایک صاحب کہتے ہیں کہ سر بازار کسی نے میرے ٹخنے پر ڈنڈے سے چوٹ لگائی۔ درد اور غضب کی کیفیت میں پلٹ کر مارنے والے کو دیکھا تو ایک نابینا اپنے ڈنڈے سے راستہ ٹٹول رہا تھا۔ غصے کی کیفیت جھٹ سے شفقت اور ترس میں بدل گئی اور میں نے اس نابینا کا ہاتھ تھام لیا اور منزل تک پہنچا دیا۔ اُس دن مجھے احساس ہوا کہ انسان کا نکتہ نظر جب تبدیل ہو جاتا ہے تب جذبات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔

شگفتہ شفیق۔ لندن

کوئی مر گیا کیا

صاحب نے ٹیکسی روکی بیٹھے تو دیکھا ڈرائیور نے تلاوت چلا رکھی ہے۔

پوچھا: ''کوئی مر گیا ہے کیا؟''

ڈرائیور نے کہا۔

''ہاں صاحب! ہمارا ضمیر......''

ثاقب۔ میر پور خاص

عجیب و غریب حقائق

ایک بچہ آپ کو والدین بنا دیتا ہے اور دو بچے ریفری

دن میں مختصر نیند لینے سے آپ ہمیشہ جوان رہتے ہیں خاص طور سے جب یہ نیند آپ دوران ڈرائیونگ لیں۔

ہمیں اپنے ٹیکس مسکراہٹ کے ساتھ دینے چاہئیں میں نے بہت کوشش کی مگر وہ ہمیشہ پیسے مانگتے ہیں۔

بچے کے قد میں اضافہ ہمیشہ اسی وقت ہوتا ہے جب آپ اُس کے لیے نیا یونیفارم خرید لیتے ہیں۔

کہتے ہیں شادی اُس سے کرو جو تم سے محبت کرے نہ کہ اُس سے جس سے تم محبت کرو۔ بہر حال دونوں صورتوں میں آخر میں پچھتانا ہی پڑتا ہے۔

جیسے پیار انمول ہے اس کو خریدا نہیں جا سکتا

مگر یہ بھی سچ ہے کہ پیار کرنے والوں کو بڑی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔
شادی کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر ہی چلتی ہے بہتر ہے کہ آپ خود ہی دے دیں چھین تو بیوی ویسے ہی لے گی۔
شادی ایک سمجھوتہ ہے اس لیے میں ہمیشہ اپنی غلطی مان لیتا ہوں اور وہ یہ مان لیتی ہے کہ ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو تم غلط تھے۔
دنیا میں صرف ایک مکمل اور بہترین بچہ ہوتا ہے اور وہ ہر ماں کے پاس ہوتا ہے جیسے دنیا میں صرف ایک بہترین بیوی ہوتی ہے اور وہ ہر پڑوسی کی ہوتی ہے۔

عقیلہ حق۔ کراچی

ایک مزاحیہ غزل

بیوی میکے جاتی ہے اور مزے کے لیے شوہر کو میسج بھیجتی ہے۔

میری محبت کو اپنے دل میں ڈھونڈ لینا
اور ہاں آٹے کو اچھی طرح گوندھ لینا
مل جانے اگر پیار تو کھونا نہیں
پیاز کاٹتے وقت بالکل رونا نہیں
مجھ سے روٹھ جانے کا بہانہ اچھا ہے
تھوڑی دیر اور پکاؤ آلو ابھی کچا ہے
مل کر پھر خوشیوں کو بانٹنا ہے
ٹماٹر ذرا باریک ہی کاٹنا ہے
لوگ ہماری محبت سے جل نہ جائیں
چاول ٹائم پر دیکھ لینا کہیں گل نہ جائیں
کیسی لگی ہماری غزل بتا دینا
نمک کم لگے تو اور ملا لینا

............*

شوہر کا جواب

تمہارے جاتے ہی پڑوسن کھانا پکانے آ گئی

فروا علی۔ لاہور

ویرانی کا سبب

ایک طوطے اور طوطی کا گزر ایک بستی سے ہوا وہاں کی ویرانی دیکھ کر طوطی نے طوطے سے پوچھا۔
''یہ بستی اتنی ویران کیوں ہے؟''
طوطے نے جواب دیا کہ ''شاید یہاں سے الو کا گزر رہا ہوگا۔''
یہ بات الو نے بھی سنی اور ان دونوں کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ طوطا اور طوطی الو کا محبت بھرا اصرار رد نہ کر سکے اور دعوت قبول کر لی۔
کھانے کے بعد جب طوطا اور طوطی رخصت ہونے لگے تو الو نے طوطی کا راستہ روک کر کہا۔
''تم کہاں جاتی ہو تم تو میری بیوی ہو۔'' یہ سن کر طوطا الو پر جھپٹ پڑا خوب لڑائی ہوئی اور معاملہ عدالت تک جا پہنچا۔
عدالت نے فیصلہ الو کے حق میں دے دیا۔
بے چارہ طوطا روتا پیٹتا اپنی قسمت کو کوستا سفر پر روانہ ہونے لگا تب پیچھے سے الو نے آواز دے کر کہا۔
''اپنی طوطی کو تو لیتے جاؤ۔'' طوطے نے نم آنکھوں سے طوطی کی جانب دیکھا اور پھر الو سے کہا۔
''کیوں میرے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہو یہ تو تمہاری بیوی ہے۔'' الو نے کہا۔
''نہیں بھائی یہ تمہاری ہی طوطی ہے میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ بستیاں الو ویران نہیں کرتے۔'' بستیاں تب ویران ہوتی ہیں جب ان سے انصاف اٹھ جاتا ہے۔

سدرہ صباحت۔ کراچی

نئی لڑکی نئی آوازیں

غزل

میسر ہی نہیں ہوتا کوئی پل چین کا جاناں
تری خاموشیوں کا شور اتنا بڑھ گیا جاناں
کبھی پہلے ملاقاتوں کا تھا اک سلسلہ قائم
مگر اب ہجر کی راتوں کا ہے اِک سلسلہ جاناں
بہت ڈھونڈا' بہت ڈھونڈا' بہت ڈھونڈا' بہت ڈھونڈا
نہیں ملتی' نہیں ملتی' نہیں ملتی وفا جاناں
تخیل ترجمانی کے لیے الفاظ کا طالب
مرا فن اُس کی خواہش کو نہ پوری کرسکا جاناں
مجھے کاندھا نہیں ملتا کہ تھوڑا رو کے خوش ہولوں
کہ اب میں زندگی میں ہنستے ہنستے تھک گیا جاناں
کسی کو کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں معلوم تھا پھر بھی
کسی نے کچھ کسی نے کچھ کسی نے کچھ کہا جاناں
میں اُس کو بارہا یہ بات سمجھاتا رہا ہوں زین
گرادیتی ہے خود ہی اُڑنے والوں کو ہوا جاناں
شاعر: سید زین علی جعفری۔ کراچی

بے گانہ کرگیا

بنا کر اپنا وہ پھر سے بے گانہ کرگیا
دے کر غم ساتھ خوشیاں لے کر گیا
سوچا تھا ساتھ نبھائے گا عمر بھر
وہ تو ہر وعدۂ وفا سے ہی مکر گیا
خواہشوں کے تاروں سے چمکا آسمان
دے کر کالی رات وہ لے روشن قمر گیا
بڑی من مانیوں کی پرواز بھری تھی
اب گستاخ دل کے ساتھ سدھر گیا
آنکھوں کے جام جو خالی رہے کبھی
بعد اس کے جو چھلکے تو پیمانہ بھر گیا
سنگ اس کے خواب سجائے آنکھوں نے
وہ کیا گیا کہ ہر خواب بکھر گیا
سوتے سوتے چونک اٹھتے ہیں اکثر
خوابوں سے بھی جانے وہ چلا کدھر گیا
لگی ٹھیس تو ہوا خدا سے نادم نینا
جب ہر دعا سے اُس کی اثر گیا
شاعرہ: نینا خان۔ کراچی

ادراک

حقیقتوں میں تلخیاں رقص کرتی ہیں
سوچوں میں میری خاموشیاں شور کرتی ہیں
عجب سانحہ ہے!
صحرا آنکھوں سے آنسو نہیں رُکتے
ادراک میں میری محبت، محبت نہیں رہتی
تم خود ہی بتاؤ
میں مسکراؤں تو کیسے؟
شاعرہ: عائشہ نور عاشا۔ گجرات

پچھتاوا

نئے نئے جوانی کے ولولے
نئے نئے شوق اور ہم منچلے
گم ہوگئے ان رنگینیوں میں ایسے
قوسِ قزح بادلوں میں ہو جیسے
نا فکر نا فاقہ کالج کا کیا کرتے تھے ناغہ
سمجھایا کرتے تھے ہمارے بڑے ہمیں
مگر ہم تو ٹھہرے ناداں ایسے

بڑی فرصت سے گھوما پھرا کرتے تھے
کرنے کا کوئی کام نہ ہو جیسے
صبح اٹھے' تیار ہوئے اور نکل پڑے
کالج کا بہانا کر کے سڑگشتی کرنے چل پڑے
بہت دن زندگی کے کر دیے ضائع
مگر احساس تب ہوا جب
اپنوں کو اپنے پاس نہ پایا
ہو رہا احساس بہت' آ رہی ہے یاد بہت
ڈرا رہی ہے تنہائی ستا رہا ہے بڑھاپا
کیسے کروں میں اپنی ان غلطیوں کا مداوا
شاعرہ: سعدیہ نور۔کراچی

سچ

سچ سچ کا چرچا عام ہے
سچ پر بولتا کوئی نہیں
دوسروں میں نکالے جاتے ہیں عیب
اپنے عیب ظاہر کرتا کوئی نہیں
جھوٹے سچ ظاہر کرتے ہیں ہمیشہ
سچا لب کبھی کوئی کھولتا نہیں
اپنی بات کا یقین دلاتے ہیں قسم کھا کے
جو جھوٹ جھوٹ ہو وہ سچ لگتا نہیں
سچ کی خاطر ہم کٹوا دیں گردن نسیم
پر تلوار اٹھائے وہ جو جھوٹ بولتا نہیں
شاعرہ: شبانہ نسیم۔کراچی

رکھنا پڑتا ہے

اپنی اپنی ذات میں رکھنا پڑتا ہے
ہر اک کو اوقات میں رکھنا پڑتا ہے
وصل کی خواہش پوری بھی ہو سکتی ہے
خود کو بھی حالات میں رکھنا پڑتا ہے
کچھ آنسو خیرات میں بانٹے جاتے ہیں
جیون کو صدمات میں رکھنا پڑتا ہے
تم نے عشق کے معنی بھی کب سمجھے ہیں
عشق کو اپنی عات میں رکھنا پڑتا ہے
تم ٹھہری بس موم کی صورت فری جی
سورج کو بھی ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے
شاعرہ: فریدہ فری۔لاہور

وقت

نہیں رہتا وقت کسی کا بھی ساتھی
چاہے وہ بادشاہ ہو چاہے فقیر
وقت کے چھوٹنے سے انسان ہارے
جیتی ہوئی بازی
جو کرتا ہے وقت کی قدر
چومتی ہے قدم اس کے کامیابی
نہ کریں اگر وقت کی قدر
تو شروع ہو جاتی ہے الٹی گنتی
وقت تو چلتا جائے گا نہیں رکے گا کسی کے لیے کبھی
جب تک نہیں آ جاتی قیامت کی گھڑی
دیکھنا چاہو اگر فرق خود میں
تو کروا پنے وقت کی قدر
شاعرہ: ساجدہ۔کراچی

دعائے سال نو

نئے سال پہ میرے محبوب تجھے کیا بھیجوں
میں تو رہتا ہوں وطن کی سرحدوں پہ
ہر پل یہی لگتا ہے کہ آج وطن پہ قربان ہو جاؤں گا
میرے محبوب وطن رہے سلامت یہی ہے میری دعا
شاعر: شعبان کھوسہ۔کوئٹہ

چٹ پٹی خبریں

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

ساحر کا راستہ

کچھ بھی کہیں خاص بات تو ہے ساحر لودھی میں...... کچھ لوگوں انہیں Fake کہتے ہیں تو

بھئی اب جلنے والوں کا کیا کیا جائے۔ ساحر لودھی کی فلم راستہ جو ریلیز ہونے والی تھی جنید جمشید کی ناگہانی موت کی وجہ سے Delay کردی گئی ہے، جلد ریلیز ہوگی۔ فلم کے گانے ریلیز سے قبل ہی ہٹ ہوگئے ہیں۔ بہرحال یہ ساحر لودھی کی پہلی فلم ہے جس میں [illegible]

پروڈیوسر بھی۔ ہمیں اپنے اس پاکستانی ہیرو کو خوب سراہنا چاہیے اور سینما ہال کا رخ ضرور کرنا چاہیے۔

ثناء ہالی وڈ میں

سنا ہے اداکارہ ثناء کو ہالی وڈ سے فلم آفر ہوئی ہے یہ بات انہوں نے ایک انٹرویو کے دوران بتائی۔ اب فلم میں وہ آئٹم سونگ کریں گی یا پستول

چلائیں گی اس کا تو پتہ نہیں ہاں مگر جو لوگ ثناء کو جانتے ہیں وہ ضرور [illegible] گے کہ فلم میں وہ

کردار کوئی بھی نبھائیں، ہوں گی گونگی...... بھئی
ہالی وڈ مووی ہے کوئی مذاق تو نہیں۔

عامر خان ناک آؤٹ

پاکستانی جہاں بھی رہتے ہوں اپنے رسم و
رواج ترک نہیں کرتے روٹی گرم کھائیں گے
برطانیہ کی ٹھنڈ میں شلوار قمیض ضرور پہنیں گے اور

بہو کو چھڑی کی طرح سیدھا رکھنے کا ارمان بھی پورا
کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ عامر خان باکسر کی
بیگم فریال مخدوم کے ساتھ ہوا۔ شادی کے اور
بچے کے بعد سسرال والوں کو پتہ چلا کہ فریال کا
لباس مناسب نہیں اور عادات واطوار بھی درست
نہیں۔ سوشل میڈیا پر چھڑنے والی یہ لڑائی اب ختم
ہو چکی ہے۔ عامر خان نے اپنی بیگم کا ساتھ دیا اور
رنگ سے باہر گھر کے محاذ پر بھی اپنے آپ کو ناک
آؤٹ ہونے سے بچا لیا۔ یہی تو پہچان ہے اچھے
باکسر کی۔

اکاڈمی ایوارڈ

شرمین عبید چنائے دو دفعہ اکیڈمی ایوارڈ جیتنے
کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد اب وہ پہلی
آرٹسٹ ہیں جو 47 ویں ورلڈ اکنامک فورم کو
چیئر کریں گی۔ میٹنگ ڈیوس میں ہوگی۔ یہ بہت
بڑے اعزاز کی بات ہے اور ہمیں فخر ہونا چاہیے
کہ ہمارے ملک میں اس قدر ٹیلنٹ موجود ہے۔
شرمین ڈھیروں مبارکباد۔

پیا دیس

عروہ حسین بھی پیا گھر سدھار گئیں۔ ڈرامہ

'اُڈاری' میں اپنے فن کے جوہر دکھانے والا کپل عروہ اور فرحان دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے ہیں۔ فرحان سنگر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے اداکار بھی ہیں اور یہی خصوصیات عروہ میں بھی پائی جاتی ہیں ہماری دعا ہے کہ یہ جوڑی سدا سلامت رہے۔

3 بہادر

گزشتہ ماہ ملک بھر میں ریلیز ہونے والی پاکستان کی دوسری مکمل اینیمیٹڈ فلم 'تین بہادر' پارٹ

ٹو بعنوان 'ریوینج آف بابا بالم' نے ملک بھر کے سینما گھروں میں دھوم مچادی۔ کئی ماہ سے طاری سینما گھروں کے سناٹوں کو ختم کردیا۔ ننھے فلم بینوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر سینما گھروں کی طرف رواں دواں رہا اور ہر طرف اس فلم کے مرکزی کرداروں کامل' سعدی' آمنہ اور بابا بالم کے چرچے ہیں اور شرمین عبید چنائے بچوں کی فیورٹ شخصیت بن گئیں۔

پاکستان تجھے سلام

پاکستان فلم فیسٹیول جو نیویارک میں منعقد ہوا پاکستان کی فلمی تاریخ کا پہلا فیسٹیول تھا۔ جس

میں ستاروں نے بھرپور شرکت کرکے اس میلے کو چار چاند لگادیے۔ دیکھنے والے پاکستانی فنکاروں کی پرفارمنس پر حیران رہ گئے۔ اس میں تو کوئی دورائے نہیں کہ ہمارے فنکار بہت خوبصورت اور فنکارانہ صلاحیتوں سے مالامال ہیں۔

دوستی ایسا ناتا

ایک اور چٹ پٹی مگر خوشی کی خبر ہماری ننھی منی

ڈرامہ آرٹسٹ ایمان خان کی منگنی جلد ہونے جا رہی ہے۔ خوبرو اداکار منیب بٹ سے منگنی کی یہ رسم جنوری 2017ء میں انجام پائے گی۔ ایمان اور منیب نے کبھی بھی اپنی دوستی کو راز میں نہیں رکھا بلکہ اس منگنی کا اعلان ایمان کی والدہ نے ایک مارننگ شو میں کیا۔

ہمارا اپنا سنیما

پاکستانی سنیما روز بروز پھل پھول رہا ہے اور امید ہے کہ بہت جلد بالی وڈ اور ہالی وڈ کا مقابلہ

کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ وہ فلمیں جو تیاری کے مراحل میں ہیں اور 2017ء میں ریلیز کر دی جائیں گی۔ ارتھ' مولا جٹ 2' چلے تھے ساتھ' وجود' رنگ ریز' پراجیکٹ غازی' پنجاب نہیں جاؤں گی' جیک پاٹ 100 کروڑ' مہر انسا بمقابلہ لب یو' فرار' تھوڑا جی لے' پیاری کی FIR' فرار' بالو ماہی' جھول البیلا راہی' پرواز ہے جنون۔

شازیہ منظور صحت یاب

معروف گلوکارہ شازیہ منظور صحت یاب ہوگئیں۔ گیتوں کی ریکارڈنگ شروع کر دی۔ بتایا گیا ہے کہ چند روز قبل ٹھنڈ لگنے کے باعث وہ علیل ہوگئی تھیں جس کے باعث فنی سرگرمیاں معطل کر دی تھیں اب وہ مکمل صحت یاب ہوگئی ہیں اور

مختلف کمپنیوں کے لیے اپنے نغمات ریکارڈ کرا رہی ہیں۔

دھوم مچادی

معمر رانا کی 17 سالہ بیٹی ریا رانا کے فوٹو شوٹ نے دھوم مچا دی۔ اُن کا پہلا فوٹو شوٹ تھا۔ معمر رانا پاکستانی سنیما کے معروف فنکار ہیں وہ آج کل فلموں میں ذرا کم نظر آتے ہیں مگر مارننگ شوز میں اپنی فیملی کے ساتھ اکثر و بیشتر نظر آتے ہیں

۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ریا رانا پاکستانی شوبز انڈسٹری میں ایک خوبصورت اضافہ ثابت ہوں گی۔

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

روسٹ چکن سوپ

اجزاء

مرغی کا گوشت (بون لیس)	1 کپ
لال مرچیں (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن پیسٹ	1 چائے کا چمچہ

سوپ بنانے کے لیے:

چکن کی یخنی	4-5 کپ
لہسن (کٹا ہوا)	1 چائے کا چمچہ
تھائم	پون چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
گاجر (کدوکش کی ہوئی)	آدھا کپ
مٹر	آدھا کپ
مکھن	1 کھانے کا چمچہ
پیاز (آملیٹ جیسی کاٹ لیں)	1 عدد
چکن کے ٹکڑے	گارنش کے لیے
کارن فلور	2 کھانے کے چمچے
انڈا (پھینٹ لیں)	1 عدد

ترکیب:

پیالے میں گوشت، نمک، کٹی لال مرچیں اور لہسن پیسٹ ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے گرم اوون میں 200°C پر روسٹ کر کے چکن روسٹ تیار کریں اور ایک طرف رکھیں۔ ایک سوس پین میں مکھن گرم کریں اور کٹا ہوا لہسن اور پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ لہسن، پیاز میں ہلکا سا کلر آجائے تو مٹر اور گاجر ڈال کر ہلکا سا فرائی کرلیں۔ چکن یخنی، نمک، سفید مرچ پاؤڈر، تھائم اور آدھا چکن روسٹ ڈالیں اور ساتھ ہی کارن فلور، پانی میں گھول کر ڈالیں۔ انڈا ڈالیں اور اچھی طرح مکس کر کے سرونگ ڈش میں نکال لیں اور اس میں باقی چکن ڈال کر پیش کریں۔

فش گرین مسالا

اجزاء:

مچھلی (سلائس کاٹ لیں)	آدھا کلو
دہی	آدھا کپ
پیاز (چوپ کرلیں)	2 عدد
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	آدھا کپ
ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	3 عدد
پودینہ (چوپ کیا ہوا)	1 کھانے کا چمچہ
لہسن کے جوے	6 عدد
ادرک	1 انچ کا ٹکڑا
تیل	پون کپ

زیرہ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:

مچھلی کو آٹا لگا کر دھولیں اور خشک کرئیں۔ چوپر میں ہرا دھنیا، ہری مرچیں، پودینہ، لہسن، ادرک، زیرہ پاؤڈر، سفید مرچ پاؤڈر اور نمک ڈال کر دردرا پیس لیں۔ سوس پین میں تیل گرم کرکے پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ سنہری ہو جائے تو پسا ہوا مسالا ڈال کر فرائی کریں۔ تیل الگ ہوجائے تو مچھلی کے سلائس مسالے پر رکھیں۔ دہی پھینٹ کر مچھلی پر ڈالیں اور ڈھک کر 2 منٹ پکائیں اور کپڑے سے پکڑ کر پین ہلائیں درمیانی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ تیل الگ ہوجائے سرونگ ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

مچھلی کی بریانی

اجزاء:

مچھلی کے ٹکڑے	ایک کلو
چاول (اُبلے ہوئے)	آدھا کلو
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	250 گرام
ٹماٹر (چوپ کیے ہوئے)	375 گرام
پسا ہوا لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا، پودینہ (چوپ کیا ہوا)	آدھا، آدھا گڈی
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)	6 عدد
آلو بخارے	50 گرام
بادیان کے پھول، چھوٹی الائچیاں	4 عدد
بڑی الائچیاں	2 عدد
لونگیں	4 عدد
پسی ہوئی جائفل جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
زردے کا رنگ	پون چائے کا چمچہ
بریانی ایسنس	چند قطرے
پسا ہوا دھنیا، ثابت کالا زیرہ	ایک، ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	
تیل	ایک پیالی

ترکیب:

دیگچی میں تیل گرم کریں اور پیاز تل کر نکال لیں۔ اسی دیگچی میں مچھلی کے ٹکڑے بھی تل کر نکال لیں۔ اسی دیگچی میں ٹماٹر، لہسن ادرک، آلو بخارے، بادیان، چھوٹی اور بڑی الائچیاں، لونگیں، جائفل جاوتری، زردے کا رنگ، دھنیا، کالا زیرہ، کالی مرچ، لال مرچ اور نمک ڈال کر ٹماٹر نرم ہونے تک پکائیں۔ اس میں آدھی ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور پودینہ ڈال کر مچھلی کے ٹکڑے تہہ کی طرح رکھ دیں۔ اس کے اوپر چاولوں کی تہہ لگائیں پھر باقی ہری مرچیں، دھنیا، پودینہ اور بریانی ایسنس چھڑک کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار بریانی ٹماٹر سے سجا کر پیش کریں۔

بیف جلفریزی

اجزاء

انڈر کٹ (باریک کٹا ہوا)	آدھا کلو
ٹماٹر (باریک کٹا ہوا)	2 عدد
شملہ مرچ (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد
ادرک (باریک کٹی ہوئی)	2 کھانے کے چمچے
ہری مرچیں (لمبائی میں کٹی ہوئی)	2 عدد
پسا ہوا لہسن	ایک چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی لال مرچ	2 چائے کے چمچے
بھنا ہوا کٹا ہوا سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
چلی گارلک ساس	2 کھانے کے چمچے
سفید سرکہ	2 کھانے کے چمچے
سویا ساس	2 کھانے کے چمچے
نمک	ایک چائے کا چمچہ
تیل	پون پیالی
آملیٹ (پٹیوں میں کٹا ہوا)	سجانے کے لیے

ترکیب:

کڑاہی میں تیل گرم کریں اس میں لہسن بھون کر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اندر کٹ ڈالیں اور تیز آنچ پر رنگ تبدیل ہونے تک پکائیں۔ اس میں لال مرچ' زیرہ' سرکہ' سویا ساس' چلی گارلک ساس' ادرک اور نمک ڈال کر چند منٹ تک پکائیں۔ اس میں پیاز' ہری مرچیں اور شملہ مرچ ڈال کر پانی خشک ہونے تک پکائیں' پھر ٹماٹر شامل کریں اور 5 منٹ پکا کر ڈش میں نکالیں۔ اسے آملیٹ سے سجا کر پیش کریں۔

مٹکا گوشت

اجزاء

گائے کا گوشت	1 کلو (بڑی بوٹیاں بنالیں)
پیاز (سلائس کاٹ لیں	3 عدد
لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	1. کھانے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
سیاہ زیرہ	1 چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	1 کپ
آٹا	آدھا کپ
گھی	1 کپ
نمک	حسب ذائقہ

سرونگ کے لیے:

ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	حسب ضرورت
ہری مرچیں (چوپ کی ہوئی)	حسب ضرورت
ادرک (سلائس کاٹ لیں)	حسب ضرورت
لیموں (ٹکڑوں میں کاٹ لیں)	2 عدد

ترکیب:

مٹکے کو چولہے پر رکھیں۔ اس میں گھی گرم کر کے پیاز ڈال کر ساتے فرائی کرلیں اور گوشت ڈال کر بھونیں۔ گوشت بھن جائے تو لہسن' ادرک پیسٹ' نمک' لال مرچ پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر' دھنیا پاؤڈر' سیاہ زیرہ آدھا چائے کا چمچہ اور پانی ڈال کر ڈھک کر آٹے سے ڈھکنا بند کردیں اور ہلکی آنچ پر گوشت پکائیں۔ گوشت گل جائے تو روغن الگ نکال لیں اور ایک طرف رکھیں۔ گوشت میں دہی ڈال کر بھونیں 5-4 گلاس پانی ڈال دیں۔ اُبال آنے پر آٹا آدھا کپ پانی میں گھول کر تھوڑا تھوڑا ڈالیں اور چمچہ چلاتے رہیں۔

اسپیشل بیف کباب

اجزاء:

گائے کا قیمہ (دوبار پیسا ہوا)	300 گرام
چنے کی دال (اُبلی ہوئی)	100 گرام
لہسن ادرک (چوپ کیا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
کُٹی ہوئی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسا ہوا سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
پسا ہوا دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچیں (چوپ کی ہوئی)	5 عدد
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	آدھی گڈی
انڈے	2 عدد
ڈبل روٹی	2 سلائس
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

چوپر میں تمام اجزاء یکجان کرلیں۔ اس آمیزے کے گول کباب بنالیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کریں اور کباب دونوں جانب سے سنہری تل کر نکال لیں۔

☆☆......☆☆